راجہ گدھ

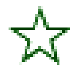


بانو قدسیہ

راجہ گدھ

بانو قدسیہ





یہ تیسرے پیریڈ کا واقعہ ہے

ایم اے کی ساری کلاس حاضر تھی۔لڑکیاں ہم سے اگلی قطار میں بیٹھی تھیں۔۔۔
۔ان چولستانی ہرنیوں میں وہ سب سے آخری تھی۔۔۔اکتوبر کا دن تھا جس طرح بھٹی سے نکل کر مکئی کے دانے سفید پھولے ہوئے بڑے اور ٹھنڈے نظر آتے ہیں ایسے ہی اکتوبر کا یہ دن تھا، بڑا پھولا ہوا اور سفید۔۔۔اس سے پہلے کے تمام دن بھٹی دیدہ گرم تھے۔لیکن یہ دن سفید سفید دھوپ میں کچھ پھولا پھولا بڑا بڑا نظر آتا تھا۔ کچھ دنوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ گھڑیوں کے تابع نہیں رہتے اپنی گنجائش اور سمائی کے مطابق گزرتے ہیں

پرفیسر سہیل نے نئی کار جیسی اس لڑکی کی طرف نظریں اٹھا کر سوال کیا۔"اپنا تعارف کرایئے!"

داخلے کے دن سے لے کر اب تک ہم اس کے نام کے متعلق کئی قیافے لگا چکے تھے۔چولستانی ہرنی اٹھی اس نے کرسی پر ایسے بازو رکھا جیسے موٹر سائیکل کے سہارے کھڑی ہو۔

"سر میرا نام سیمی شاہ ہے، میں نے کنیرڈ کالج سے بی اے کیا ہے اور میرے سبجکٹ سائیکلوجی اور ہسٹری تھے۔"

پہلی مرتبہ تمام طلبہ اپنے آپ کو باقی کلاس سے باضابطہ طور پر متعارف کرا رہے تھے، اس سے پہلے فرزانہ، انجیلا، طیبہ اور کوثر تعارف کرا چکی تھیں۔لیکن یہ تمام لڑکیاں چہرے مہرے اور لباس سے ایسی لگتی تھیں، جنہوں نے اخباری کاغذوں پر چھپے ہوئے نوٹس رٹ رٹ کر بی اے کیا ہو۔کوثر کے علاوہ ان لڑکیوں کی جنرل نالج اور علمی استعداد کورس کی کتابوں تک محدود تھی۔

کوثر حبیب اور سیمی شاہ ہماری کلاس کی آنکھیں تھیں۔جگمگاتی روشن۔۔۔دعوت

سے بھری ہوئی۔ لیکن کوثر حبیب متاثر کرنے سے پہلے بیک گیئر لگاتی تھی۔ پسپا کرنے سے پہلے خود ہار جانے کی عادی تھی۔ اس کے جسم اور ذہن کی بناوٹ ہی ایسی تھی، جیسے بہت خوبصورت بلب روشن ہو، لیکن بار بار بجلی کا فیوز اڑ جانے کی وجہ سے روشنی میں تواتر نہ رہے

اور سیمی شاہ؟۔۔۔۔

وہ گلبرگی معاشرے کی پیداوار تھی۔ اس وقت اس نے موری بند جینز کے اوپر وائل کا سفید کرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں حمائل مالا نما لاکٹ ناف کو چھو رہا ہے۔ کندھے پر لٹکنے والے کینوس کے تھیلے میں غالباً نقدی، لپ سٹک، ٹشو پیپر تھے۔ ایک ایسی ڈائری تھی، جس میں کئی فون نمبر اور برتھ ڈے کے دن درج تھے ایک دو ایسے قیمتی پن بھی شاید موجود ہوں گے جن میں سیاہی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بال پوائنٹ مانگ کر لکھا کرتی تھی اس کے سیاہ بالوں پر سرخ رنگ غالب تھا۔ اکتوبر کے سفید دن کی روشنی میں اس کے بال آگ پکڑنے ہی والے تھے۔ وہ بالکل میرے سامنے تھی اور اگر میں چاہتا تو اس کے کندھوں پر سلیقے سے جمے ہوئے بالوں کو چھو سکتا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح اس کے کرتے کے نیچے سے اس کی باڈس کا الاسٹک، ہک اور اوپر جانے والی طنابوں کو دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا۔

بھری پستول سے کبھی میں اس طرح خائف نہیں ہوا۔

لڑکوں کی قطار میں پہلا لڑکا آفتاب تھا

جب سیمی شاہ اپنا تعارف کروا چکی تو آفتاب اٹھا، امریکی فلموں کا چڑھتا سورج آہستہ آہستہ۔۔۔ موسیقی اور لے کے ساتھ۔۔۔ روشن کرتا ہوا۔۔۔ گرمی پھیلاتا ہوا۔۔۔ اس سکس ملین ڈالر مین نے بھاری آواز میں کہا۔۔۔ ''میرا نام آفتاب بٹ ہے سر۔ میں اس کالج کا ہی اولڈ سٹوڈنٹ ہوں آپ مجھے خوب جانتے ہیں سر۔''

پروفیسر سہیل نے اپنی آنکھوں پر سے چشمہ اتار کر کہا۔۔۔"لیکن تمہارے ہم جماعت شاید تمہیں نہیں جانتے۔"

آفتاب نے پہلے لڑکیوں کی قطار پر کرنیں ڈالیں پھر ڈسکس پھینکنے والوں کی طرح تھوڑا پاؤں پر گھوما اور لڑکوں کو مخاطب کر کے بولا۔۔۔"پچھلے سال میں یونین کا صدر تھا بی اے میں میرے سبجکٹ سائیکالوجی اور سوشیالوجی تھے۔ میں اگر خود پسندی اور فلموں کا شوقین نہ ہوتا تو شاید بی اے میں ٹاپ کرتا۔ لیکن مجھے فسٹ نہ آنے کا کچھ خاص افسوس بھی نہیں ہوا کیونکہ جو لڑکی پنجاب میں فسٹ آئی ہے وہ مجھ سے نوٹس لے کر پڑھتی رہی ہے ویسے میری Reputation والدین کے خوف سے اور اللہ کے فضل سے اچھی ہے۔"

ساری کلاس ہنس دی۔۔ لڑکوں میں سے کسی دل جلے نے نعرہ لگایا۔"میاں مٹھو میاں مٹھو۔۔۔۔"

تعارف جاری رہا۔۔۔

پانچ لڑکوں اور پندرہ لڑکے جب تعارف کروا چکے تو فضا حالات زندگی اور ناموں سے بوجھل ہو چکی تھی۔ شاید اس کے بعد کلاس ختم ہو جاتی اور جمائیاں شروع ہوتیں لیکن اس کے بعد ڈاکٹر سہیل نے میز پر سے چاک اٹھایا۔ بلیک بورڈ پر ایک بڑا سا سر بڑی بڑی مونچھیں چھوٹے دھڑ اور بڑے بڑے بوٹوں والا ایک کامک فگر بنایا۔ پھر اس کی آنکھوں پر چوکور فریم کی عینک پہنائی۔ فریاد کے انداز میں پھیلے ہوئے بازو کھینچے۔۔۔ اور نیچے لکھا۔

"اٹ از می۔۔۔ ڈاکٹر سہیل۔۔۔ میں آپ کو شاید سوشیالوجی پڑھاؤں گا۔"

بلیک بورڈ پر تصویر بنانے والا پروفیسر ہم سے بمشکل پانچ چھ سال بڑا تھا لیکن کہیں اس کے پاس ایک ایسا ہنٹر موجود تھا جو شیروں کو سدھارنے والے استعمال کرتے

ہیں اسے کبھی کورس پڑھانا نہ آیا۔لیکن وہ ذہنوں کا جوڈو کھیلنا جانتا تھا۔نظریات کی کشتی کرانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔اپنے شاگردوں کی کھوپڑیاں کھولنا اور خالی پا کر انہیں جوں کی توں بند کر دینا اسے جی سے پسند تھا۔الی ہوئی زبانیں آزاد کرا کے طوطے کی طرح باتیں کرانا اور ریڈیو کی مسلسل زبان بولنے والوں کو چپ کرانے کا فن بھی صرف اسے آتا تھا خوب آزادی برتتا اور ہر طرح کی آزادی دیتا۔کوئی بات کبھی اسے شاک نہ کرسکی سوشیالوجی کے ساتھ ساتھ اسے دنیا کا ہر سبجکٹ آتا تھا۔سی لیے اس کی موجودگی میں فضا تعلیمی تصنع سے ہمیشہ پاک رہتی اور طالب علم ایک دوسرے کی تشخص میں زیادہ غلطیاں نہ کرتے۔

پروفیسر سہیل نے اپنی گدی پر دایاں ہاتھ رکھا اور میز پر ذرا سا چونتر اجما کر بولا۔'' میں عمر اور تجربے میں آپ لوگوں سے بہت بڑا نہیں ہوں لیکن چونکہ میری شادی نہیں ہوئی اس لیے مجھے پیار کرنے کے لیے صرف کتابیں ملی ہیں۔ابھی تک میرا Passion کتابیں ہیں۔کلاس میں کبھی کبھی آپ لوگ کچھ ایسے سوال کریں گے جن کا جواب مجھے نہیں آتا ہوگا۔اور میں بدقسمتی سے اتنا متکبر ہوں کہ سب کچھ برداشت کرتا ہوں کسی اور کی علمی برتری برداشت نہیں کرسکتا اس لیے I warn you جب تک آپ میری کلاس میں رہیں ہمیشہ مجھے گرو سمجھیں۔میرے علم کو زیادہ مانیں کبھی کبھی یہ بالکل Shallow ہوگا آپ خود بات کی تہہ کو بہتر سمجھتے ہوں گے لیکن مجھے اس بات کا احساس دلا کر آپ کو نقصان ہوگا۔میری چھاتی چھوٹی ہو جائے گی میں اپنی Whishkers منوا دوں گا اور میری بلٹ ڈھیلی ہو جائے گی۔کون کون چاہتا ہے کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہو جاؤں ہاتھ اٹھایئے۔۔۔''سوائے آفتاب کے کسی نے ہاتھ نہ اٹھایا۔

''بھلا کیوں مسٹر آفتاب آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔''

''سر اس لیے کہ آپ پہلے سے احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔صرف ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

قہقہوں میں سب سے اونچا قہقہہ پروفیسر سہیل کا تھا۔

اب کمرے میں تثلیث بن گئی لڑکیوں کی قطار کے آخر میں سیمی شاہ لڑکوں کی ٹکڑی کے سرے پر آفتاب بٹ۔۔۔۔اور ان دونوں کے نقطہ اتصال پر پروفیسر سہیل۔۔۔گفتگو ان تینوں کے درمیان جاندار سرکٹ کی طرح چلنے لگی۔

ہنسی کے ختم ہونے پر پروفیسر سہیل پھر گویا ہوا۔۔۔۔''میرے پاس فی الحال موٹر سائیکل ہے کسی لڑکے کو ضروری کام ہو تو وہ مجھ سے چابی مانگ سکتا ہے۔لیکن جو وعدے کے مطابق موٹر سائیکل واپس نہیں کرے گا وہ دوبارہ اپنے اس حق کو استعمال نہیں کر سکتا اگر کوئی لڑکی بس سٹاپ پر کھڑی ہو اور ہاتھ دے کر مجھے روکے میں سے لفٹ دوں گا لیکن اگر وہ مجھے موٹر سائیکل موڑنے کو کہے گی تو میں اسے اتار دوں گا۔۔۔۔اب آپ سب مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے پاس کیا کچھ ہے؟۔۔۔۔جو آپ دوسروں کے ساتھ Share کر سکتے ہیں اور کس حد تک۔۔۔۔''

''پن۔۔۔۔''ایک طرف سے آواز آئی۔

''سائیکل۔۔۔۔کبھی کبھی۔۔۔۔۔''

''ٹشو پیپر۔۔۔۔ہمیشہ''

''نوٹس۔۔۔۔امتحان کے بعد۔۔۔۔''

''لپ سٹک۔۔۔۔۔''سیمی شاہ بولی۔

''فلائنگ کس۔۔۔۔۔''آفتاب نے جواب دیا۔

''گڈ ویری گڈ۔۔۔۔مجھے پتا چلا کہ ہماری کلاس سوشیالوجی کی کلاس کا جی این پ کافی ہے اور ہم اس اعتماد کر کے آسانی سے آگے چل سکتے ہیں۔بائی دی وے کیا آپ لوگ کچھ سمجھتے ہیں فرد اور معاشرے کا آپس میں یا رشتہ ہے؟ فرد کی آواز بڑی

ضروری چیز ہے۔۔۔۔لیکن کیا کبھی یہ بھی ممکن ہوگا کہ معاشرہ بھی اپنی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائے اور پھر بھی قائم رہے۔۔۔۔؟"

اب پروفیسر کی شکل بوڑھی ہو گئی۔۔۔اپنے موٹر سائیکل جتنی پرانی۔۔۔۔

ہمیں معلوم بھی نہ ہو سکا کہ لیکچر شروع ہو گیا ہے۔

پروفیسر سہیل بڑی چابک دستی سے فرد اور معاشرے کے باہمی ربط کو زیر بحث لا رہا تھا۔لیکن کچھ ایسے باری باری گیند ہم سب کے کورٹ میں پہنچتا کہ ہم اپنی پوری ذہنی قوت کے ساتھ اسے پروفیسر کے کورٹ میں لوٹا دیتے۔دیکھتے دیکھتے چہرے تمتمانے لگے۔آوازیں تیکھی ہو گئیں۔ہاتھ ہوا میں چلنے لگے۔لڑکیاں جو نمازیں نیت کر بیٹھیں ہوئی تھیں سوئے کے ساتھ برف توڑتی نظر آنے لگیں۔بات فرد اور معاشرے سے ہو کر اب دور جا نکلی تھی۔اور ہم سویڈن تھائی لینڈ، روڈیشیا، میکسیکو، یوگینڈا کے مختلف معاشروں کا تقابل کرتے کرتے کبھی فرد کی محرومی کے متعلق سوچ رہے تھے اور کبھی معاشرے کی بے چارگی پر افسوس کر رہے تھے۔

پھر سیمی شاہ اٹھی اور بولی۔۔۔۔"سر آپ کا کیا خیال ہے اگر معاشرہ Ideal ہو تو کیا کوئی فرد کبھی خودکشی کر سکتا ہے؟"

پروفیسر نے اپنے چھتے جیسے سر میں انگلیاں ڈبوئیں پھر سوال کو لڑکوں کی قطار میں پھینک دیا۔لڑکوں کی قطار سے جب کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو پروفیسر نے کہا" دراصل خودکشی ایک Symptom ہے کسی معاشرے کے اندر اگر کوئی بیرومیٹر فٹ کیا جائے تو خودکشی اس کا آخری درجہ حرارت ہوگا۔افسوس مس شاہ ابھی کوئی آدرشی سوسائٹی ایسی نہیں بن سکی اس لیے ہم تجربہ نہیں کر سکتے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کا پریشر پاگل پن کو جنم دیتا ہے اور پاگل پن ہی خودکشی کا باعث ہے۔"

اس کے بعد وہ ڈرخائم کے حوالے سے دیر تک بات کرتا رہا۔ہم سب ایسی عمر میں تھے جب خودکشی سے ایک روحانی اور رومانی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے ایسی

وجوہات کا جائزہ لیا گیا جن کی وجہ سے فرد خودکشی پر مائل ہوتا ہے۔ اقتصادی معاشرتی شخصی، ذاتی وجوہات۔۔۔ بالآخر بار خودکشی سے کھسک کر داغی امراض اور پاگل پن کی طرف مڑ گئی۔ کیونکہ خودکشی نتیجہ تھی وجہ نہیں تھی۔ اصلی وجہ وہ دیوانہ پن تھا جس کی بنا پر انسان کئی احمقانہ اقدامات اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

انجیلا شروع سے آخر تک خاموشی سے بیٹھی رہی۔ پروفیسر سہیل کے ساتھ ساتھ فرزانہ طبیہ اور کوثر بہت گرم جوشی سے بحث میں حصہ لے رہی تھیں۔ لیکن یہاں پر ان کی بولتی بند ہو گئی۔

سہیل پروفیسر بولا۔۔۔ ''آپ لوگوں نے فرد اور معاشرے کی کشمکش کو بہت خوبی سے سمجھا ہے اور بہت سے صحیح نتیجے اخذ کیے ہیں۔ مس فرزانہ ٹھیک کہتی ہیں کہ معاشرے کا پھندا جب فرد کی گردن پر بہت تنگ ہونے لگتا ہے تو کبھی کبھی فرد موت سے پہلے خود اپنے فیصلے سے مرنا پڑتا ہے۔ کوثر نے خودکشی کی ان گنت وجوہات کو ایسے بیان کیا ہے کہ اس میں ایک نئی دریافت کی سی تازگی پیدا ہو گئی۔ لیکن اب میں آپ لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کہ و چیں خودکشی کا فعل جسے آپ سب متفقہ طور پر پاگل پن پر۔۔۔ وجہ پر نتیجے پر نہیں پاگل پن کی اصلی وجہ کیا ہے۔۔۔ یاد رکھیے پاگل پن جس قدر ششدر کرنے والی حالت ہے اسی طرح پاگل پن پیدا کرنے کی وجہ کو بھی حیران کن ہونا چاہیے۔''

اب ہماری لڑکوں کی ٹیم اس بحث میں لنگوٹے کس کر داخل ہوئی۔

''پاگل پن کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو Functional وجہ ہو سکتی ہے سر کہ بچہ پیدائشی طور پر نامکمل ہو۔۔۔ دوسری وجہ نفسیاتی ہو سکتی ہے۔''

''اور گھبرائیے ان وجوہات کے علاوہ شاید کوئی اور وجہ بھی ہو۔''

اب تک آفتاب نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا تھا۔ یہ کشمیری بچہ سفید رنگ کی پیکنگ میں برتھ ڈے گفٹ کی طرح سجا سجایا پڑا تھا۔ آفتاب کی یہ عادت بعد میں

ہمیں پتہ چلی کہ جہاں مسکراہٹ سے کال چل جاتا وہاں وہ ایک لفظ نہ ضائع کرتا۔ جہاں لفظ سے عندیہ پورا ہوجات وہاں وہ جملے کو استعمال نہ کرتا۔ جہاں مختصر بات کافی ہوتی وہاں وہ لمبی بحث میں نہ پڑتا۔ وہ عموماً پوائنٹس میں بات کرنے کا عادی تھا۔

انگلیوں پر گنتا جاتا ۔۔۔ایک۔۔۔نمبر دو۔۔۔نمبر تین۔۔۔اور زیادہ وقت اسے نمبر تین سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایم اے کی کلاس میں آفتاب کی سب سے لمبی گفتگو تھی۔

آفتاب اٹھا اس نے اپنے دونوں بازو صلیب کی طرح اٹھائے آدھی آستین والی قمیض میں اس کے دونوں بازو سنہری گھاس سے اٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی اس کی براؤن آنکھوں میں چمکتے شہد جیسی روشنی پیدا کر رہی تھی اور اس وقت وہ اولمپک کھیلوں میں آگ مشعل اٹھانے والے کھلاڑی کی طرح خوبصورت، کنوارہ اور مقدس نظر آ رہا تھا۔ شاید اسی لمحے سیمی نے اس کی طرف دیکھنے کی غلطی کی اور دیوانی ہوگئی۔

''پاگل پن ہمیشہ ناآسودہ آرزوؤں سے پیدا ہوتا ہے سر۔۔۔اور ناآسودہ آرزوئیں ان Taboos سے جنم لیتی ہیں۔ جو ہر کلچر میں موجود رہتی ہیں۔ جس کلچر میں ماموں زاد بہن سے شادی نہیں ہوسکتی وہاں ماموں زاد بہن کے عشق لاحاصل سے دیوانگی پیدا ہوسکتی ہے۔''

''فرائیڈ سے مستعار لینے کا شکریہ۔۔۔سیمی نے قینچی جیسی تیکھی انگریزی میں کہا۔''

''محترمہ۔۔۔پاگل پن کی یہ وجہ میں نے Repression سے نہیں لی۔۔۔ میں جس پاگل پن کا ذکر کر رہا ہوں وہ میر تقی میر کا پاگل پن ہے۔۔۔فرہاد کا پاگل پن ہے۔۔۔پروفیسر سہیل تو دیوانے پن کی ایک سائیڈ دکھا رہے تھے خودکشی اور

موت میں دوسری سائیڈ پیش کر رہا ہو جہاں پہنچ کر دیوانہ پن مقدس ہو جاتا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر لیتا ہے دودھ کی نہریں بہا دیتا ہے۔''

کسی لڑکے نے پیچھے سے نعرہ لگایا۔۔۔''بیٹھ جاؤ جناب فرہاد صاحب۔''

آفتاب نے پیچھے قہر کی نظر ڈالی اور بیٹھ گیا۔

''Thats a point'' پروفیسر سہیل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''یعنی ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاگل پن دو قسم کا ہے۔۔۔ایک مثبت ایک منفی۔۔۔ویری گڈ۔۔۔اب اس مہینے آپ سب کی یہ Assignment ہو گی کہ آپ مجھے ایک نہ ایک وجہ ایسی بتائیں جس سے فرد میں پاگل پن پیدا ہوتا ہے۔۔۔یہ وجہ جبلی نہیں ہونی چاہئیے۔Enviromental نہیں ہونی چاہئیے۔۔۔کوئی آفاقی نظریہ لیکن بالکل نئی وجہ ہونی چاہئیے میں سب سے زیادہ سے پھرے جواب پر سب سے زیادہ نمبر دوں گا۔''

کلاس میں شور مچ گیا۔

''سر دیوانے پن کی صرف ایک وجہ ہے ماحول۔۔۔ماحول۔۔۔ماحول'' ایک طرف سے آواز آئی۔

''سر انسان میں پیدائشی نقص ہوتا ہے Biological''

''Repression سر۔۔۔''

''مانے نہ مانے کوئی۔۔۔اصلی پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے۔۔۔صرف ایک وجہ عشق لاحاصل۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔''

بھنگڑا ڈالنے کی انداز میں آفتاب کرسی پر چڑھ کر چلایا۔

''آڈر آڈر۔۔۔'' پروفیسر سہیل نے کہا۔''دوستو میری Increment کا سوال ہے اگر تم لوگ ایسے شور مچاؤ گے تو کالج والے میری رپورٹ کر دیں گے۔ پرنسپل صاحب کے پاس۔۔۔اور میری تبدیلی مظفر گڑھ کر دیں گے۔''

اس کے بعد بحث بے پتوار کی کشتی بن کر چلنے لگی۔

کلاس کے کسی ہپی نوجوان نے گروپ شادی اور حشیش کا قصہ چھیڑ دیا۔ پھر مغرب کی آزادروی سی بات نیگرو مسئلے کی طرف گئی۔ سویڈن میں اے بے سینا کے رفیوجی مسائل، ریڈ انڈین اور ان کے جادوگروں کی باتیں تو نو آبادیات اور جمہوریت کے بکھیڑے جاپان اوراس کی انڈسٹریل کامیابی۔۔۔۔روس کا پلٹتا ہوا کمیونسٹ نظام، جو بھی بات کسی کو معلوم تھی اس نے کی۔۔۔لیکن سیمی شاہ کو کرسی پر کھڑے آفتاب کے عشق لاحاصل نے سر کرلیا۔ وہ گلبرگ کی ساختہ تھی۔ اس کی ساری عمر کونونٹ سکولوں اور کالجوں میں گزری تھی۔ اپنے خالی اوقات میں وہ انگریزی موسیقی سنتی، ٹائم اور نیوزویک پڑھتی، ٹی وی پر امریکی سیریز دیکھتی اس کی واڈروب میں گنتی کے شلوار قمیض تھے، وہ شمپو ہیئر سپرے، ٹشو پیپر، کولون، اور سینٹ سپرے کے بل بوتے پر سنگار کرتی تھی۔ اس نے کبھی لوٹے بالٹی سے غسل نہ کیا تھا۔ بیک برش اور شاور سے نہانے والی اس دختر گلبرگ کو نہ جانے کیا ہوا کہ ایک کشمیری بچے سے وہ بھی اندرون شہر کے رہنے والے سے جب وہ عشق لاحاصل کا نعرہ لگا رہا تھا مات کھا گئی۔ اس سے پہلے سیمی شاہ اور آفتاب کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔ ایڈمیشن فیس داخل کرواتے وقت برآمدے میں آتے جاتے۔ لیکن اس تیسرے پیریڈ میں ان دونوں کی نگاہوں میں پہلے استعجاب ابھرا۔ پھر پہچان پیدا ہوئی اور ایک ہی سیشن میں سب کچھ اعتراف میں بدل گیا۔ کلاس کے بعد وہ دونوں اٹھے ایک انجانی قوت کے تحت ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ باہر پہنچ کر سیمی شاہ کچھ کہے بغیر آفتاب کی موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ آفتاب نے سوال نہ کیا کہ اسے کہاں جانا ہے اور وہ دونوں کسی فلمی منظر کی طرح آہستہ آہستہ سڑک پر فیڈ آؤٹ کر گئے۔ تعارفی تقریب میں تین افراد نے میرا پڑا کیا۔

آفتاب جسم کے اعتبار کے بالکل یونانی تھا۔۔۔ اگر وہ کلاس میں موجود نہ ہوتا تو

شاید میرا چراغ روشن سب سے روشن ہوتا، ایک خاص قسم کا بغض، حسد اور اللہ واسطے کا بیر میرے دل میں اس کے خلاف پیدا ہو گیا۔

دوسرا دھکا مجھے پروفیسر سہیل سے لگا اس سے پہلے کورس کی کتابوں سے نوٹ بنا کر رکھے ہوئے تھے ہر سال وہ ان ہی مختصر ناچوں کے بل بوتے پر پڑھاتے آرہے تھے۔ اور پنشن ملنے تک ان کی تعلیمی استعداد بڑھنے کے امکانات صفر تھے جو نظریات انہوں نے سروس کے شروع میں مرتب کے لیے۔ ان کو بدلا یا ان میں ترمیم کرنا ممکن نہ تھا۔

سکول میں ہم ماسٹر غالم رسول کی پرورش میں رہے۔ ان کی ڈاڑھی زبان کی گھن گرج اور وہ میز کبھی تبدیل نہ ہوئی جس پر وہ کلاس میں آتے ہی اپنی چھڑی رکھتے تھے۔ ان کی ڈاڑھی ہمیشہ کاسی مائل سیاہ خضاب سے چمکتی نظر آتی جس طرح تھانیدار ملزم کو لمبا ڈال کر ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں ایسے ہی وہ ہمیں بنچ پر کھڑے کر کے ہماری عزت افزائی کرے تھے۔ ان کی آواز کا وولیوم ---- کنٹرول خراب تھا اور صرف اونچے سروں پر کام کر سکتا تھا۔ گرمیاں سردیاں ان کی دہی بل دار سیاہ چھڑی میز پر نظر آتی۔ چھڑی تک ہماری رسائی نہ تھی۔ اس لیے ہم میز سے بدلے لیا کرتے تھے۔ پرکار سے گود گود کر نقطوں کی شکل میں اس کی چاروں ٹانگوں پر کئی گالیاں کندہ تھیں۔ لیکن یہ میز بدسلوکی کے باوجود اور ماسٹر صاحب کی ہمدردی بددعاؤں کے باوصف کبھی اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ اگر ان کے منہ سے نکل جاتا کہ جنگ آزادی ۱۶۴۷ء میں ہوتی تھی۔ تو پھر تمام کتابوں کی تصدیق کے باوجود اپنی رائے بدلنے پر رضامند نہ ہوتے، ان کی اس اٹل خاصیت کی وجہ سے ان کے تمام شاگردوں ڈرپوک گھنے اور بزرگ دشمن تھے۔ ماسٹر غلام رسول مغل بادشاہوں کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تمام شاہ ان کے ہیرو تھے۔ اگر ان کے عہد حکومت یا ذات میں کوئی کوتاہی کسی کو نظر

آتی تو وہ بلبلا اٹھتے۔ نکتہ چینی کرنے والے کو دلائل دے کر قائل کرنے کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔ ایسے میں ان کا وولیم کنٹرل کھلتا جاتا اور وہ دلیل کی جگہ چنگھارے اگلے کو قائل کر لیتے۔

نویں جماعت کے شروع میں کہیں سے توزک جہانگری میرے ہتھے چڑھ گئی۔ میں سارا دن ہم جماعت کو اس کے واقعات سناتا نہ تھکتا۔ گو میں ماسٹر غلام رسول کی ذہنیت سے واقف تھا لیکن نئی نئی جوانی ڑھی تھی انا پھن اٹھائے کھڑی تھی میں نے ہم جماعتوں پر اپنا رعب ڈالنے کے لیے ایک روز کلاس میں جرائت سے کہا۔ ’ماسٹر جی آپ نے توزک جہانگیری پڑھی ہے۔‘‘

’’جب تو ابھی تھوڑا موتا پھرتا تھا۔ تب میں نے اس کو پڑھا تھا، بیٹھ جا اور زیادہ علمیت نہ بگھار کر کلاس میں۔‘‘

’’ماسٹر جی۔۔۔‘‘ میں نے ذرا سی ارکوشش کے بعد کہا۔

’’کیا ہے؟‘‘

’’اس میں کچھ ایسے واقعات درج ہیں جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ بادشاہ جہانگیر کچھ ایسا رحمدل نہیں تھا۔‘‘

ماسٹر غلام رسول نے چاک کا ٹکڑا اڑیل میز پر مارا۔

’’نور جہاں سے شادی کی۔۔۔ یہ رحم دلی نہیں؟ کوئی بادشاہ کسی دوہاجو سے شادی کرتا ہے؟ اس کو کمی تھی کنواریوں کی بول بتا رحمدلی نہیں تو اور کیا ہے۔ بتا؟‘‘

ماسٹر جی اور میں مختلف پیمانوں سے رحم دلی کو ناپتے تھے۔

’’جہانگیر نے ایک ملزم کو۔۔۔ ماسٹر جی بکرے کی کھال میں بند کروا کے اوپر ملزم تھا ناں کوئی بے گناہ تو نہیں تھا۔ سزا ہمیشہ بہتری کے لیے دی جاتی ہے اب میں تم کو مارتا ہوں تو کیا اس کا فائدہ مجھے ہوتا ہے بتاؤ۔۔۔ ساری سزا ملزم کے فائدے کے لیے ہوتی ہے۔‘‘

''لیکن ماسٹر جی جو بکری کی کھال میں سلوا دیا گیا اس کو کیا فائدہ ہوا؟''

''بیٹھ جا۔۔۔بیٹھ جا اور بخشی نہ جاتا کر اپنے بڑے بھائی مختار کی طرح۔۔۔ مطلب ہو نہ ہو بخشی چلا جا رہا ہے، بولے جا رہا ہے خیر سے مونچھیں آ جائیں سدھی پدی تو بات کریں گے جہانگیر اعظم کی۔''

وہ سکندر اعظم کی طرح ہر مغل بادشاہ کے ساتھ اعظم لگانے کے عادی تھے اپنی مونچھوں کے سلسلے میں میں پہلے ہی کچھ شرمسار رہتا تھا اس لیے میں چپ چاپ بیٹھ گیا لیکن علمیت بگھارنے والے کڑکے نے میرے اندر کہیں بغاوت کر دی۔

تعلیم و تدریس کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ عام استاد عموماً اوسط درجے کا شخص ہوتا ہے اور وہ ذہنی جسمانی اور جذباتی طور پر لکیر کے فقیر قسم کی باتیں سوچتا ہے اسے ضبط و نظم سے مڈل کلاس لوگوں سے، اور پڑھا کو طلبا کو پڑھانے سے پیار ہوتا ہے لیکن سارا دن وہ بڑی قد آور شخصیتوں اور ان کے کارناموں کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے کبھی معاشرے کے ساتھ مطابقت نہ کی۔ عام ترین ہوتے ہوئے وہ ایسے لوگوں کی تعلیم عام کرتا ہے جن کی سطح پر وہ سوچ بھی نہیں سکتا اس کا اپنا کردار بچوں کو عام بنانے پر مصر رہتا ہے اور اس کی تعلیم بچوں کو خاص ہونے پر اکساتی رہتی ہے۔ سکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی جگہ سکول میں نہیں ہوتی لیکن ایسے ہی باغی بچوں کو بنچ پر کھڑا کر کے ہمیشہ ان عظیم شخصیتوں کی روشن مثالیں دی جاتی ہیں جو خود سکولوں سے بھاگ گئے تھے۔ ہر غلام رسول بچوں کو جنہیں جینیس۔۔۔کی کتابیں پڑھا کر عام بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور یہی تعلیم کا سب سے بڑا المیہ ہے خاص لوگوں کی تعلیم اور عام لوگوں کی داداگیری میرے دل کی بنچ پر بھی ماسٹر غلام رسول کئی قد آور شخصیتیں کھڑی تھیں اس درخت جیسی ہو گئی جسے زیبائش کے لیے جاپان میں پالا جاتا ہے، جو سالوں پرانا ہوتا ہے لیکن جس کا قد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

میں اسی لیے اس قدر محتاط تھا کہ کبھی کبھی بے عمل ہو جاتا۔

تجزیے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن عملی زندگی میں بھی سیدھے راستوں کی بجائے میں پگڈنڈیوں پر آوارہ کتوں کی طرح سرگرداں رہتا۔ مجھے کسی ایسے گرد کی تلاش تھی، جو مجھے کھینچ تان کر اپنے علم جتنا بڑا کر دے لیکن سکول کے بعد ایک اور ماسٹر غلام رسول مل گئے۔

ان سے میری ملاقات بی اے کے پہلے سال مین ہوئی۔ پروفیسر تنویر ہمیشہ فارن سگریٹ پیتے ان کے تھری پیس سوٹ بے داغ ہوتے۔ چہرے پر موٹے شیشوں کی عینک ہوتی۔ کلاسوں کے علاوہ وہ ہمارا ٹٹوریل بھی لیتے تھے۔ انہوں نے بھی ان گنت کتابیں پڑی تھیں۔ ان کا مطالعہ مجھے مرعوب کرتا تھا۔ کیونکہ میری اولین تعلیم دیہاتی تھی۔ اس لیے میں فیوڈل نظام پسند کرتا تھا۔ وہ پکے سوشلسٹ تھے۔۔۔۔ تھوری کی حد تک وہ معاشرے کی ہر مسیبت کو دولت کی غلط بانٹ سے منسوب کتے۔ ۔۔۔ بی اے کے پہلے سال میں وہ ایک اور قسم کے ماسٹر غلام رسول ہیں۔ وہ دل سے سوشلسٹ تھے۔ لیکن صرف کتابی طور پر۔۔۔۔ ان کا رہنا سہنا ملنا ملانا، زندگی بسر کرنے کی چھوٹی چھوٹی جزیات کسی فیوڈل لارڈ کیسی تھیں، مشکل یہ تھی۔ وہ نہ اپنے سوشلسٹ نظریئے پر تنقید برداشت کرتے تھے۔ نہ اپنی طرز زندگی پر۔

اگر کوئی تضاد ان کے شاگردوں کی نظر پڑ جاتا اور وہ اس پر رائے دے دیتے تو ماسٹر تنویر سختی کے ساتھ اس آزادی رائے کی سرکوبی کرتے جس کے وہ پرچارک تھے۔

بی اے فائنل کے امتحانوں سے کچھ دن پہلے کی بات ہے وہ میں کلاس میں سگریٹ پینے کی اجازت دے کر اپنے روشن خیال ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔

''میں کھڑا ہو کر بولا۔۔۔۔ سر ایک بات ہے۔''

''سگریٹ مت بجھاؤ ہم دوست ہیں پوچھو۔ اور بیٹھے رہو۔''

''سر آپ ہر روز ہمیں بتاتے ہیں کہ روپیہ تھرڈ ورلڈ ذلت کی جڑ ہے۔ پھر آپ اپنی کار بیچ کر معمولی موٹر سائیکل کیوں نہیں خرید لیتے؟''

ابھی میں پختہ نہیں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ عام طور پر قول اور فعل کے تضاد سے بڑی قد آور شخصیتوں کا خمیر بنا ہوتا ہے۔

پروفیسر تنویر کا چہرہ لال ہو گیا۔ انہوں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا ''یہ بالکل پرسنل سوال ہے بیٹھ جاؤ ارے یاد رکھو تم قصباتی لوگوں کے manners بہت کمزور ہوتے ہیں، بے وقوف گدھے۔۔۔ اگر میں کار بیچ دوں گا تو کالج کیسے آؤں گا؟''

میری انا کو سخت دھچکا لگا۔ اس لیے بحث کو اب چھوڑنا میرے لیے بھی آسان نہ تھا میں نے پروفیسر تنویر کو زچ کرنے کے لیے کہا۔۔۔ ''سائیکل پر سر۔۔۔ سائیکل پر۔۔۔ انسان کو عوام میں ملے رہنا چاہیئے۔''

''یہ Space age ہے گھدے آدمی۔۔۔ ہر کام میں وقت بچانا پڑتا ہے۔ اور ہم مجھے سائیکل سوار بنا رہے ہو۔''

''لیکن سر چین بھی تو Space age میں ہے وہاں کے لاگ۔۔۔''

''ایک دانشور انٹو یکچوئل سائیکل پر آئے جاتے۔۔۔ اور تمہارے بزنس کارخانے دار۔۔۔ دو کوڑی کے نو دولتیے کاروں پر گھومیں۔ مر مر کر تو جگہ ملی ہے معاشرے میں۔۔۔ برسوں کی جدوجہد کے بعد گریڈ بڑھے ہیں۔ ہم بھی عزت وار زندگی بسر کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔''

''سر لیکن آپ کے نظریات کے مطابق تو سوسائٹی میں کوئی طبقہ نہیں ہونا چاہیئے، جس سے عزت بے عزتی کا سوال پیدا ہو۔''

اب پروفیسر کے منہ سے جھاگ اڑنے لگی وہ دونوں بازو لہرا لہرا کر بولے۔۔۔

''بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔۔۔ مینڈکی! کھوپڑی ڈھائی انچ کی ہوتی ہے اور

اس میں مارکس کے نظریات بٹھانا چاہتے ہیں، بیٹھ جاؤ۔۔۔بھائی میاں۔۔۔ پہلے ٹائی کی ناٹ باندھنا سیکھو۔۔۔پھر ادھر آنا۔۔۔ان باتوں کی طرف۔۔ ۔۔"

میں اپنی ٹائی کی ناٹ ہتھیلی میں چھپا کر بیٹھ گیا۔۔۔پروفیسر تنویر کو کھوپڑیاں کھولنے کا عمل نہیں آتا تھا۔وہ کسی کو ایسی تعلیم دینے کے اہل نہ تھے جو نظریے اور عمل کا فرق کم کر دے۔

لیکن پروفیسر سہیل ایسا چھپا ہو کاغذ نہیں تھا، جس پر مزید کچھ لکھا نہ جا سکے، وہ تو سلیٹ کی مانند تھا، لکھا۔۔۔مٹایا اور پھر لکھ لیا کتابوں سے اس کا شغف دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔۔۔مجھے بھی عرصے سے کتابوں کی رفاقت نصیب تھی۔لیکن کتابوں نے مجھ سے زندگی کی ہلکی طرف کو پشیدہ کر دیا تھا۔میں محسوس کرتا تھا، کہ کتابوں نے مجھ سے زندگی کی ہلکی طرف کو پوشیدہ کر دیا تھا، میں محسوس کرتا تھا، کہ کتابوں سے محبت کرنے والے عموماً زندگی کی اس اہم سمت کو بھول جاتے ہیں۔وہ اس قدر سنجیدہ ہو جاتے ہیں کہ مزاح مکمل طور پر ان کی زندگی سے نکل جاتا ہے اور وہ لمبہ جبہ پہن کر سارا وقت پڑھے ہوئے نظریات کی لاٹھی سے دوسروں کی پٹائی میں مصروف رہتے ہیں۔

پروفیسر سہیل مختلف اور عجیب تھا شخصیت پر کسی نہ کسی غلام رسول نے اپنی مہر لگا رکھی تھی۔۔۔اسلیے بچے کی طرح سادہ، کسی گنوار کی طرح متحیر اور کسی مسخرے جیسے ہنسوڑ پروفیسر سہیل کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔تعارفی کلاس میں ہی مجھے اپنی علم دوستی سے گلہ پیدا ہو گیا۔مہاتما بدھ کی دھاما پادھا سے لے کر موجودہ دور کے تازہ ترین علم پیرا سائیکلوجی تک مجھے جو کچھ پیش آیا تھا۔اس سے اکتاہٹ پیدا ہو گئی۔کاش میں بھی سادہ سلیٹ ہوتا۔۔۔پچھلا لکھا ہوا مٹا سکتا اور پروفیسر سہیل کی دی ہوئی Assignment کو اسی تازگی سے لکھ سکتا جس کی وہ ہم سے توقع رکھ رہے تھے۔

حالانکہ ابھی میں نے مضمون نہیں لکھا تھا۔ لیکن ابھی سے انہیں مایوس کرنے کا دکھ مجھے تھا۔

آفتاب کے حسن اور پروفیسر سہیل کے علم کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے بعد میں نے تیسرا سجدہ سیمی شاہ کو کیا۔۔۔۔ غالباً اس میں اس کلچر کی جیت تھی جو دیہاتی لوگوں و میسر نہیں آتا۔

میں نے اس سے پہلے اتنی مکمل شہری لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں اشتہاروں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ اور وہ مجھے ہوائی سفروں پر بادلوں سے اوپر لے گئی۔ اس کا لب ولہجہ۔ لباس اٹھنا بیٹھنا، جسم سے اٹھنے والی خوشبو سب اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ مجھ سے زیادہ مہذب ہے۔ اب میری انا کا یہی مسئلہ تھا کہ میں اس لڑکیکو پچھاڑوں۔ اور اسے اپنید یہاتی بیک گراؤنڈ میں گھسیٹ کر لے جاؤں جہاں وہ میری وجہ سے پچھاڑ کھا کر گرے اور مکمل طور پر دیہاتی ہو جائے۔

پھر اس کے صبح و شام ماں کی طرح لسی پینے دودھ دوہنے، چرغا کاتنے اور بڑی بڑی ہانڈیوں میں ساگ پکاتے ہوئے صرف ہوں۔ شاید ہر مرد کے اندر یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ عورت کو اس کی پٹڑی سے اتارے اور اپنے راستے پر لے کر چلے۔ اب یہ اور بات ہے کہ آفتاب مجھ سے پہلے ہی سیمی شاہ کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر رخصت ہو گیا تھا۔ اور اندرون شہر کے کلچر پر اردو میں پہلا لیکچر دے رہا تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں

پوٹھوہار کا وہ علاقہ جہاں آج کل دوسرے درجے کے بے آب خاکستری پہاڑ ہیں اور جن کو مقامی لوگ پبتیاں پکارتے ہیں۔ یہی علاقہ جو ہوائی جہاز کی کھڑکی سے امریکہ کے جنوبی ریگستانوں سے مشابہہ نظر آتا ہے یہ علاقہ ایک زمانے میں لہریں مارتا چاند کی طرف لپکا، مردیں سمندر تھا۔ پھر کسی جوگی نے وتین صدی سے اس کے

کنارے بیٹھا گیان دھیان میں مصروف تھا۔مندر کو نظروں سے اوجھل ہونے کا سراپ دے دیا۔سمندر ایسے لوٹا کہ ہر ہر لہر پالا گن پالا گن کہتی بحیرہ عرب میں جا گری اور اس علاقے کی تہہ آب چھپی ہوئی پہاڑیاں ٹنڈ منڈ باہر نکل آئیں۔ان پہاڑیوں کے نشیب و فراز اور کٹاؤ ایسے تھے کہ لہر ور لہر سمندر کے بہاؤ کا پتہ دیتے تھے۔

کچھ اور لوگ کہتے ہیں اس علاقے سے لحق کبھی ایک گھنہ جنگل تھا اجنگل کے درخت ایسے اونچے چھتنارے ڈال ملے تھے کہ اس میں بہنے والی ندیوں کو بھی راستہ نہ ملتا اور سورج کی روشنی سے ان کے پانیوں میں کبھی ست رنگے بھنور نہ پڑتے۔یہاں سارا دن پرندے آزادی سے گھومتے پھرتے اور الو بھی دن کے وقت دیکھ سکتے تھے۔لیکن ایک رات چاند سے ایسے آسیب کی ہوا اتری کہ سارا جنگل ٹنڈ منڈ ہو گیا اور سب ندی نالے سوکھ گئے۔اسکے علاوہ کچھ لوگ کہتے ہیں کئی قرن پہلے جب پہلی بار بنی نوع انسان متحد ہوا تو یہ جنگل موجود تھا۔اس وقت وہ تمام منزاول علوم رائج تھے جو آج پھر سکھائے جاتے ہیں۔تب پہلی بار انسان نے مریخ اور زہرہ کا سفر کیا تھا اور زمین پر ایٹم بن بنائے تھے۔جب تمدن کی کمان پورے زور سے تن گئی تو انسان نے سارے بم گرا کر اللہ کی دھرتی کو تہس نہس کر دیا۔اور یہ جنگل بے آب و گیاہ بنجر علاقہ بن گیا۔

یہ تب کا ذکر ہے جب انسان نے پہلی بار متمدن ہو کر اپنے بم دنیا پر نہ چلائے تھے۔جانوروں کی بستیوں میں اس ایجاد کی وجہ سے بہت تشویش پھیلی ہوئی تھی۔اسی لیے جنگل میں کانفرنس بلائی گئی۔جانوروں کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں اتنے پرندے آئے کہ جنگل کے درختوں کی کسی شاخ پر بیٹھنے کو جگہ باقی نہ رہی۔

ہند سندھ سے کاسنی پروں غول در غول آئے کھاسی کی پہاڑیوں سے سرخ دم والی بلبل اور فیروزی رنگ کا کبوتر اس شان سے آیا کہ اس کے اندرونی نارنجی پروں سے

سکی آنکھیں خیرہ ہوئیں کھٹ منڈو کا بھجنگا اور تبت کے شاہین کئی پڑاؤ ٹھہر کر حاضر ہوئے۔افریقہ کے بھٹ تیتر بن مرغی اور بلبلیں تو آئی ہی تھیں لیکن شکاری پرندوں نے بھی اپنی مصروفیات بھلا کر امریکہ اور آسٹریلیا سے یہاں تک کا سفر اختیار کیا تھا۔ اونچے اونچے درختوں میں ریسٹ ہاؤس بن گئے شکرہ باز چرخ عقاب گو ایشیا کو چک اور روسی ترکستان کے باسی تھے لیکن وہ بھی پامیر کے پرندوں کو ساتھ لے کر پہنچے تھے۔کوا، مینا، بٹیر، کھٹکھٹ چکور، چڑیا، مقامی جنگل کے عوام تھے۔اس لیے میٹنگ میں ان کی اجتماعی ووٹ بہت اہم تھی۔لیکن انفرادی طور پر کوئی ان کی رائے کو نہ پوچھتا تھا۔مڑی ہوئی ناک اور رارنجی اڑانوں والے پرندے سفید فام قوموں کی طرح احساس برتری سے اترائے پھر رہے تھے۔دریائے گھاگر اور چترنجی کے طاس سے لٹورے، بھوری کنڈول اور غوغائی بڑے طمطراق اور سلیقے سے فوجی ہوائی جہازوں جیسی فارمیشن بناتی آئیں۔زریں پشت، نیل کنٹھ اور ہدہدوں کی ٹولیوں نے پرانے درختوں کے ٹھنٹھ بسرام کے لیے چن لیے۔فاختہ کوئل اور چنڈول کو اس مجلس مشاورت سے کوئی دلچسپی نہ تھی ان کے بھانویں انسان چاہے۔ساری کائنات ختم کر دیتا وہ میلے گھومنیاں تو جنگل والوں سے ملے ملانے چغلی عیب جوئی کے لیے آئی تھیں۔لیکن جنگل میں پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ معاملہ سنگین ہے۔

کانفرنس سے کچھ دن پہلے سارے بن مین بھانت بھانت کے پرندوں سے کوک پڑی تھی۔صاحب صدر کا سب انتظار کر رہے تھے۔کرسی صدارت خالی ہونے کی وجہ سے کانفرنس جاری نہ کی جا سکتی تھی۔کچھ عرصہ بعد پرندوں کی نمائندہ ٹولی ماؤنٹ ایورسٹ سے یہ خبر لے کر واپس آئی کہ وہ تمام پربت چھان آئے ہیں۔ دھولی دھار ننگا پربت، کے ٹو اور کنچن چنگا تک ہو آئے ہیں لیکن ہما کا کہیں سراغ نہیں ملا۔شاید دنیا میں کسی زبردست بادشاہ کی آمد تھی اور وہ اس کے انتخاب مین کائناتی طاقتوں کی مدد کرنے کے لیے اپنے وی آئی پی ٹور پر نکلا تھا۔اس دور کے متعلق بھی

پرندوں میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں۔ کچھ شکاری ہوا بازوں کا خیال تھا کہ قیامت کے آثار قریب ہیں اور یہ قریب ہے اور یہ قیامت خود انسان کے ہاتھوں برپا ہونے والی ہے۔ دنیا کو قیامت سے بچانے کے لیے مرد مومن کی تلاش ہے اور اس بار ہما بادشاہ کا چناؤ نہیں بلکہ نجات دندہ کو کھوجنے کے لیے نکلا ہے کچھ پرندے سمجھتے تھے کہ ہما اب صوفی منش ہو چکا تھا۔ وہ انسان کو اتنی بار اللہ کی کلافت کا مشورہ سنا چکا تھا لیکن ہر بار خلیفہ صرف بادشاہ بن کر بیٹھ جاتا۔ ہما کو اس بات کا اتنا دکھ تھا کہ اب وہ اشرف المخلوقات کے سروں پر سے اڑنا گوارا نہیں کرتا۔ اور کہیں چھپ کر وقت گزر رہا تھا۔

بوم جاتی اپنے پرائے میں پاؤں اڑکانے کے عادی نہ تھے، انہیں اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہما اپنی انفرادی شان کی وجہ سے مشیت ایزدی کو بالکل ملحوظ نہیں رکھتا۔ اسے صرف کسی کسی انسان کی آرزو کی خشبو ملتی ہے جس کی تعاقب میں وہ پہنچ جاتا ہے۔ اسی لیے ہما جس کندھے پر بیٹھ کر بادشاہت کا اعلان کرتا ہے وہی بادشاہ رعایا کے زوال کا باعث بنتا ہے لیکن الو لوگ چونکہ دیکھنے کے عادی تھے اور بولنے سے پرہیش ان کا شیوہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار برملا نہ کیا۔ چپ چپ رہے اور ٹکر ٹکر صاحب صدر کا انتظار کرنے لگے۔

گو بوم جاتی کے سرکردوں نے اپنی رائے کا اظہار اندروالے سرکل مین کیا تھا۔ لیکن کوے کن سوئی لینے میں اول درجے کے حرامی ہوتے ہیں ویسے بھی انہوں نے بات پہنچانے کا فن آدم زادوں سے سیکھا تھا۔ گول آنکھوں والے الوؤں کی بات سارے میں پھیل گئی اور سارے جنگل میں چہ چہ کی آوازیں آنے لگیں۔ کوؤں کی چھٹ بھیا برادری کو ویسے بھی ہما سرکس کا جوکر لگتا تھا، جو ازل سے خود سر بھی تھا اور بر خود غلط بھی جب عرصے تک ہما نایاب رہا، تو میٹنگ کی بے جا طوالت سے سب پرندے عاجز آنے لگے۔ کوے بجا طور پر نالاں تھے۔ کیونکہ ان کو جنگل کی عادت نہ رہی تھی۔ وہ کوٹھے منڈیروں پر بیٹھ کر عورتوں کی باتیں سننے کے عادی ہو گئے تھے۔

یہاں انسان کا ساتھ نہ ملا تو یہ پکھیرا پارٹی بہت دق ہوئی۔

اب اکا دکا سیانے مکار اور ڈرپوک کوے شاطر شیاست دانوں کی طرح چھوٹے پرندوں کی گنی چنی نفری کو گھیر لیتے اور مشتعل کرتے۔ ''لو ہما تو ال کا احمق ہے بادشاہ چنتا پھرتا ہے دھرتی پر۔۔۔ بھائی ادھر دنیا کا ہر انسان بادشاہ چاہے کھرلی میں سوئے چاہے تخت پر ہما کم عقل یہ نہیں سمجھتا کہ ہر انسان اپنے آپ کا اشرف المخلوقات سمجھتا ہے جن کے سر پر تکبر کا تاج ہو ان کو بادشاہ کیا بنانا۔''

لیکن مور چنو پھیلائے سارے جنگل میں ہما کے سواگت کا ناچ ناچتے پھرتے تھے۔ انہیں اس کانفرنس میں آنے کی یہی خوشی تھی کہ وہ استقبالیہ کمیٹی پر ہیں۔ کوے موروں کی ٹولی میں جا نکلتے تو فٹ دوغلی پالیسی تلے کہتے۔ ''ہما کی بات کچھ اور ہے۔۔۔ کرسی صدارت پر صرف وہی سجے گا۔ اگر نہ براجے تو چاہے لاکھ کھٹ جوڑ کر منت کچھ نہ ہوگا۔''

کرسی صدارت دیر تک خالی رہنے کی وجہ سے ہما کے نعم البدل کا ذکر ہونے لگا۔

پھر پرچہ لگا کہ جہاں سے سمندر پر نام کرتا لوٹا تھا اور جہاں پہاڑیوں پر سیپیاں گھونگھے، بچھو صولن سگ، مچھلی کے ڈھانچے اور دوسری سمندری مخلوق مردار پڑی تھی۔ وہاں ایک سیمرغ کا شانتی بھون ہے۔ اس کی عمر کا کسی کو کچھ اندازہ نہ تھا۔ کچھ پرندے مصر تھے کہ سیمرغ بابا نوح کی کشتی میں رفیوجی رہا۔ کچھ کا خیال تھا کہ وہ علاقے جسے آج کل اسرائیل ہتھیانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہیں غازہ کے علاقے میں مسجد اقصیٰ سے طاقت اخذ کرنے کے لیے سیمرغ کبھی رہتا تھا۔ بوڑھے کچھوے مصر تھے کہ بحیرہ روم کے طاس میں جس وقت پچھلی رات کو پہلی بار چاندی جیسا پانی بھرنے لگا اور ابرق جیسی ریت لہروں سے آشنا ہوئی اس ریتلے خطے میں سیمرغ رہتا تھا۔

ساری رات وہ چاند سے نظریں ملائے قوت جذب کرتا رہتا اور سارا دن تپتی

ریت میں پنکھ پھیلائے بنجر اور ویران عمل آفتابی میں مشغول رہتا۔ فاختہ بضد تھی کہ سیمرغ کی ہی قوت سے پوٹھوہار علاقہ جنگل ہوا۔۔۔ اگر چاند کی پوری کشش سیمرغ میں نہ ابھر آتی۔ ایک بھی پانی کی لہر اس علاقے سے لوٹنے کا ارادہ نہ کرتی۔ عمل مہتابی میں وہ مقناطیسی قوت تھی جس نے پانی کو باہر کی طرف لوٹنے پر مجبور کیا اور آخر میں تمام پانی بحیرہ عرب میں جا گرا۔

راہب طبع سیمرغ کو غل غپاڑے سے نفرت تھی۔ وہ جنگل کے باسیوں سے بڑی وحشت کھاتا تھا۔ بے آباد جگہوں میں رہنا اور جینے بھر کی خوراک کھانا اس کی عادت تھی۔ لیکن نمائندہ وفد نے اسے ڈھونڈ نکالا اور اس تجربے، فطانت، ذہانت اور نجابت کی قسمیں دے دلا کر اسے میٹنگ میں لے آئے۔ سیمرغ پورے چاند کی رات میں پچھلے پہر آئے اس کے آنے سے چند ثانیے پہلے سارا آسمان درخت توڑ آندھی کی لپیٹ میں آ گیا۔ طوفان سے محبت کرنے والے پرندے اونچی اڑانوں کو نکل گئے۔ ڈرپوک پرندے لمبی شاخوں سے لپٹ کر جھونٹے لینے لگے۔ پھر زور سے بجلی چمکی دھرتی کانپی بجلی اس دھماکے اور چنگاڑ سے چمکی کہ رات دن سی اجالی گئی۔ اس لمحے جب تمام پرندے شڑاکے کی بجلی سے دم بخود تھے۔ سیمرغ چودہ سال پرانے بڑ کے درخت پر آ بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی آندھی چھٹ گئی۔ درخت ساکت ہو گئے اور بڑ کے درخت میں جیسے فاسفورس کا ایک بڑا فانوس روشن ہو گیا۔ جس وقت سیمرغ نے پر پھڑ پھڑا کر اپنی رجامندی کا اعلان کیا تو جنگل پار تک توپوں کے فائر جیسی آواز آئی اور جانوروں نے ایک دوسرے کو کسی بھونچال کے آنے کی کبر دی۔

''اتنی بڑی کانفرنس بلانے کی وجہ کیا ہے؟'' سیمرغ نے سوال کیا۔

چیل جاتی کے گروہ میں سے ایک تنبولن سی چیل نکلی تراہ تراہ کرتی آگے بڑھی۔۔۔ ''آقا مسئلہ بہت باریک اور توجہ طلب ہے تو دیکھتا ہے کہ آج کل انسان پہلی بار

متحد ہوا ہے اس نے اپنی ایجاد پسند طبعیت کے ہاتھوں زہرہ اور مریخ کے سفر کیے ہیں۔لیکن انسان کی سرشت میں ایک وصف ایسا ہے جو اس کی تباہی کا باعث ہے۔

۔۔۔دیوانہ پن۔۔۔اپچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور دیوانے پن سے مشتعل ہو کر اس نے ایسے ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں جن سے یہ کرہ زمین کو منٹوں میں تباہ کر دکتا ہے اور اپنے ہمجنسوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا ہے۔اے پرندوں کے شاہ! ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے کچھ پرندے بھی پاگل پن کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔''

مینا نے پر پھڑ پھڑائے اور سب کو متوجہ کر کے بولی۔۔۔''جس وقت پہلی دیوانگی کا واقعہ ہوا۔۔۔قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا اور کوے نے انسان کی بے بسی دیکھ کر اس کی مدد کی آسمان سے اترا اور ہابیل کی لاش کو مٹی میں چھپانے کا گر سمجھایا۔انسان کی کم ظرفی ملاحظہ ہو۔شکر گزار ہونے کی بجائے اس نے ہمیشہ کوے کو ذلیل سمجھا اور پرندوں کو اپنی عقل سے تابع کرنے کی کوشش کی۔

جب نبی قابیل نے جشن منایا تو وہ جنگلی جانور پکڑ کر لائے ان کو ذبح کیا۔گوشت خود کھایا اور کلے پائے ادھر ادھر پھنکوا دیے اور کتے اور بلی نے گوشت کی کثرت دیکھی۔۔۔تو اپنے ابنائے جنس کو چھوڑ کر بستیوں میں آ رہے سیر بھر کر کھایا اور وافر مٹی تلے چھپا چھوڑا۔۔۔حرص کا شکار ہوئے۔''

''یہ لمبی داستان ہے آقا۔۔۔بہت لمبی۔۔۔انسان لاکھ اشرف المخلوقات سہی ہم اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے، اس کی صحبت کبھی کسی جانور کو پرندے کو راس نہیں آئی۔''

طوطا مینا کا دشمن تھا اور بدا کر بولا۔۔۔''اگر انسان کی صحبت سے دیوانگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں، حرص، رغبت کینہ وحسد جنم لیتا ہے تو بتا گدھا حریص کیوں نہیں حالانکہ وہ انسان کا سب سے پرانا ساتھی ہے۔''

مینا جز بز ہو کر بولی۔۔۔''اور تو بتا اتنی وفاداری کے باوجود۔۔۔اتنی نیک

نفسی کے باوصف انسان نے گدھے سے ہمیشہ کیا سلوک کیا؟ کس قدر بوجھ لادتا ہے وہ ان بے زبانوں پر۔۔۔۔اور جس کسی کی عزت مقصود نہ ہو اسے گدھا پکارتا اور سمجھتا ہے، انسان کا کیا ہے یہ تو دودھ پلانے والے جانوروں کا کام نکل جانے پر قصائی کے حوالے کر دیتا ہے۔انسان کی بات درمیان میں نہ لاؤ دوستو ورنہ بحث لمبی ہو جائے گی۔"

چیل اسی بندر گھاؤ سے پریشان ہو کر بولی۔۔۔۔۔"ملزم کے نفع نقصان پر اس وقت بحث فضول ہے سزا دو۔۔۔۔اور نکال دو۔۔۔۔سزا دو اور نکال دو۔"

کاہنو جیسے سیاہ لباس والی کوئل بولی۔۔۔۔۔"سوچ لو عادلو۔۔۔۔انسانوں کی بستی سے گدھ جاتی لوٹ نہ سکے گی۔آخر گدھ کا ہمارے ساتھ پرانا رشتہ ہے، وہ ان درختوں پر ہمارے ساتھ رہا ہے بھلا وہ انسان کی صحبت میں کیسے تندرست ہو گا۔کیسے شفایاب ہو گا؟"

"تجھے شفایابی کی پڑی ہے ہم کہتے ہیں کہ بہت جلد اس کا پاگل پن سارے جنگل کو لپیٹ میں لے گا۔۔۔۔اور پھر کوئی چارہ نہ چل سکے گا۔۔۔۔"ایک جہاں دیدہ چیل بولی۔

چیلوں کو بحث سے کوئی غرض نہ تھی، ان کو سزا سے علاقہ تھا اور وہ صرف سزا کے متمنی تھے۔

سارے جانور کوئل کی بات سن کر گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔

بالغ نظر چیل پھر گویا ہوئی۔۔۔۔"ہم غافلوں کو اس بحث سے یک گونہ تشفی ہوتی ہے لیکن مکمل تسلی نہیں ہوئی۔ہمارا مطالبہ صرف ایک ہے کہ گدھ جاتی کا حقہ پانی بند کر کے انہیں جنگل بدر کر دیا جائے۔پھر چاہے یہ آبی جانوروں سے ناطہ جوڑیں چاہے انسانوں میں جا بسیں۔بس پرندوں میں ان کا شمار نہ ہو۔"

اس وقت سیاہ بگلا اٹھا اور ایک ٹانگ پر ایستادہ ہو کر بولا۔۔۔۔"دانشورو کی محفل

میں میرا بولنا معیوب ہے، پر گدھ سے بھی پوچھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔‘‘

فاسفورس کی بتی تین بار پٹاخی اور آواز آئی ۔۔۔۔’’کہہ گدھ راجہ کیا تجھے اعتراف ہے کہ تو دوسرے پرندوں کی طرح نہیں ہے ۔۔۔۔ تجھے دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں؟‘‘

راجہ گدھ اونچے درخت کی آخری ڈالی سے اترا اور سوکھے تال میں سب کر مخاطب کر کے بولا۔

’’ہاں آقا! چاندراتوں میں اونچے چھتنارے درختوں سے میں خود ہی گر پڑتا ہوں۔ پھر میری حالت اپنے بس کی نہیں رہتی میں اپنے ہم جنسوں کو اپنے ماحول کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہوں اور ایسی سمتوں میں نکل جاتا ہوں جو کبھی کہیں نہیں جاتیں۔‘‘

’’یو ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہے۔۔۔۔؟ کیونکہ کوئی پرندہ اس دیوانگی کا مرتکب نہیں۔‘‘

’’مان گیا مان گیا۔۔۔۔‘‘چیلوں کے گروہ سے آواز آئی۔

’’جس وقت لومڑ دیوانگی کے آزار سے مغلوب ہو کر روتے ہیں، ہم آپے میں نہیں رہتے آقا۔۔۔۔ ہم خود نہیں جانتے کہ یہ دیوانگی کیوں ہے۔ ہم گناہگار ضرور ہیں لیکن کیوں ہیں، اس کا بھید ہم پر آج تک نہیں کھلا۔۔۔۔ کوئی ہمیں بتا سکے تو ہم اس کا احسان ماننے کو۔۔۔۔ تیار ہیں۔‘‘

اس وقت نجد کی رہنے والی ایک بلبل بولی۔۔۔۔’’دوستو! میں ریگستان کی رہنے والی ہوں، میرے حلق میں حدی خوانوں کے نغمے ہیں اور میرے سینے پر انسان کے عشق کا لہو جم گیا ہے۔ میں صدیوں سے دیکھتی آئی ہوں اور تمہیں بتاتی ہوں کہ گدھ کی دیوانگی کا سراغ انسان کی پراگنگی میں ملے گا اور انسان کے پاگل پن کی وجہ ایک ایسی قوت میں پنہاں ہے جو اگر آگے نہ جائے تو ریزہ ریزہ کرنے لگتی

ہے۔"

جنگل میں الو سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ یکدم متوجہ ہوا۔۔۔۔ "کیسی قوت؟ میکینکل انرجی۔۔۔ اٹومک انرجی۔۔۔ الیکٹریکل انرجی۔۔۔۔ پوٹینشل کہ کائی نیٹک ساؤنڈ کہ لائٹ انرجی؟"

بلبل سرخ سینہ پھلا کر بولی۔۔۔ "ان سب قوتوں کا مرکب تیار ہوا تو انسان کی قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔"

سب حیرانی سے بلبل کا چہرہ تکنے لگے۔

"انسان اسی وقت کی بدولت دیوانہ ہوتا ہے۔۔۔ مان لو صاحبو جب قوت کو نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو پھر وہ اس باسن کو توڑ دیتی ہے جس میں اسے جمع کیا جاتا ہے۔
"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟۔۔۔۔ کیسے کیسے؟"

"میں نجد کی رہنے والی ہوں میرا شیخ جب تجارت کی غرض سے دوسرے ملکوں کا سفر کرتا ہے تو مجھے سونے کے پنجرے میں ساتھ رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے بنارس کے ایک سنیاسی نے بتایا تھا کہ انسان کے دیوانہ پن کی اصل وجہ کیا ہے؟"

"بول۔۔۔ بتا۔۔۔ سربستہ راز کھول۔۔۔۔"

"انسان کی ساری قوت اس کی جنسی طاقت میں پوشیدہ ہے، وہ جانوروں اور پرندوں کی طرح محض نسل بڑھانے کو اپنی جنس استعمال نہیں کرتا، بلکہ طاقت کے اس مشکی گھوڑے کو اپنی رانوں میں دبا کر رکھتا ہے۔ پھر یہی برق رفتار اسے دنیا اور دین کی مسافتیں بے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس گھوڑے پر انسان کے زانو سختی سے کسے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے۔ ڈھیلا بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا ہے اور پاگل کہلاتا ہے۔ دنیا کا عرفان ہو تو شاعری، مصوری، موسیقی، آرٹ جنم لیتا ہے۔ دنیا درکار نہ ہو قوت تیز ہو تو عرفان کی حدیں چھو لیتا ہے اگر یہ قوت مقبض ہو جائے تو خودکشی کرتا

ہے۔۔۔۔عشق لاحاصل ہو جائے اور گھوڑا سوار کو گھسیٹے تو انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے پتھر مارتے ہیں، زنجیروں سے باندھتے ہیں۔۔۔۔دیوانگی کی اصل وجہ یہی عشق لاحاصل ہے آقا۔"

فاسفورس کی بتی تین بار بجھی اور آواز آئی۔۔۔۔"لیکن انسان کی دیوانگی سے گدھ جاتی کا تعلق؟"

"علم ہمیشہ معلوم سے نامعلوم کی طرف لے جاتا ہے۔۔۔۔کیا ہم انسان کی دیوانگی سے یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ کہیں راجہ گدھ بھی ایسی ہی قوت رکھتا ہو۔؟"

"عشق لاحاصل کی قوت؟۔۔۔۔"سرخاب نے سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔۔اس کو کسی طرح وہی طاقت حاصل ہو گئی ہے"بلبل بولی۔

"اللہ کے دیئے ہوئے رزق کی قسم! سچ سچ بتا۔۔۔۔کیا تو اس طاقت سے مزین ہے؟"

راجہ گدھ نے سراسیمگی کے عالم میں پھڑ پھڑائے اور بولا۔۔۔۔"آقا! مجھے مہلت دے میں اپنے بھید سے خود آگاہ نہیں ن ہوسکتا ہے کہ یہی وجہ ہو لیکن اگر تع مجھے کچھ وقت عنایت کرے تو میں اپنی برادری والوں سے مشورہ کروں اور پھر ساری کیفیت عرض کروں۔"

سیمرغ نے فاسفورس کی لالٹین بجھا دی زور سے بادل گرجا، یکبارگی بجلی یوں کڑکی کہ تمام پرندوں کی نگاہوں میں جنگل سفید ہو گیا۔پھر اگلی میٹنگ تک کانفرنس ختم ہوگئی۔۔۔۔پرندے ہولے ہولے ٹکڑیوں میں اڑنے لگے اور کچھ دیر کے بعد جنگل صرف سانپوں کی سائیں سائیں فیڈ بیک کرنے لگا۔

کلاس میں پہلے پندرہ لڑکے داخل ہوئے۔

لیکن رفتہ رفتہ بور جھڑنے لگا۔کسی کو کورس مشکل لگا۔کوئی ماحول سے مطابقت نہ

پیدا کر سکا۔ کسی ایک کو لڑکیوں کی صحبت خائف کر گئی۔ ایک آدھ اس لیے چلا گیا کہ پڑھائی کے علاوہ کسی دوسری فیلڈ میں کمائی کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ لڑکیاں ہمیشہ کی طرح ڈٹی رہیں عورت میں ڈٹے رہنے کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ بہت جلد کلاس میں ہم صرف پانچ لڑکے رہ گئے پانچ لڑکیاں اور پانچ لڑکے اور اتنی متناسب تعداد کے باوجود سیمی شاہ اور آفتاب کے علاوہ ہم میں جوڑا جوڑا بننے کی صلاحیت نہ تھی۔

سالانہ سپورٹس کے دن سارے کالج میں ہر زبان پر سیمی اور آفتاب کا سکینڈل تھا اتنی جلدی اس قدر دیدہ دلیری اور اپنائیت سے کوئی طالب علم کسی لڑکی کی طرف بڑھنے کی جرائت نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ دونوں غالباً اس سکینڈل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، سیمی اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے مکمل طور پر کٹی ہوئی تھی۔ طیبہ اور فرزانہ تو خیر مڈل کلاس کی لڑکیاں تھیں ان کی انگلیاں تو شروع دن سے منہ میں تھیں۔ لیکن کوثر جو خود گلبرگ کی پیداوار تھی۔ وہ بھی اپنی تمام تر جدیدیت کے باوجود ابرو اٹھانے اور کندھوں پر عیسائی لڑکیوں کی طرح کراس کا نشان بنائے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ انجیلا البتہ سارے سکینڈل سے بچ کر چلا کرتی۔ ہر بات سے بچنے بچنے کی وجہ سے اس کا چہرہ ہمیشہ خوفزدہ رہتا۔

جوں جوں ان دونوں میں فاصلے کم ہوتے گئے اتنا ہی بلاوجہ۔۔۔۔ بغیر سوچے سمجھے اور اپنی بہتری کے خلاف میں سیمی کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔ دل بھی عجیب چیز ہے جب ماننا نہ چاہے تو لاکھ ثبوت کرو، ہزار دلائل ہوں کچھ نہیں مانتا۔ آفتاب اور سیمی ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے ان کے نوٹ سانجھے تھے۔ کتابیں ایک تھیں، وہ ایک پن سے باری باری لکھتے تھے۔ موٹر سائیکل پر میں نے انہیں آتے جاتے کئی بار دیکھا کیفے ٹیریا پر وہ ایک گلاس میں دو سٹرا ڈال کر مشروب پیتے۔ کالج میں تمام ایک کی خیریت دوسرے سے پوچھتے۔ اس کے باوجود مجھے شبہ تک نہ تھا کہ سیمی آفتاب سے محبت

کرتی ہے۔۔۔۔کیونکہ میرا دل اس بات کی گواہی دیتا رہتا تھا کہ یہ سب چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔۔۔۔انسان لاحاصل کے پیچھے کر کتنی لذت حاصل کرتا ہے۔

سالانہ سپورٹرڈے پر سارا کالج نصف دائرے والے لان میں جمع تھا۔زیادہ تر نظریں آفتاب اور سیمی پر تھیں۔جو کرسیاں کم ہونے کی وجہ سے ایک ہی کرسی پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔پھر لڑکیوں کی چاٹی ریس اناؤنس ہوئی۔سپورٹس کلب والے ہماری سوشیالوجی کی لڑکیوں کو منا کر گراؤنڈ میں لے گئے اس ریس کے دوران کوثر اور سیمی نے جینز پہن رکھی تھی اور طیبہ اور فرزانہ کھلے پائنچوں کی شلوار میں چاٹیاں سر پر اٹھائے بھاگ رہی تھیں۔کالج کے کئی حلال زادے بازوں اٹھائے بے پردگی بھاگتی ان ہرنیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں حرامزادے ہو گئے تھے۔

ایسوں ہی میں سے ایک میں بھی تھا۔

فرزانہ کی چاٹی ٹوٹ کر پاش پاش ہوئی سیمی نے کئی فاؤل کیے۔طیبہ بھاگی تو جی داری سے لیکن کوثر سے پیچھے رہ گئی۔بالآخر چاٹی ریس میں کوثر سے سیمی ہار گئی اس کے بعد آفتاب اور سیمی چند لمحے ٹھہرے اور پھر دونوں ادول چھوڑ کر خدا جانے کہاں چلے گئے۔

اس روز پہلی بار میرے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ شاید سیمی اور آفتاب دور نکل گئے ہوں۔

یہ شبہ میرے دل میں کوثر نے ڈالا۔وہ چاٹی ریس میں فسٹ آئی تھی۔اس کا چہرہ تمتمایا ہوا اور گردن پر پسینے کے قطرے تھے۔سیمی کی غیر موجودگی میں وہ بہت سمارٹ،شائستہ اور قابل قبول لڑکی لگتی تھی۔کرسیوں کی کمی تھی۔ اس کی واپسی پر میں نے اپنی کرسی اسے پیش کر دی اور سامیانے کے کھمبے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''چلی گئی۔۔۔۔؟''

''کون؟۔۔۔۔''میں نے پوچھا۔

''ہاں جی چلی گئی۔۔۔'' پچھلی قطار سے امجد نے جواب دیا۔

اس وقت ساری کلاس جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''اور وہ بھی ساتھ گیا اس کا چمچہ۔۔۔'' کوثر بولی۔

''گیا۔۔۔'' جمال نے جواب دیا۔

اپنے کٹے ہوئے بال دونوں ہاتھوں یں اٹھا کر اس نے پسینہ آلود گردن سے اوپر کیے۔

''Competition تو ذرا برداشت نہیں کرتی۔ کیسے بھاگی ہار کے۔'' طیبہ اور فرزانہ دوپٹوں سے منہ پونچھتی ہوئی ہنسنے لگیں۔ انجیلا البتہ اپنے ناخنوں کو دیکھتی رہی۔۔۔وہ ازل کی بے چاری تھی۔

''ابھی تو چاٹہ ریس ہاری ہے۔۔۔جب آفتاب ریس ہارے گا تو پتہ نہیں کیا حشر ہو گا اس کا۔''

کوثر کی زبان پر عورت کا ازلی حسد تھا غصے کی وجہ سے مجھے اس کی شکل بھی کچھ کچھ ٹیڑھی لگ رہی تھی۔ پھر سپورٹس کلب کا ایک جوان ان تین لڑکیوں کے لیے کوکا کولا لے کر آ گیا۔ فرزانہ اور طیبہ تو شاید ''عصمت بچاؤ'' قسم کی لڑکیاں تھیں انہوں نے کوکا کولا پینے سے انکار کر دیا۔ لیکن کوثر نے بوتل شکریے کے ساتھ وصول کی نواڑی رنگین کرسی پر بیٹھی اور کوکا کولا پیتے ہوئے سیمی کے کردار، آفتاب کی کمزوری کلاس کی بدنامی پروفیسروں کی بے بسی پر بڑی لمبی چوڑی گفتگو کا آغاز کیا۔ کوثر تعارفی تقریب والے دن سے زخم خوردہ تھی۔ گو اس کا مبلغ علم سیمی سے کم تھا۔ لیکن وہ گلبرگ کے میں بولے وارڈ سے آتی تھی۔ جہاں شہر کے امیر الامرا رہتے ہیں۔ سیمی کے متعلق سن رکھا تھا کہ اس کے ابا کا گھر گلبرگ کی ایکسٹینشن نمبر تین میں تھا۔ اور وہ ماں باپ کے پاس رہنے کے بجائے کسی ہوسٹل میں مقیم تھی۔

''ایسی لڑکیاں پڑھنے تھوڑی آتی ہیں۔ اگر اس لیے ہے کہ آزادی ہو۔۔۔اور

کیا۔"

بڑی دیر تک طیبہ اور فرزانہ کانوں کو ہاتھ لگاتی رہیں۔

دراصل ساری بات ڈگری کی ہوتی ہے برقعے والیاں، بے نقاب لمبی چوٹی والی کو آزاد خیال سمجھتی ہیں۔لمبی چوٹی والی کٹے بالوں والی کو بے حیا جانتی ہے۔بال کٹی کا خیال ہوتا ہے کہ اس کے تو صرف بال ہی کٹے ہیں اصل حرافہ تو وہ ہے جو دن کے وقت ماسکارا بھی لگاتی ہے اور آئی شیڈو بھی آئی شیڈو والی کو یقین ہوتا ہے کہ وہ بے چاری تو اللہ میاں کی گائے ہے۔اصل میں تو وہ اچھا چھکا ہے جو دوپٹہ نہیں اوڑھتی See through کپڑے پہنتی ہے اور سب کے سامنے سگریٹ پینے سے نہیں چوکتی سگریٹ نوشی بی بی کے سامنے وہ فساد ہوتی ہے جو نامحرموں کے ساتھ بیٹھ کر بلیو فلم دیکھتی ہے۔۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح مردوں میں بھی نیکی کی تعلّی موجود ہوتی ہے اور اس کی کئی ڈگریاں مقرر ہوتی ہیں جو شخص صرف نظر باز ہے اور اچٹتی نظر سے لڑکیوں کو آنکتا ہے وہ ان مردوں کو بدمعاش سمجھتا ہے جو لڑکیوں کی محفل میں راجہ امزر بن کر بیٹھتے ہیں اور لطیفوں اور کہانیوں سے فضا کو غزل الغزلات کی طرح رومانٹک کر دیتے ہیں عورتوں سے باتیں کرنے کے رسیا ان مردوں کو غنڈہ سمجھتے ہیں جو اندھیرے سویرے کواڑ کے پیچھے سیڑھیوں کے اندھیرے میں غلسخانے کی سنک کے پاس چوری چھپے کسی لڑکی کو بازوؤں میں لے لیتے ہیں۔چوری چھپے ملے اڑانے والاء ان حضرات کو عادی مجرم سمجھتے ہیں جو کھلے بندوں عورتوں کو کاروں میں بٹھاتے اور ہوٹل کے کمرے بک کراتے ہیں کھلے عاشق ان پر آوازے کستے ہیں جو زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور زنا کاران پر نکتہ چینی کر کے بے قیاس راحت محسوس کرتے ہیں جو زنا بالجبر کرتے ہیں اور قانون کی گرفت میں ملزم ٹھہرائے جاتے ہیں

یہ ساری باتیں آپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے لیے کی جاتی ہیں اور سن میں

تمام لوگ سوسائٹی سے اپنے لیے Approval کا ایک جائز طریقہ تلاش کرتے ہیں ورنہ بات ساری ڈگری کی ہے۔۔۔کسی کو ہلکا بخار ہوتا ہے۔۔۔کسی کو زیادہ۔۔۔کسی معاشرے میں شرافت کا درجہ نارمل متعین کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔

''ہوا کیا ہے۔۔۔'' آخر کو جمال نے سوال کیا۔

''ہوا کیا نہیں۔۔۔تم کسی فسٹ ائیر لڑکے سے پوچھ لو۔۔۔سٹاف روم میں جا کر کسی کیمسٹری کے پروفیسر، حساب اردو کے پروفیسر سے پوچھ لو۔۔۔سیمی بیگم کو عشق ہو گیا ہے آفتاب سے۔۔۔کوثر بولی''

ٹھن سے کسی نے میرے سر پر لوہے کی ہتھوڑی ماری۔

پہلی بار مجھے خیال آیا کہ شاید سیمی مجھ سے محبت نہ کر سکے۔

سب سے پہلے مجھے سیمی کے اظہار اشتہار متاثر کیا۔۔۔وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھی یا کھانا چاہتی تھی۔

ہر عہد میں ہر معاشرے میں مختلف عمر کی عورتیں اپنی اشتہار کی نمائش کرتی رہی در پردہ ہو جاتی ہے۔وہ نہ صرف عام محفلوں میں چڑی چوگا کھانے لگتی ہیں بلکہ اشتہار کے اظہار سے بھی انہیں نفرت ہو جاتی ہے کیونکہ ایک بھوک سے ہمیشہ دوسری بھوک کا سراغ چلتا ہے۔پچھلی صدی میں بھوک کی نمایش جنسی آمادگی کے مترادف تھی۔میلے ٹھیلوں پر یاروں سے لڈو جلیبیاں لے کر کھانے والی بنتو مردوں میں تو مقبول تھی لیکن اپنی ہم جنسوں میں وہ بڑی بدنام تھی اور سسرال جا کر بسنا اس کے لیے مشکل تھا۔

لیکن اس دور کی ماڈرن لڑکی نے کھانے کے آداب ہوٹلوں سے سیکھے ہیں۔۔۔

۔۔ڈائننگ ٹیبل کی میز سے اخز کیے ہیں۔ہوائی جہازوں کے سفر میں جہاں اپنے اپنے ٹرے لگے لگائے آتے ہیں اور جہاں آپ کے ٹرے میں دوسروں کی شراکت

ممکن نہیں ان ہوٹلوں ہوائی سفروں نے لڑکیوں کا نہ صرف چھچ کانٹا علیحدہ کر دیا ہے بلکہ ان کی بھوک کو فرداً فرداً بڑی اہمیت دے دی ہے۔ اب بیف برگر چبانے والی دوہرے سٹرو سے کوک پینے والی زبان کے چٹخارے سے کون چاٹنے والی لڑکی نذیدی نہیں دلاویز ہے اتنے سارے ٹیلی ویژن کے اشتہاروں میں ماڈلز کو چائے پیتے، چیونگ گم چباتے بسکٹ کھاتے دیکھنے کے بعد کھاتی پیتی لڑکی مرد کا آئیڈیل بن گئی ہے۔

ویسے بھی مرد کا عورت کی بھوک سے ڈھکا چھپا لیکن بڑا پرانا رشتہ ہے جب کبھی کوئی مرد کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے اس عورت کی بھوک مٹانے کا چسکہ پڑ جاتا ہے پھر وہ اس کی جذباتی بھوک مٹانے کے لیے اس کا سہارا بنتا ہے، ذہنی خلا جو بھوک ہی کی شکل ہے ختم کرنے کو اس سے باتیں کرتا ہے اس کی جذباتی بھوک کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے جسمانی بھوک بچوں کا باعث بنتی ہے اور پھر ان ہی چھوٹی چھوٹی اشتہائیں ختم کرنے میں اس کی زندگی صرف ہو جاتی ہے۔

پرانے زمانے میں بھی شوہر اپنی ماؤں سے چھپ کر اپنی نوبیاہتا بیویوں کی ذہنی جذباتی جسمانی بھوک مٹانے اوپر والی منزل میں جاتے تو ان کے ہاتھ میں قلاقند کے دونے اور مولسری کے ہار ہوتے۔۔۔ آج بھی جب ملاقات ہوتی ہے تو کوک پلانے کو ان کھلانے والا اسے اپنی نیک نصیبی سمجھتا ہے۔

ماڈرن لڑکی یہ بھید سمجھ گئی ہے کہ بھوک کا دکھلاوا مرد تک یہ پیغام پہنچاتا ہے کہ اگر وہ کھانے پینے میں سرگرم ہے تو جنسی بھوک میں بھی مرد سے کم نہ ہو گی۔۔۔ وہ ایک سمبل سے اپنے تمام کوائف سمجھا دیتی ہے اپنی بھوک کو نمایاں کرتے ہی آج کی لڑکی مرد کی بھوک میں برابر کی شریک ہونے کا وعدہ کرتی ہے۔

طیبہ کوثر اور فرزانہ سے میں خوبصورت تو نہ تھی۔ لیکن وہ لباس میں، نشست و برخاست گفتگو کھانے پینے میں سب سے آگے تھی۔ جب کبھی وہ کلاس میں داخل

ہوتی اس کے منہ میں چیونگ گم ہوتی جونہی پروفیسر کلاس سے جاتا وہ اپنے کینوس کے تھیلے میں سے سیب نکالتی اور اسے آستین پر صاف کر کے کھانے لگتی۔۔۔سیب کھانے کا بھی اس کا عجیب طریقہ تھا وہ سیب میں تیکھے دانت اتارتی اور کڑک کی آواز کے ساتھ منہ پرے کر لیتی۔ایک ہی ہفتے کے اندر اس کا سیب ساری کلاس میں گھومنے لگا تھا

''ایک Bite لے لو۔۔۔'' ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔

میں ایک ایسے گھر سے سوشیالوجی کی کلاس میں گیا تھا جہاں جھوٹے برتنوں میں کھانا گناہ ہوتا ہے۔

''اس طرف سے کھا لو۔۔۔میں نے یہاں نہیں کھایا۔''

اس نے سیب کی صاف ستھری طرف پیش کر دی۔ میں نے سیب اس سے لیا اور عیب وہاں دانت گاڑ دیئے جہاں سے اس نے کڑاک سیب کاٹا تھا۔

بھوک کے معاملے میں وہ بہت بودی تھی۔وہ گھنٹے گھنٹے کے بعد بھوکی ہو جاتی۔ یا یوں سمجھیے، یہ اس کا لاڈ تھا۔۔۔بہت جلد ہماری کلاس ایک خاندان کا روپ اختیار کر گئی۔اسی لیے سیمی کی باتیں کسی کو عجیب نہ لگتی تھیں۔

''بھئی میرے پاس پچھتر پیسے ہیں۔۔۔لیکن مجھے کوک پینا ہے۔۔۔ہے کوئی اللہ کا بندہ۔۔۔؟''

اللہ کا بندہ آفتاب ہمیشہ اس کی ساتھ والی سیٹ پر ہوتا۔

اچھا بھئی اور کون کون کوک پینے جائے گا؟

ادھر پورے سبھی تیار ہو جاتے۔

پھر سب اپنی اپنی نقدی اس کے ڈسک پر دھرتے جاتے۔وہ حساب لگاتی جب رقم پوری ہو جاتی تو ہم سب کوک پینے چلے جاتے کینٹین پر بھی عجب تماشا رہا کوئی سیون اپ منگواتا کوئی فانٹا منگواتا کوئی کوک۔۔۔اب سیمی کسی سے مانگ کر

گھونٹ پیتی کبھی اپنی بوتل پیش کر کے کہتی ۔

"پی لو طیبہ ۔۔۔ تم نے تو فانٹا منگوایا ہے ۔۔۔ سیون اپ کا بھی ایک سپ لے لو بھئی ۔۔۔۔"

جب طیبہ ہچکچاتی تو وہ اپنے کینوس کے تھیلے میں سے ٹشو پیپر نکال کر بوتل کا منہ صاف کرتی اور کہتی ۔

"خدا قسم اب تو کوئی ہرج نہیں ہے ۔"

شروع شروع میں سیمی ایسی Sporty لڑکی نظر آئی کہ کلاس والوں کو شبہ تک نہ ہوا کہ وہ آفتاب کی ہپ پاکٹ میں ہے ۔ ان دنوں میں ہر روز اس میں کوئی نئی بات کوئی نئی ادا اور کوئی نئی دریافت کرنے کی سٹیج میں تھا ۔ میری یہ سٹیج تحیر کی تھی جو کچھ مجھے نظر آتا میں اسے پوری طور پر ہضم بھی نہ کر پاتا کہ دوسرے دن اس میں کچھ اور نیا ، کچھ اور دلچسپ اور حیران کن نظر آ جاتا ۔۔۔ سب سے بڑی تبدیلی جو آفتاب سے ملنے کے بعد اس میں آئی اردو کی سوجھ بوجھ تھی ۔ اب وہ ایسی اردو بولنے لگی تھی کہ بڑے بڑے اردو باز اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے ۔

سوشیالوجی کی کلاس میں وہ سب سے باتونی لڑکی تھی پروفیسر کے نظریات سے ٹکر لینا اور چھوٹے سے لطیفے پر دیر تک ہنستے رہنا اس کا محبوب مشغلہ تھا دراصل اس میں وہ خوش اعتمادی کا خمیر تھا جس سے اس کی شخصیت کی تمام دلآویزی میں پھول لگے تھے ۔

بھوک کی نمائش کے بعد سیمی میں بڑی جنسی کشش تھی وہ عموماً گردن پیچھے کر کے غر غر کرنے کے انداز میں منہ کھول کر پاٹ دار آواز میں ہنستی ایسے میں اس کے کندھے بازو پیٹ چھاتیاں سب ہلکورے لینے لگتے ۔ اس کا قہقہہ عام طور پر مصنوعی ہوتا لیکن اس قدر بناوٹی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عجیب سی کشش تھی ۔ لپ سٹک ، بریزئر اور سینٹوں کے اشتہاروں کی طرح کوئی چیز آپ کو یقین دلاتی تھی کہ قہقہہ محض

اشتہار ہے اصل سیمی اس اشتہار سے بھی اچھی ہوگی۔

بلند بانگ تھا ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ بدقسمتی سے اس روز وہ میرے بہت قریب بیٹھی تھی حالانکہ اس کا بازو آفتاب کی کاپی پر تھا۔لیکن اس قربت نے مجھ پر ایسے اثر کیا کہ یکدم ہنستے ہنستے میں اسے دیکھنے لگا اور پھر ہنس نہ سکا۔

کچھ لمحے بڑے فیصلہ کن ہوتے ہیں اس وقت یہ طے ہوتا ہے کہ کون شخص کس کا سیارہ بنایا جائے گا جس طرح کسی خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر ٹھوس مائع اور مائع گیس میں بدل جاتا ہے اسی طرح کوئی خاص گھڑی بڑی نتیجہ خیز ہوتی ہے اس وقت ایک قلب میں طلوع ہوتا ہے وہی دوسرے آئینے میں منعکس ہو جاتا ہے دوسرے قلب کی اپنی زندگی ساکت ہو جاتی ہے اس کے بعد اس میں صرف بازگشت کی آواز آتی ہے جس وقت میں سیمی کے عشق میں مبتلا ہوا مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ آفتاب کی محبت میں اس قدر دور نکل چکی ہے ۔۔۔ دراصل سیمی جیسی لڑکیوں پر محبت کرنے کا کبھی شک بھی گزر نہیں سکتا۔ وہ لجاتی شرماتی تو ہیں نہیں کہ آدمی اندازے لگا سکے ہم پانچوں طالب علموں کے ساتھ اس کی خوب بجشا رہتی تھی۔

فرزانہ اور طیبہ متوسط گھرانے کی لڑکیاں تھیں س لیے ان میں جراءت کی کمی بھی تھی اور سچائی کی بھی ۔۔۔ کوثر درمیان میں تھی ۔۔۔ کبھی ہو کر مذاق کر لیتی بھڑکتا سرخ ۔۔۔ بھلا اس پر میں کیسے شبہ کرتا کہ اندر ہی اندر وہ جل بجھا ہے۔

حسن اتفاق دیکھئے کہ افتاب اور میں روم میٹ تھے۔ ہوسٹل کے ہم کمرہ دوست بھی ہوتے ہیں اور حریف بھی ان کا سب سامان سانجھا بھی ہوتا ہے اور اس شراکت کے باعث ان میں جھگڑے بھی رہتے ہیں ہم کمرہ کے سیفٹی سے بلیڈ چرانا، اس کے صاف تولیے سے گندہ پسینہ پونچھنا' پیسے ادھار لے کر نہ لوٹانا' اس کی حاضری میں سے کھانا' بغیر اجازت کے ٹائی لے کر استعمال کرنا اور ڈرائی کلین کرائے بغیر لوٹانا۔

اپنے سلیپر خشک اور روم میٹ کے سلیپر غسل کے بعد گیلے کرنا' تیل لگانے کے بعد ہم کمرہ کے صاف تکیے کو دوہرا کر کے گردن تلے فٹ کرنا' نئی جرابیں مانگنا' گندے رومال بخوشی آفر کرنا' مجموعی طور پر لڑکیوں کو زیر بحث لانا اور اصلی لڑکی کے ذکر کو گول کر جانا۔۔۔ یہ سب باتیں ایک ہی کیوبکل میں رہنے والوں میں چلتی رہتی ہیں لیکن آفتاب اور میں پورا ففتھ ایئر اور سکستھ ایئر کے چھ ماہ ساتھ رہے۔۔۔ ہمارے پلنگ' ٹرنگ اور میز تو ساتھ ساتھ تھے۔

لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے مکمل طور پر اجنبی ہی رہے۔

نہ صرف ہماری عادتیں مختلف تھیں بلکہ ہم مختلف ماحول کی پیداوار بھی تھے۔

اگر میں گھاس تھا تو آفتاب پھول تھا۔ گورا چٹا کشمیری جس کی شربتی آنکھیں براؤن بال اور بڑی چوڑی چکلی کاٹھی تھی۔ اس میں قد سے لے کر رنگ تک باتوں سے لے کر خاموشی تک عادتوں سے لے کر جبلی سرشت تک وہ سب کچھ تھا جس سے لڑکیاں پیار کرتی ہیں۔ وہ شکلاً اتنا معصوم اور بھولا تھا کہ اسے دیکھ کر ہر لڑکی میں ایک ماں بیدار ہو جاتی۔ لڑکیوں کے سامنے اس بلا کا خاموش رہتا کہ سب کا جی محبوبہ کی طرح اسے گدگدانے کو چاہتا۔ ذرا سی طبیعت کے خلاف بات ہو جاتی تو اس کی شکل مجروح ہو جاتی' شربتی آنکھیں نمناک نظر آتیں۔ اب باتوں کے پھاہے لے کر سب لڑکیاں نرس بننے پر آمادہ ہو جاتیں۔ آفتاب قالین فروشوں امیروں کا ایسا لاڈلا بیٹا تھا جس کی گھٹی میں پریم رچنا تھی۔ وہ اس قدر سیر چشم سیر دل آدمی تھا کہ نہ اسے دولت کی بھوک تھی نہ محبت کی نہ وہ شہرت کی تلاش میں تھا نہ ترقی کی۔۔۔ وہ ان تمام نعمتوں میں ہر وقت رہتا تھا۔ مچھلی جیسے جل میں رہتی ہے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ سوج کی طرح ضروری اور سورج کی ہی طرح غیر اہم تھا۔ اس نے کبھی کسی کلاس میں کسی پروفیسر سے بحث نہیں کی۔ بس نما نما مسکراتا رہتا۔ ہم سب میں جب سیاسی بحثیں ہوتیں اور ہم نوائے وقت' امروز' مساوات' جنگ' مشرق سے ہو کر

نیوز ویک اور ٹائم ویک اور ٹائم تک پہنچتے۔تب بھی وہ خاموش رہتا۔ وہ کسی کو مرعوب کرنے کے لیے یا خود کسی سے مرعوب ہونے کے لیے خواہ مخواہ کوئی پنگا نہیں لیتا۔جب کبھی وہ بات کرتا تو اس کی بات میں وزن ہوتا۔۔۔۔نمبر ایک۔۔۔۔نمبر دو۔۔۔۔نمبر تین۔۔۔۔وہ نہ کبھی لڑکیوں کو لفٹ دیتا نہ متاثر کرنے کی کوشش کرتا۔ صرف اس سے عادتاً اور سرشتاً ایسی حرکتیں ہوتی رہتی تھیں جن سے لڑکیاں پیار کرتی ہیں۔اگر ماڈرن لڑکیاں بھوک کی نمائش کر کے اندر کی بھوک کا ثبوت دیتی تھیں تو آفتاب کے پاس ہمیشہ اتنے پیسے رہتے تھے جس سے وہ ظاہری بھوک کو شانت کر دیتا اور کچھ اس لا پروائی سے کہ لڑکی سمجھ جاتی ایسے ہی بغیر مشکور کیے' بغیر شرمندہ کیے خاموشی اور رضا سے وہ اس کی دوسری اشتہا مٹانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

لڑکیوں کے ٹاپک پر وہ گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔لیکن صرف امجد کے ساتھ' روم میٹ ہونے کے باوجود اس نے کبھی کسی لڑکی کو میرے ساتھ موضوع سخن نہیں بنایا۔ مجھے یاد ہے شروع ایم اے کے دن تھے میرا خیال تھا کہ آفتاب اپنے تجاہل عارفانہ سے مجھے ٹٹول رہا ہے میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

آج طیبہ تمہارے متعلق پوچھ رہی تھی۔"

"کون سی طیبہ۔"

وہی جس کی ناک پر تل ہے"

"اچھا وہ"

"شاید اسے تم میں دل چسپی پیدا ہو گئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔۔۔۔لیکن بڑی بے وقوفی ہے۔۔۔۔اس نے جرابیں اتارتے ہوئے کہا۔

"تھوڑے وقفے کے بعد جو ملیں ان میں دل چسپی نہیں لینی چاہیے۔"

"یہ کوئی اختیاری بات تھوڑی ہے۔۔۔۔" میں نے کہا۔

''ہاں ۔۔۔اختیاری بات تو نہیں ہے۔''

اس کا رویہ نہ جارحانہ تھا نہ مدافعانہ ۔۔۔بس وہ بات کو آگے بڑھانا نہین چاہتا تھا۔

''پوچھتی تھی کہ کیا آفتاب کے ابا جی دوکان ہے مال پر ۔۔۔قالینوں کی ۔۔۔''

بتا دینا تھا ابا جی کی دوکان ہے ۔۔۔آفتاب کی نہیں ۔۔۔اس نے ابرو سکوڑ کر کہا۔

اب وہ پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔میں بات کو بڑھانا چاہتا تھا کہ لیکن اس کی خاموشی نے میرا منہ بند کر دیا۔

فقتھ ایر میں مجھے شبہ تھا کہ وہ نرگسیت کا شکار ہے۔ لیکن بعد میں مجھ پر کھلا کہ غالباً آفتاب کو اپنے آپ سے پیار نہیں تھا۔بس اسے زندہ رہنے کی عادت تھی پرندوں کی طرح۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ کسی کے پاس کوئی خاص معقول وجہ بھی نہیں ہے کہ وہ کیوں زندہ نہ رہے۔اگر کسی کے پاس ایسی وجہ ہوتی اور وہ آفتاب کو بتا دیتا تو یقیناً آفتاب اپنی زندگی ختم بھی کر دیتا شروع شروع میں ھ سیمی اس کے ساتن نتھی ہوئی اور ہو دونوں اکھٹے رہنے لگے تو مجھے آفتاب سے شدید نفرت ہو گئی بلکہ میری یہی کوشش رہتی تھی کہ جونہی وہ کمرے میں آئے میں باہر نکل جاؤں لیکن اتنا پاس رہنے کے باوجود یہ اس کی سادگی تھی جس نے اسے یہ اندازہ ہی نہ لگانے دیا کہ میری جذبات کیاں ہیں؟ آفتاب کو میں نے کسی دن خود آگاہی میں مبتلا نہیں ریکھا اگر اسے اپنی ذات کی سمجھ ہوتی تو شاید وہ مجھ تک پہنچ سکتا۔عام طور پر ہماری کلاس کے لڑکے لڑکیاں سی خود آگاہی کے احساس سے کئی حرکتیں کرتے تھے،لیکن اس کا الٹا یہ سیدھا ایک تھا اسی لیے وہ کھاتے وقت باتیں کرتے ہوئے چلتے وقت بیٹھتے سمے سوتے ہوئے کبھی اپنی زندگی کی گڑکی میں گرفتار نظر نہیں آیا۔

اس روز جب امجد کی نہ بانی بھید کھلا کہ سیمی اور آفتاب کا قصہ دور نکل چکا ہے۔تو

کوثر کی بات پر مہر لگ گئی۔ میں پروفیسر سہیل سے مل کر آرہا تھا سٹاف روم سے باہر ہی مجھے امجد مل گیا۔ کلاس میں صرف امجد سے آفتاب کی بے تکلفی تھی۔

یار یہ لڑکیاں بہت میسنی ہیں عشق بھی فل سائز کرتی ہیں اور پڑھائی بھی فل ٹاس کرتی ہیں تم غافل نہ رہنا۔۔۔۔ ماریں گی ساری بدبختیں۔۔۔۔ پڑھتے تم رہے گے اور فسٹ یہ آئیں گی باجماعت۔۔۔۔

میں نے تکلفاً پوچھا۔۔۔۔ عشق کون کون کر رہا ہے؟۔

''سب کر رہی ہیں ایک ایک لیکن سب کا عشق گھٹیا درجے کا ہے سوائے سیمی کے۔''

''سیمی۔۔۔۔ سیمی بھی؟''

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

میں بھی چوری چوری پرائز بانڈ خرید چکا تھا اس وقت میرے کان یہ سننے کے بے قرار تھے کہ میرا انعام نکل آیا ہے۔

''ہم دونوں اودل کے سامنے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے بات کو مذاق میں اڑانا چاہا۔

''اچھا تو پھر کون کون عشق کر رہا ہے۔''

''طیبہ اور فرزانہ تو قابل اعتماد لڑکیاں نہیں ہے، یہ دو قدم آگے چلتی ہیں تو چار قدم پیچھے جاتی ہیں۔''

''کیوں؟''

''ان کا قصور نہیں ان کی فیملی بیک گراؤنڈ ایسی ہے مڈل کلاس کی لڑکی کو بدنامی کا بڑا ڈر ہوتا ہے۔۔۔۔ یہ عشق نہیں کرتیں شوہر تلاش کرتی ہیں۔''

''اور کرثر؟۔''

''کوثر؟ اس وقت میرے ساتھ فٹ جا رہی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ جب

سارے نوٹس فوٹوسٹیٹ کر کے میں اسے دے دوں گا تو پھر جمال کی طرف مائل ہو جائے گی۔"

"بکو مت۔۔۔۔"

امجد نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"احمق آدمی جمال کے ابا جی وائس چانسلر ہیں۔۔۔کوثر بے چاری کیریئر بنانا چاہتی ہے وہ اس فیکٹ کو بھلا سکتی ہے کبھی۔۔۔وہ کسی مرد کے انگوٹھے تلے زندگی بسر نہیں کرنا چاہتی۔"

میرے لبوں پر سیمی کا نام آنا چاہتا تھا، لیکن امجد ادھر ادھر کی باتوں کے چٹخارے لے رہا تھا میں سیمی کا نام کیسے لیتا۔

"ویسے یار یہ کوثر چوہی جیسی میرے دل کو بڑی لگی تھی پہلے پہل۔"

"اب کیا ہو گیا ہے۔۔۔" میں نے سوال کیا۔

"فائدہ۔۔۔ان کم بختوں کے پیچھے مرنے کا۔۔۔۔دفع ہو جائیں گی تو خط کا جواب بھی نہیں دیں گی، بچوں کو گود میں بٹھا کر توس مکھن کھلایا کریں گی اور ہماری باتیں اپنے شوہر کو سنا کر ہنسایا کریں گی۔"

میں نے پھر سیمی کے متعلق پوچھنا چاہا لیکن چپ رہا۔۔۔

"انجیلا کا فگر اچھا ہے اگر وہ کب ڈال کر نہ چلے۔۔۔ہے نا۔۔۔؟" امجد نے کہا

"شرماتی ہے۔۔۔" میں نے جوب دیا۔۔۔"لمبے قد کی لڑکیوں کو بیماری ہوتی ہے کب کی"

"شرماتی نہیں ذرا عام نارمل لڑکی سے بھاری ہے اس کا کومپلکس ہے اسے کن کی وجہ یہی ہے مانو نہ مانو۔۔۔"

میں نے ذہن میں انجیلا کے کومپلکس کو لانے کی کوشش کی لیکن مجھ پر سیمی کے

عشق کا ایسا خوف طاری تھا کہ مجھے انجیلا کا کچھ بھی یاد نہ آسکا۔

''کبھی تم نے دیکھا نہیں جب وہ کلاس میں آتی ہے تو ہمیشہ اپنی کتابیں سینے کے آگے رکھتی ہے۔کم بخت کی ایک ہی چیز اچھی ہے اور اسی کا اسے کومپلکس ہے۔''

''آج سپاٹ سینوں والی لڑکیوں فیشن میں ہیں گدھے۔۔۔جن کے کندھے کی ہڑی کالر کی ہڈی اور دو چار پسلیاں نظر آتی رہیں۔۔۔۔جیسے۔۔۔جیسے۔۔۔۔''میں چپ ہو گیا میں سیمی کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔

''مدقوق لڑکیاں Under nowrished''امجد نے سوال کیا۔

''ہاں تو اور کیا کھیتوں میں کام کرنے والی صحت مند لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔توبہ کرو،وہ تو پینڈو لگتی ہیں پینڈو۔''

''ہمیں تو اطالوی تصویروں کی لڑکیاں پسند ہیں ڈی ونچی اور رافیل کی لڑکیاں۔''

''وہ عورتیں تھیں۔۔۔۔عورتوں کا زمانہ گزر گیا۔''

''سیمی جیسی لڑکیاں؟۔۔۔''امجد نے بالآخر اس کا نام لیا۔

''بالکل ویسی۔۔۔۔جس کی ہنسلی کی ہڈی نظر آئے۔۔۔۔ہونٹوں کی نسیں ابھری ہوں گالوں کی ہڈی اوپر کو اٹھی ہوئی دکھائی دے۔''

''لعنت بھیجو۔۔۔میں تو ان کو اشتہاروں میں پسند نہیں کر سکتا،زندگی میں کیا پسند کروں گا''

''اس لیے کہ تم پینڈو ہو۔۔تمہاری بیک گراؤنڈ دیہاتی ہے۔۔۔۔بھائی کو بوٹی ہے پتہ نہیں اسے یہ مریل سیمی کیوں پسند ہے۔

امجد نے لمبا کش لگایا اور بولا۔۔۔۔اور آفتاب کون سا آکسفورڈ کا پڑھا ہوا ہے۔۔۔بھائی کی بوٹی۔۔۔پسند ہے۔''

یکدم آسمان سے بجلی گرجی اور میرے پرائش بانڈ پر غلط نمبر پرنٹ ہو گیا۔

''آفتاب کو۔۔۔؟''

''اچھا بننے کی کوشش مت کرو۔ تم اس کے روم میٹ ہو تم کو پتہ ہو گا۔''

''وہ مجھ سے ذرا بھی فری نہیں ہے۔''

''بابا ان کا عشق تو آخری مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب۔۔۔'' میں اپنے حسد کو چھپاتے ہوئے کہا۔۔۔''اتنی جلدی کیسے کیسے؟۔''

''یار آفتاب تو سیمی کو اپنی ماں سے بھی ملانے لے گیا تھا لیکن غالباً کشمیرن بڑھی نے پسند نہیں کیا سیمی کو۔۔۔ میں بھی اس کی جگہ ہوتا تو ناپسند کرتا۔''

میرا جی چاہتا تھا کہ کراٹے کا ایک ہاتھ اس کے جبڑے پر ماروں لیکن اس وقت امجد مجھ سے بے حد دوستی کا اظہار کر رہا تھا۔

''تم اس قدر غائب مت رہا کرو قیوم۔۔۔ کچھ کلاس والوں کے حالات پتہ ہونے چاہئیں۔ ایک روپیہ ہے؟۔''

میں نے جیب میں ہاتھ مارا۔

''یار یہ منی بس والے ذرا لحاظ نہیں کرتے۔ ساری بڑی بسیں دس پیسے لے کر سوار کر لیتی ہیں لیکن یہ روپیہ لیتے ہیں پورا ماڈل ٹاؤن کا۔۔۔ اس پاکستان کا کیا بنے گا۔''

وہ روپیہ لے کر چلا گیا۔ لیکن میں نہ پاکستان کے بارے میں سوچ سکا نہ بسوں کے متعلق۔۔۔

ن دنوں مجھ پر سیمی کے عشق کا دورہ پڑا ہوا تھا جب عشق اظہار سے ناواقف ہو تو اس میں اندر ہی اندر بہت زیادہ تخیر پیدا ہو جاتا ہے سیمی کی ہر بات کو غلط سمجھنا آسان تھا وہ ہر لڑکے کو دلچسپی اور تجسس سے دیکھنے کی عادی تھی جنس مخالف سے ایک خاص حد تک دوستی کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو گھر آئی صحبت کو سوغات کی طرح سمجھ کر تھینک یو کر کے رکھ لیتی ہیں مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھی

ایسے رویے سے معتوب وشق اس وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دونوں طرف برابر آگ لگی ہوئی ہے حالانکہ وہ صرف نائیس Nice ہو رہی ہوتی ہیں۔

ہم دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے لیکن میری فیملی بیک گراؤنڈ کچھ ایسی تھی کہ میں توازن خود کبھی اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کی جرائت کرسکا نہ ہی باتوں میں اپنی قلبی کیفیت بیان کرسکا میں اپنی جماعت کا فلاسفر تھا۔وہ بڑی بڑی دیر تک میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی رہتی۔۔۔لیکن یہ تمام گفتگو علمی نظریات پر بالکل غیر ذاتی ہوتی اسی لیے میرا معمول تھا کہ کالج جانے سے پہلے ایک خط تحریر کرتا اس میں اپنی تمام محبت کو کھلم کھلا ظاہر کرنے کی کوشش ہوتی۔کالج سے واپسی پر یہ خط پھاڑ دیتا۔اور اپنی ڈائری میں احتیاط سے وہ تمام باتیں رقم کرتا جو اس کے اور میرے درمیان ہوتی رہتی تھیں۔۔۔میں سیمی کے رویے سے کسی تشکیک کا شکار نہیں تھا میں تو الٹا اس نشاط کے سہارے زندہ تھا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے سیمی کا خاموش رویہ اس پر صادر ہے۔

امجد کے جانے کے بعد سمجھ نہ آرہی تھی کہ پچھلے تمام وقفے کو کس کھاتے میں ڈالو کرسمس کی چھٹیوں میں صرف چند دن تھے میں ان چھٹیوں سے ویسے ہی خوف زدہ تھا کہ اس خوف میں یوں اضافہ ہوا۔امجد کے جانے کے بعد سیمی آگئی۔ہم دونوں دیر تک کیفے ٹیریا میں بیٹھے رہے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔۔۔۔میں بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے چلے گئے اور کوئی بھی اندر کی بات نہ کرسکا امجد کی باتیں سن کر اب مجھے سمجھ آگئی کہ دراصل وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔جب ہم اٹھنے والے تھے تو وہ بولی

''میں پڑھائی چھوڑ دینا چاہتی ہوں قیوم۔''

''ہیں ہیں؟ یہ کیا عقل ہے؟''

''بس مجھے دلچسپی نہیں رہی''

''فائنل میں وقت کون سارہ گیا۔''

وہ آج ملک شیک کے ساتھ آلو کے چپس نہیں کھا رہی تھی حالانکہ یہ دونوں چیزیں وہ ہمیشہ اکھٹی انڈ ڈالتی تھی۔

''میں سوشیالوجی کے قابل نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔نہ سوشیالوجی یرے قابل ہے۔۔۔۔یہ ایک چھاٹا سبجکٹ ہے۔''

''اچھا منہ بند کرو۔''

''میں سوچتی ہوں اگر میں پنڈی چلی جاؤں تو؟''

''وہاں جا کر کیا کرو گی۔''

''صاف ستھرا شہر ہے۔۔۔۔وہاں کوئی Job مل جائے گی میں ہوسٹل لائف سے بور ہو گئی ہوں۔''

ہر ماڈرن لڑکی بہت جلد بور جاتی ہے اس لیے میں نے اس کی بات سنجیدگی سے نہ لیا۔

لیکن وہ سنجیدہ تر ہوتی گئی۔

''قوم۔۔۔۔میں تمھیں ایک بات بتاؤ۔۔۔۔جب کوئی آدمی ناکام ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنے آپ کو Analyze کرتے کرتے فلاسفر بن جاتا ہے۔۔۔۔میں بھی اپنے پرائے کا فرق بھول گئی ہوں کبھی کبھی لگتا ہے اگر میں ہوسٹل چھوڑ کر اپنے گھر جا کر کال بل بجاؤ تو گھر والے مجھے ایسے ملیں گے جیسے اپنے ہوں کبھی لگتا ہے اگر میں اپنے گھر کے برامدے میں جا کر کسی کو آواز دوں گی تو کوئی باہر نہیں نکلے گا۔۔۔۔سب میری شکل دیکھ کر لوٹ جائیں گے۔۔۔۔۔۔مجھے پہچان نہیں سکیں گے۔۔۔۔کیا میں جنسی طور پر Frustrated ہوں قیوم۔''

''کون کہتا ہے۔۔۔۔''میں نے محبت سے سوال کیا۔

''کوثر کہہ رہی تھی کہ میں بہت زیادہ Fustrated ہوں۔''

میں نے اسے پیار سے دیکھ کر کہا۔

''جب تمہارا گھر یہاں لاہور میں تو تم ہوسٹل میں کیوں رہتی ہو سیمی؟''

اس نے ملک شیک کی نلکی دو حصوں میں توڑ کر میز پر پھینکی پھر لمبی آہ بھری، اور بولی۔۔۔''وہ گھر میرا خرچ تو اٹھا سکتا ہے۔۔۔میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔''

''کیا مطلب؟''

''اوہو۔۔۔زیادہ سوال مت کیا کرو بڑے پینڈو لگتے ہو۔''

''میں کسی تجسس کے زیر اثر نہیں پوچھتا سیمی۔۔۔''میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''میں جانتی ہوں۔۔۔میں جانتی ہوں تمہارا دل بڑا ہمدرد ہے۔۔۔کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے تم میری زندگی میں بڑا اہم رول ادا کرو گے۔۔۔پتہ نہیں کیوں مجھے Feelings ہیں اس قسم کی! تم مجھے بچاؤ گے کبھی نہ کبھی کسی آفت سے۔''

یہ لمحہ اظہار محبت کا تھا لیکن وہ اس جملے کے باوجود تھکی ہوئی اور پریشان نظر آ رہی تھی میں خاموش رہا۔

''کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم دونوں ہوائی جہاز سے سفر کر رہے ہیں اچانک ہوائی جہاز Crash ہو گیا۔کچھ باقی نہیں بچا نہ جہاز کا نہ ہم دونوں کا۔''

''اچھا خواب ہے۔۔۔اگر کچھ بچ جاتا تو خواب برا ہوتا۔''

وہ چپ ہو گئی۔پھر اس نے اپنے کینوس کے تھیلے میں ہاتھ مارا

''قیوم مجھے ایک پیکٹ لے دو۔۔۔چیونگ گم کا۔''

خوش قسمتی سے میرے پاس پیسے تھے میں نے اسے چیونگ گم خرید دی۔

اس روز وہ بہت قریب ہو کر دور دور تھی۔جیسے پتنگ کی ڈوری ہاتھ میں ہو اور تکل دور دور رہی ہو۔

''تم سوشیالوجی کے سٹوڈنٹ ہو قیوم۔۔۔کبھی تم نے سوچا کہ پاکستان کی

اصل بدنصیبی کیا ہے؟''

ایسے وقت میں یہ سوال بہت عجیب تھا لیکن وہ اس طرح باتیں کرنے کی عادی تھی یکدم بہت جذباتی ہو کر وہ بات موڑنے کی غرض سے بہت ہی معروضی بن جاتی۔

''دراصل پاکستان کی سب سے بڑی ٹریجڈی وہ Generation ہے جنہوں نے پاکستان بنایا آئیڈیل کی خاطر۔۔۔اوراب وہ خود نظریہ پاکستان کو کیا کریں گے۔''

اب ہم دونوں خالص طالب علموں کی طرح دیر تک پاکستان نظریہ پاکستان موجودہ پود اور پچھلی نسل پر باتیں کرنے لگے ابھی کچھ دیر پہلے وہ بے جان تھی۔اس نے اپنی ٹانگیں سامنے میز پر رکھی ہوئی تھیں اور گلابی چشمے کو کینوس کے بیگ پر لاپروائی سے ڈال چھوڑا تھا اب وہ گردن آگے کیے دونوں ہاتھوں کے اشاروں سے باتیں کر رہی تھی اور ایسی تار کی طرح زندہ جس میں سے کرنٹ گزر رہا ہو۔

''یار قیوم۔۔۔پاکستان صرف دو نسل کی کارگزاری ہی تو ہے۔۔۔یہ پچھلے پچیس سال جس میں ہمارے ماں باپ بوڑھے ہوئے اور ہم جوان۔۔۔یہ وقفہ۔۔۔یہ ایک کڑاہے میں گزرا ہے سب نے اس میں اتنا کچھ ڈالا ہے۔۔۔ہماری Generation نے ہمارے ماں باپ نے۔۔۔اور آج تک نہ کچھ میٹھا پکا ہے نہ نمکین ہے نا۔''

''تم سوشیالوجی کے طالب علم ہو کر میری بات میں دلچسپی نہیں لے رہے لعنت''

''لے رہا ہوں۔''

''غور کرو۔۔۔سوچو ذرا۔۔۔تجزیہ کرو ساری سچویشن کا پاکستان کا جو امیر طبقہ ہے وہ ۱۹۴۷ء میں جوان تھا اور غریب گھرانوں سے تعلق رکھتا تھا۔اس نے ادھر آ کر یعنی مقابلہ نہ تھا۔اس لیے یہ طبقہ یہ Ambitions طبقہ بہت آگے نکل گیا۔اس

نے قیوم۔۔۔۔زرا غور سے سوچو اس طبقے نے افسر شاہی کی وہ تجارت پیشہ پیدا کیے جو آج Business magnets ہیں اس نے ان بینکروں کو جنم دیا جنہوں نے سارے ملک کو نوٹ زدہ کر دیا۔۔۔۔اس طبقے وے وہ پروفیسر اٹھے جنہیں تعلیم سے زیادہ گریڈوں کی فکر تھی۔وہ ڈاکٹر سامنے آئے جو بیرونی ممالک میں اس لیے عمریں گزارتے ہیں کہ وہاں پیسہ زیادہ ہے۔۔۔۔اس طبقے ہی سے وہ دانشور پیدا ہوئے جن کی اپنی کوئی Covrction نہیں ان کی سوچ چاہے سرخ چین سے آئے یا سرمایہ دارانہ نظام سے ان کی اپنی نہیں ہوتی Greed میں مبتلا یہ لوگ ہمیں ایک ہی میراث دے سکتے ہیں Conflict اندر کا تضاد، حالات کا تضاد، شخصیتوں کا تضاد۔۔۔۔تم کیوں چاہتے ہو کہ میں واپس اس گھر میں چلی جاؤں جہاں سے اور کچھ نہیں مل سکتا تضاد کے سوائے۔"

"وہ آخر تمہارے ماں باپ ہیں۔"

"جانے دو قیوم۔۔۔۔تم کو ایسے ماں باپ سے پالا نہیں پڑا تم کو پتہ نہیں Ambitions لوگ کیسے ہوتے ہیں۔"

"پھر بھی۔"

"پھر بھی پھر بھی کیا۔۔۔۔تم دینیات تو نہیں پڑھتے رہے کہ مجھے اخلاقی قدریں سکھانا چاہ رہے ہو۔"

"ایک دوست کی حیثیت سے۔"

"یہ لوگ۔۔۔۔یہ پاکستان بنانے والے میرے ماں باپ جب ادھر آئے پاک سرزمین پر۔۔۔۔تو یہاں آ کر ان لوگوں نے جفاکشی محنتی بیویاں بیاہیں۔۔۔۔نیا ملک بسانے کے لیے۔۔۔۔اپنے آپ کو مظبوط بنانے کے لیے۔۔۔۔یہ عورتیں مردوں کو مجازی خدا سمجھتی تھیں۔انہیں نے مردوں کا ساتھ دیا غریبی دور ہوتی گئی۔۔۔۔جیسے روشنی قریب آتی وہ کسی جگہ جا کر حد مقرر نہیں کر سکتا۔ان لوگوں کے

بنک بیلنس بیرونی ممالک میں ہیں وہ کسی جگہ جا کر الحرص میں مبتلا لوگ کمائے جاتے ہیں۔ان کی بیویاں گھروں میں ہیں۔پر یہ وثوق کیے جاتے ہیں۔۔۔۔تمہیں پتہ نہیں I have gone through all سن کے بے والی بیویاں بوڑھی ہوگئی ہیں شوہروں کو کسی مقام پر پہنچانے کے بعد اب وہ ناکارہ ہیں پرانے صوفے کی طرح ان کا ہر سپرنگ ڈھیلا ہے۔۔۔۔اور مجھ جیسی لومڑیاں پھرتی ہیں شہر میں اور ان کے لیے ہر انگور کا گچھا میٹھا ہے۔۔۔۔واہ کیا Drematic بات ہے۔۔۔۔ہے نا۔"

"آج تمہیں کیا ہوگیا ہے سیمی۔"

"کوثر ٹھیک کہتی ہے میں Frustrated ہوں۔۔۔۔دراصل میں۔۔۔۔ میرے ماں باپ؟۔۔۔۔میں کیسے تمہیں سمجھاؤں قیوم۔۔۔میاباپ پاکستان بنانے والی پود کی طرح بوڑھا ہو رہا ہے اس نے اپنی بوڑھی مردمیت کے سامنے دولت بنگلے بنک بیلنس کی سکرین لگا کر اپنے آپ کو بہت Potent کر لیا ہے۔۔۔ ۔اس کا وقت لومڑیوں کے لیے ہے۔۔۔بیٹی بڑا بوجھ لگتی ہے اسے۔"

"تمہیں اپنے باپ کے متعلق ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں"

"اور میری ماں کے ہاتھ پلے کچھ نہیں۔وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتی، مجھے کیا بچائے گی۔تم نے شہر کی لومڑیاں دیکھی ہیں جنہیں ہر بیوٹی شاپ فارن ایڈ پہنچاتی ہے ان کے پاس نقلی پلکیں ہیں کئی کئی ہیئر پیس ہیں۔۔۔۔میک اپ کے علاوہ آزادی ہے ان سے میری ماں کیا لڑے گی۔"

"تمہارے امی نے اجازت کیسے دی ہوسٹل میں رہنے کی۔"

"اوہ چھوڑو جی۔۔۔۔میری ممی کسی بات کی اجازت نہیں دیتیں وہ کسی بات سے Agree نہیں کرتیں اور سب کچھ مان جاتی ہیں۔۔۔۔وہ شراب نہیں پیتیں لیکن کاک ٹیل پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں وہ میرے باپ کے مشاغل سمجھتی ہیں

لیکن اعتراض اس لیے نہیں کر سکتیں کہ وہ ڈیڈی کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ وہ بیوٹی پارلر سے حسن کاری کرواتی ہیں لیکن دل سے ان کا عقیدہ ہے کہ کوئی بوڑھی عورت عمر سے لڑ نہیں سکتی۔۔۔ بھائی صاحب ہم تو ایسے گھر میں رہتے آئے ہیں جہاں ایک ماں کو بوڑھا ہونے کی اجازت بھی نہیں ملتی مجھے جوان ہونے کی اجازت کب ملے گی۔۔۔۔ تم کو کیا پتہ ایسا گھر کیا ہوتا ہے۔ میری ماں بوڑھے ڈھانچے کے ساتھ نوجوان لونڈیے برابر بھاگ رہی ہے۔۔۔ اوہ یہ سب کچھ یہ میرے ماں باپ ان کی زندگی اتنی مضحکہ خیز ہے۔۔۔ اتنی بچگانہ ہے کہ میں۔۔۔ میں اس میں نہیں جا سکتی واپس کبھی نہیں۔۔۔ بتاؤ جب ماں ہی بیٹی سے ڈرتی ہو تو اجازت کون دے گا۔۔۔ میں کس سے اجازت لے کر ہوسٹل آتی۔ بتاؤ ناں۔"

"کبھی ماں ڈری ہے بیٹی سے۔۔۔ حد کرتی ہو تم۔"

"ڈرتی ہے ہر وہ ماں۔۔۔ جو کبھی میں جوان تھی آج اپنی بیٹی سے ڈرتی ہے اب گھروں میں بیٹیاں حکومت کرتی ہیں۔۔۔ ڈیڈی کی کار، ڈیڈی کی توجہ۔۔۔ ڈیڈی کی چیک بک سبکچھ بیٹی کے لیے ہے بیٹی کی سہیلی کے لیے ہے سہیلی کی سہیلی کے لیے میں۔۔۔ اپنی ماں سے پیار کرتی ہوں قیوم۔۔۔ تم کو کیا پتہ میں اس کو ملک کا صدر بنا کر خود پرائم منسٹر بننا نہیں چاہتی۔"

بڑی دیر خاموش رہی۔

"گھروں میں کچھ جھوٹا سچا دبدبہ ہونا چاہیے۔۔۔ جھوٹا سچا پیار۔۔۔ ورنہ ہوسٹل بہتر ہے۔"

وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے اپنا ہاتھ اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔۔۔ "آج میں نے تمہیں بہت بور کیا۔۔۔ ہے نا۔"

"ذرا بھی نہیں۔۔۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ تم کتنی صاف اردو بولنے لگی ہو۔۔۔"

''ہاں وہ بھی۔۔۔۔۔ہے'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جارہی ہوسیمی؟''

''ہاں۔۔۔۔میں سوچتی ہوں سوشیالوجی ایم اے کا بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا یہ بھی بڑا Hoax ہے میرے ممہ ڈیڈی کی طرح۔۔۔۔'' کچھ دیر وہ کھڑی رہی اور پھر بولی ''دیکھو آفتاب ملے تو میرا سلام کہنا''

جس وقت سیمی رخصت ہوئی میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کالج سے ہمیشہ کے لیے جارہی ہے۔جس وقت اس نے سلام بھجوایا تب بھی مجھے شبہ نہ گزرا کہ کوئی عجیب بات ہونے والی ہے حتیٰ کہ جس وقت میں نے آفتاب کو سیمی کا سندیسہ دیا اس وقت بھی مجھے خیال نہ آیا کہ سیمی کا کالج میں آکری دن تھا اور میرے ساتھ آخری دوپہر تھی۔

''سیمی تمہیں سلام بھجوارہی تھی۔''

''اچھا۔۔۔۔؟''لاتعلقی سے آفتاب نے کہا۔

ہم دونوں نے ایک نے ایک دوسرے کو لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور پھر چپ ہوگئے۔شاید آفتاب کو بھی معلوم نہ تھا کہ سیمی ہوسٹل چھوڑ کر پنڈی جاسکی ہے۔

کچھ دن سیمی کا چرچہ رہا ہم جماعت اس کا ذکر کرتے رہے پھر لیٹ فیس والوں کے ساتھ بورڈ پر اس کا نام نظر آتا رہا۔پھر اچانک آفتاب کی منگنی ہوگئی کلاس کو ایک نیا موضوع ہاتھ آگیا۔یہ منگنی اس لیے انوکھا ٹاپک تھی کیونکہ اب تک سیمی آفتاب کا سکینڈل عام ہو چکا تھا۔لڑکیاں آفتاب کی غیر موجودگی میں اس عشق کی بڑی تفصیلات باہم پہنچاتی تھیں۔لیکن آفتاب ے سامنے سب سیمی کا نام لینے سے گریز کرتے تھے۔

فائنل امتحان سے ٹھیک ایک ماہ پہلے آفتاب نے بھی ہوسٹل چھوڑ دیا پھر ایک دن وہ شادی کے کارڈ بانٹنے آیا اور مستقل غائب ہوگیا۔۔۔۔امتحانوں کی وجہ سے بہت

دن تک ہم اسے بھی یاد نہ کر سکے۔

امتحانوں سے پہلے دن اور رات کی سمتیں بدل جاتی ہیں کبھی گھنٹہ میلوں میں کٹتا ہے اور کبھی سارا دن ملی میٹر میں سکڑ جاتا ہے امتحان سے قبل ہونے والی چھٹیاں ہو چکی تھیں آفتاب کی شادی کا کارڈ ان چھٹیوں سے دو دن پہلے آیا تھا۔ ہم سب نے اپنے اپنے کارڈ لیے اور کوثر نے سیمی کا کارڈ بھی لے لیا۔ آفتاب کے جانے کے بعد کچھ دیر تک اس کی شادی دلہن کا نام کارڈ کی پرنٹنگ، لفافے کا سائز آفتاب کی شخصیت زیر بحث رہی پھر امتحان ڈیٹ شیٹ نوٹس کی باتیں ہونے لگیں۔ کسی نے سیمی جیسی بونگی لڑکی کا نام نہ لیا۔

امتحانی چھٹیوں سے پہلے گلاب کے سفید پھول جو کالج کی سڑک کے ساتھ ساتھ نظر آتے تھے ختم ہو چکے تھے بہار ختم تھی بھرپور گرمی ابھی آئی نہ تھی صبح اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا رات کو پڑھائی کرنے سے دل بھاگتا تھا۔ سہ پہر کو اچانک ٹمپریچر بڑھ جاتا اور قیلولہ کرنے کو جی چاہتا امتحانوں میں وقت کم رہتا جا رہا تھا لیکن اسب ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں کی باتیں زیادہ یاد آنے لگی تھیں دماغ میں امتحان کی گھنٹی بجتی رہتی۔ جس سے Guilt میں اضافہ ہوتا۔ حسن اتفاق سے ہر فلم ہاؤس میں اب دھڑا دھڑ اچھی فلموں کی نمائش شروع ہو گئی تھی جمال امجد اور میں ہوسٹل رہ گئے تھے۔ لڑکیاں گھروں میں مقید ہو چکی تھیں ہر اچھی فلم دیکھنے کے بعد ہم تینوں قسم کھاتے کہ امتحانوں تک کوئی فلم نہیں دیکھیں گے۔ لیکن خبر ملتے ہی خدا کیسے پروگرام بن جاتا کورس کے علاوہ سب کتابیں دل چسپ اور پر از معلومات نظر آتیں۔ ہم تینوں قریباً ہر روز مختلف بک ڈپوز کتاب گھروں کے چکر لگاتے ان کتابوں کو جو بک سٹالوں پر بکتی تھیں خریدنے کی ہم میں استطاعت نہ تھی لیکن اصلی پڑھائی سے جان بچانے اور ضمیر سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا بک سٹالوں پر پھیرنے سے

یہ تسلی رہتی کہ ہم تیاری کر رہے ہیں جمل اور امجد نے تو یو ایس آئی ایس کا کارڈ بھی بنوا لیا تھا وہ اپنے آپ کو جل دینے وہاں بھی چلے جاتے میں انارکلی میں فٹ پاتھ پر بکنے والی پرانی کتابیں دیکھتا رہتا پھر پبلک لائبریری چلا جاتا ۔۔۔ ان مشاغل سے مجھے سیمی کے متعلق سوچنے میں بڑی مدد ملتی تھی اپنی میز کرسی کے خیالوں کا انحدباجافیڈ آؤٹ ہونے لگتا بک سٹالوں پر فٹ پاتھ کنارے اور پبلک لائبریری میں دماغ کو کسی جہت پر لگانا نہیں پڑتا تھا جوں جوں امتحان قریب آرہے تھے گھبراہٹ زیادہ اور پڑھائی کا گراف گر رہا ہے اب ہم تینوں نے داڑھیاں رکھ لی تھیں ۔۔۔ لیکن میں شیو سے زیادہ خط بنوانے میں وقت صرف کرتا جب بھی ہم تینوں ملتے پڑھائی کے متعلق ناآسودہ گفتگو ہوتی ہر روز ہم تینوں فیصلہ کرتے کہ گھر ہی چلے جانا بہتر ہے لیکن دوسرے دن سب ہوسٹل میں ہرتے۔

میں اپنے گاؤں چندراں نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہاں ماں بھی نہیں تھی اور بجلی کا بھی انتظام نہیں تھا۔ سانده کلاں میں بڑے بھائی مختار رہتے تھے لیکن میں کبھی ان کے پاس نہیں رہا۔ اس لیے میں امتحان کی تیاری کے لیے کسی نئے ماحول میں جانے کو تیار نہ تھا ۔۔۔ چندراں میں بغیر بجلی کے تیاری ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ دسویں کے بعد میں گھر چھوڑ کر قصور نہ چلا گیا ہوتا۔ ذہنی طور پر چندراں سے کٹ کر اب امتحانی چھٹیاں گزارنے میں وہاں کیسے جا سکتا تھا۔

کئی بار مجھے خیال آیا کہ ماموں کے پاس قصور چلا جاؤں ۔۔۔ وہ مجھے اوپر والی منزل کا کمرہ دیں گے رات کو بلھے شاہ کے مزار سے قوالیوں کی آواز آئے گی۔ صبح صبح ماموں گرم گرم پوریوں کا ناشتہ لائیں گے ۔۔۔ سب میری پڑھائی کا فکر مجھ سے زیادہ کریں گے ۔۔۔ لیکن اب مجھے ایسے ماحول سے وحشت ہوتی تھی۔

دراصل میں کسی ایسے محاول میں جانا نہ چاہتا تھا جہاں میں زیادہ وقت سیمی کے متعلق سوچ نہ سکوں ۔۔۔ پتہ نہیں کیوں مجھے احساس ہوتا تھا کہ اگر میں نے

ہوسٹل کا کمرہ چھوڑا تو کہیں اس کے درودیوار کے ساتھ ہی سیمی بھی پیچھے نہ رہ جائے۔

آفتاب کی شادی سے ایک رات پہلے کا واقعہ ہے۔

میں بنیان پاجامہ پہنے اپنا بستر گول کر کے کمرے کے پیچھے لگائے پڑھ رہا تھا، کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ دستک گول کر جاؤں کیونکہ ہوسٹل کے لڑکے کافی وقت ضائع کر دیتے تھے لیکن پھر آواز آئی۔

''قیوم ---!''

میں نے دروازہ کھولا ---وہ سامنے کھڑی تھی۔

سیمی کو دیکھ کر میں پسینہ میں نہا گیا۔وہ پہلے سے زیادہ دبلی لمبی اور زرد لگ رہی تھی آج اس کے کٹے ہوئے سرخ بال کھلے تھے اور کینوس کا بیگ اس کے ساتھ نہ تھا وہ پہلے جیسی نہ تھی ----گو ظاہرا طور پر اس میں کوئی خاص تبدیلی بھی نہ آئی تھی۔

''آپ کب آئیں ---آئے ناں ---''

''ابھی آٹھ بجے کی فلائٹ سے ---اپنا سامان وائی ڈبلو سی اے میں رکھا۔۔

۔۔اور یہاں ---''

''گھر نہیں گئیں آپ؟ ---''میں نے تکلف سے پوچھا۔

''کون سا گھر؟ ---ابھی تک تم میرا گھر نہیں بھولے۔''

وہ رول کیے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی ---اس کے کولہے کی ہڈیاں تنگ جینز میں بہت نمایاں تھیں۔

''ویک اینڈ کے لیے ائی ہوں ---وائی ڈبلیو میں میری ایک دوست رہتی ہے۔ویک اینڈ کے لیے رکھ لے گی مجھے۔''

مجھے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اس سے کس موضوع پر بات کروں۔

"آپ تو کالج سے ہی گئیں۔۔۔بغیر ملے ملائے۔"

"جانا پڑتا ہے۔"

میں نے اس بونگی، ٹیڑھی، کم شکل، عاشق غیر کو دیکھا۔۔۔کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں تھی۔ لیکن پتہ نہیں میں ہر قیمت پر، ہر موسم میں، ہر قسم کے حالات میں اس کا اسیر تھا۔

"تم بہت دبلے ہو گئے ہو۔۔۔اب تم بانڈ فلمز میں ہیرو نہیں بن سکتے۔"

یہ لمحہ عرض حال کا تھا۔۔۔لیکن جتنی جلدی اس نے میرے متعلق یہ جلمہ کہا اتنی ہی سرعت سے وہ غائب ہو گئی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں۔۔۔کیوں آئی ہوں لاہور۔؟"

میں نے اب بھی سوال نہ کیا۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ آفتاب کی شادی پر آئی ہو گی

"کون کون جا رہا ہے شادہ پر"

"جمال اور امجد۔۔۔"میں نے جواب دیا۔

"اور تم۔۔۔"

"آفتاب میرا روم میٹ تھا۔۔۔میرا دوست نہیں تھا۔۔۔شاید میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

"مجھے کوثر نے کارڈ بھیجا تھا۔۔۔کمینی۔۔۔کبھی خط نہیں لکھا اور کارڈ پوسٹ کر دیا۔ قیوم۔۔۔تم مانو گے تو نہیں۔۔۔لیکن مجھے پتہ چل گیا تھا پہلے ہی کہ اس کی شادی کس دن ہو گی میں نے کارڈ ملنے سے بہت پہلے کل کی تاریخ اپنی نوٹ بک میں لکھی تھی۔۔۔"

اس نے نوٹ بوک دکھانے کے لیے بیگ تلاش کیا۔۔۔"افسوس میں نوٹ بک کینوس والے بیگ میں بھول آئی ہوں۔"

"تمہیں کیسے شک تھا۔۔۔کیسے؟"

''بس مجھے معلوم تھا۔۔۔کہ وہ چودہ تاریخ کو شادی کرے گا چودہ تاریخ اتوار کا دن۔۔۔آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ہوں گے اور اس کی شادی کی رات کو بارش ہو گی گرج چمک کے ساتھ۔۔۔تم جاؤ گے نا اس کی شادی پر۔''

''کس لیے۔۔۔؟ میں وہاں کسی کو نہیں جانتا۔۔۔میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔''

''تمہیں جانا پڑے گا قیوم۔۔۔میری خاطر۔۔۔دیکھو میں پنڈی سے محض اس لیے آئی ہوں۔۔۔تم مجھے آ کر بتانا کہ دولہن کیسی ہے؟''

''تم خود چلی جاؤ تمہارے پاس کارڈ ہے۔۔۔کوثر کا بھیجا ہوا۔۔۔بلکہ تم تو دولہن کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتی ہو۔''

''ہاں جا سکتی ہوں، دیکھ سکتی۔۔۔ہوں لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا۔۔۔''

''بس قیوم میں بہادر لگتی ہوں لیکن صرف لگتی ہوں اندر سے نہیں ہوں۔۔۔قیوم پلیز فار مائی سیک۔۔۔آفتاب کی بیوی کو دیکھ کر آنا۔۔۔میں نے سنا ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔''

''تمہیں کس نے بتایا''

''وہ آفتاب کی کزن ہے۔۔۔ویسی ہی ہو گی آفتاب جیسی۔۔۔'' سیمی کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسو آ گئے

''تم جاؤ گے ناں۔۔۔میں نے اس کی کوٹھی دیکھی ہے کل ڈیوس روڈ کی اس کوٹھی میں کتنی روشنی ہو گی۔۔۔آفتاب دولہا بن کر نکلے گا تو۔۔۔تو۔۔۔تم اسے دیکھنا قیوم۔۔۔وہ وہ۔۔۔'' یکدم چپ ہو گئی۔

''چلو ہم اکھٹے چلیں گے۔''

وہ ڈر گئی۔

''ناں جی۔۔۔بھلا میں کیسے جا سکتی ہوں وہاں۔۔اس کی بے بے مجھے قتل کر دے گی فوراً۔۔کون جانے آفتاب بھی برا مان جائے۔''

میں نے یسمی کا ہاتھ پکڑا اور محبت سے کہا۔۔۔''سنو یسمی۔۔۔گو اپنی نصیحت پر خود عمل نہیں کر سکتا۔لیکن میرا فرض ہے کہ ایک بار میں صورتحال سے تمہیں اچھی طرح روشناس کراؤں۔''

''مثلاً؟''

''تم کیا کر رہی ہو پنڈی میں۔''

''ایک ٹریول ایجنسی ہے۔۔اس میں ملازم ہوں۔''

''تم ایم اے کرو واپس آ کر مکمل کرو اپنی تعلیم۔''

وہ اونچے اونچے ہنس دی۔

''میں تعلیم یافتہ ذہین عورتوں سے نفرت کرتی ہوں کم بخت بلا کی جھوٹی ہوتی ہیں۔اور پھر جب تک آفتاب لاہور میں ہے میں یہاں کیسے آسکتی ہوں۔۔۔سب کچھ پھر سے شروع ہو جائے گا۔''

''ذرا غور سے سوچو۔۔۔آفتاب کی شادی ہو رہی ہے تم کیوں خود بخود دیس نکالا لے رہی ہو۔۔اپنے ماں باپ سے سمجھوتہ کر لو یسمی۔۔۔مشرق میں سب اولاد سمجھوتے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔''

وہ چپ چاپ بستر کی چادر میں سے تاریں نکالنے لگی۔

''قیوم بڑی مشکل ہے، میں تو سمجھوتہ کر لوں لیکن۔۔۔لیکن میری وجہ سے ان دونوں کا آپس میں بڑے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں ڈبل بیڈ پر سونا پڑتا ہے۔اکٹھے تقریبات میں جانا پڑتا ہے جب بھی میں گھر پر رہوں ان دونوں کو میری خاطر محبت کی فضا کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔بجلی گیس ہاٹ کولڈ واٹر کی طرح بڑا ابل آتا محبت کا۔۔۔وہ دونوں بے چارے بڈھا بڈھی جوان جوان بننے کی کوشش کرتے ہیں قیوم۔

۔۔۔جب وہ دونوں میری وجہ سے سمجھوتے کرتے ہوں۔۔۔اب بھی۔۔۔"

"شاید۔۔۔۔لیکن اب میں دیکھ نہیں سکتی۔"

میں نے سوال کرنے کے لیے منہ کھولا اور پھر چپ ہو گیا۔

"پوچھو۔۔۔۔پوچھو۔۔۔۔پوچھو ناں؟"

میں بڑی دیر چپ رہا اصل سوال ہمیشہ نکٹائی کی گرہ بن کر میرے ہی حلق کا ناطقہ بند کرتے رہے ہیں۔

"آفتاب کو بھی بڑے سمجھوتے کرنے پڑتے تھے۔میری وجہ۔۔۔۔۔سے! اسی لیے تو میں نے کالج چھوڑ دیا۔مجھے بڑا ترس آتا تھا آفتاب پر۔"

"کیوں؟۔۔۔کیوں آخر۔؟"

ایک بار پھر میں نمکین پانی تھا اور وہ مجھ میں سلور نائیٹریٹ کے تلچھٹ کی طرح بغیر ملے ہوئے بیٹھتی جا رہی تھی۔

"کالج میں اسے مجھ سے محبت کرنی پڑتی تھی۔گھر جا کر اپنی کشمیرن بے بے کے ساتھ شادی کے امور میں دل چسپی لینی ہوتی تھی۔پھر شام کو اپنی کزن کے گھر جانا ایک معمول تھا اس کا۔۔۔اللہ جانے وہ مجھ سے محبت کرنے میں زیادہ مجبور تھا کہ کزن کے ساتھ شادی کروانے میں۔۔۔اب تو یہ باتیں میں اس قدر سوچ چکی ہوں کہ اگر مجھے جواب مل بھی جائے تو میں داعتاً یہی کچھ سوچتی رہوں گی باقی ساری عمر۔۔۔"

آفتاب کی محبت!۔۔۔اس کے اظہار کا بھی ابھی تک مجھے موقعہ نہ ملا تھا۔

سیمی نے مجھے آستین سے پکڑ کر التجا کی۔۔۔۔"سنو قیوم تمہیں شادی پر جانا ہوگا۔ جانا پڑے گا دیکھو تم انکار نہیں کر سکتے۔۔۔وعدہ کرو۔۔۔پرومس۔"

"وعدہ۔"

"ایسے نہیں ہاتھ ملا کر۔۔۔۔وعدہ!"

میں نے سیمی کا ہاتھ گرفت میں لے لیا۔

جلتی استری پر چھن سے پانی باند پڑی۔اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پڑتے ہی غائب ہو گیا۔

''زیبا کے ہونٹ پر تل ہے۔۔۔غور سے دیکھنا قیوم بائیں طرف گہرے سبز رنگ کا تل۔''

''تمھیں کس نے بتایا؟''

''مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا۔۔۔بس مجھے پتہ ہوتا ہے۔۔۔یاد رکھنا قیوم ہونٹ پر۔۔۔۔''

اس کا چھن سے غائب ہو جانیوال ہاتھ میرے گرم ہاتھ میں تھا۔

پہلی بار میں نے سوچا کیا میں جنسی طور پر Frustrated ہوں۔

شادی انٹر کونٹی نینٹل میں تھی۔گہری شام کو ہائی ٹی۔۔۔سارا انتظام سوئمنگ ٹینکلے ارد گرد کی غلام گردشوں میں تھا۔مجھے کوئی مجبوری نہ تھی لیکن میں جمال اور امجد سے بہت پہلے وہاں پہنچ گیا۔یہ تاجر پیشہ لوگوں کی شادی تھی۔اس میں شرکت کرنیوالے لوگ شہر کے Elite تھے۔قالین فروشوں نے اونچے افسروں سے لے کر فلمی ایکٹرسوں تک سب قابل ذکروں کو بلا رکھا تھا۔کچھ لوگ میری طرح تھے۔ان کی آفتاب کے گھر والوں سے جان پہچان نہ تھی وہ سب وقت کٹی کے لیے سگریٹ پینے بیروں کو دیکھ کر مسکرانے اور بے مصرف چکر لگانے میں مصروف تھے۔ابھی دولہن اپنے آرائشی منڈپ میں نہیں آئی تھی خوش لباس کشمیری لڑکیاں، اور فربہ جسم عورتیں شادی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

پھر آفتاب برات سمیت پہنچا۔اس کے ساتھ جمال اور امجد بھی تھے۔

براتوں کو لوٹنے کا عہد گزر چکا۔لیکن آفتاب کے آگے آتے دیکھ کر میرا جی چاہا

کہ اسی وقت کوئی چھ فٹا نوجوان کہیں سے آ جائے پھر آفتاب کو قتل کر کے وہ اس کی زیبا کے ساتھ فرار ہو۔۔۔اسے سندھوری میز پوش ان پر سجے ہوئے بھاری بھاری کانسی برتن پیسٹری سینڈ ایش ٹرے تر بتر ہوں۔۔۔ کاریں سفید کشمیری لڑکیوں کو پیک کر کے موٹی فربہ عورتوں کو بھگا کر نکل جائیں۔

نیلے سوئمنگ ٹینک میں تیرنے والی امریکی اور جرمن لڑکیاں چیخیں مار کر اوپر والے

کمروں کو دوڑیں اور آفتاب کی لاش، کمخواب کی شیوانی اور تلے کی جوتی سمیت سوئمنگ ٹینک پر تیرتی رہے۔ ہوٹل کا عملہ پولیس کے آنے تک اندر چھپا رہے اور چودھویں رات کا چاند کے علاوہ اس لاش کو دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔۔۔ پھر میں وائی ڈبلو پہنچوں اور سیمی کو بتاؤں کہ زیبا کے سابق عاشق نے آفتاب کو قتل کر دیا اور دولہن کے ساتھ فرار ہو گیا سیمی نڈھال ہو کر میرے سینے سے آ لگے۔

پچھلے باب کا اختتام ہو۔۔۔ اور آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے جب سیمی دوبارہ زندہ ہو تو اس کی ہر خوشی ہر غم مجھ سے وابستہ ہو جائے!

خواب جب اس قدر فاسد قسم کے ہوں تو ان کے دیکھنے والے عموماً خوش نہیں رہ سکتے۔

اس لیے عین وقت پر نکاح ہوا۔

تمام مہمان گو مغربی تہذیب میں سنے ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے شوق سے نکاح کے چھوہارے کھائے۔۔۔ پھر منڈپ میں دولہا دولہن ایک ساتھ بیٹھے پریس فوٹو گرافر کے علاوہ امجد نے بھی تصویر کھینچیں۔ سلامیاں دی گئیں۔۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوتا رہا۔ پتہ نہیں کیوں آفتاب کی شادی مجھے ٹیلی ویژن کا فلور شو لگ رہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ ابھی یہ سارا سیٹ ایکٹرا ایکٹرسوں سمیت اپنے اپنے گھر چلا جائے گا پھر نہ کوئی شادی ہوئی ہو گی نہ کوئی دعوت۔

لیکن منڈپ میں دولہن بیٹھی تھی۔۔۔ نتھ کے نیچے ہونٹ پوتلیلیے وہ مسکراہٹیں دبانے کی کوشش کررہی تھی۔اس کے پاس آفتاب دونوں نتھنوں سے ہنس رہا تھا اس کی کسی حرکتسے تاسف، غم یاملیامیٹ ہونے والی کسی کیفیت کا سراغ نہیں ملتا تھا۔میں سیمی کو اس غنڈے آفتاب کی شکل کیسے دکھاتا؟ کاش اس وقتمیرے پاس بھی کوئی پولو رائیڈ کیمرہ ہوتا تو میں بھی آدھ گھنٹہ میں اس کی تصویریں بنالیتا پھر شاید سیمی یقین کرتی کہ۔۔۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا!

میں چونکہ افتابکا روم میٹ۔اس لیے اس سے بہت بعد میں ملا۔ بیرے چائے کے برتن اٹھانے میں مصروف تھے کچھ اہم مہمان جانا چاہتے تھے آفتاب کی بھر بھر کم ماں انہیں مسکراہٹوں کے ساتھ رخصت کر رہی تھی۔اب بھی جوانلڑکیاں بجلیاں گرانے کے لیے بالیاں، بالیاں اور چوڑیاں درست کیے کا رہی تھیں مرد بظاہر سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے ان ہی زہرہ جبینوں کو تحسین بھری نظروں سے خراج ادا کررہے تھے۔

میں نے زیبا کے ہونٹوں کا تل دیکھ لیا تھا اور باقی شادی میں میرے لیے اب کوئی نظر فریب بات نہ تھی پھر امتحان کا خیال بھی تھا۔میں کھسک جانے کا راستہ بھانپنے میں مسغول تھا۔جب آفتاب میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

واقعی آفتاب میں وہ سب کچھ تھا جس کی آرزو لڑکیاں کرتی ہیں۔

''کڑکی کوئی نہیں آئی۔۔۔'' آفتاب نے کہا۔

پتہ نہیں وہ کس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا؟

''لڑکیاں یار پڑھا کو ہوتی ہیں،وہ کیوں اپنا ٹائم ویسٹ کریں گی۔''

''باقی سب کا کیا حال ہے؟''

باقی سب خدانے اس کا کیا مطلب تھا؟

''خوب پڑھائیاں ہو رہی ہیں۔۔۔'' اس نے سوال کیا۔

''کہاں یار۔۔۔؟ پتہ نہیں سبجکٹ واہیات ہے کہ ہم لوگ بیہودہ ہیں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔۔۔پتہ نہیں میں کیوں محسوس کیا کہ آج وہ مجھ سے فروعی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔

''سیمی آئی ہے۔۔۔'' پتہ نہیں میں نے کیوں کہا۔

''کہاں۔۔۔؟ یکدم اس نے سارے میں نظر دوڑائی۔''

''یہاں نہیں آئی۔۔۔ویسے آئی ہوئی ہے۔''

آفتاب جیسے مایوس ہو گیا۔

''اچھا۔۔۔کب؟۔۔۔''

''کل شام۔''

''کچھ دن رہے گی۔''

''صرف ویک اینڈ۔۔۔''

آفتاب کا رنگ پھیکا پڑ گیا اس کا سارا دولہا پن، خوبصورتی، مسکراہٹ رخصت ہو گئی۔۔۔سیمی کا ذکر نے یکدم ہمیں اس قدر قریب کر دیا جیسے ہم ہمیشہ کے دوست تھے، روم میٹ نہیں تھے۔ آفتاب کے چہرے سے لگتا تھا جیسے ہم ہمیشہ کے دوست تھے روم میٹ نہیں تھے۔ آفتاب کے چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بولنا چاہتا ہے لگاتار۔۔۔انتھک گول گول چکروں میں۔۔۔کبھی ٹون گرا کر کبھی Volume بڑھا کر۔۔۔ایسے خاموش لڑکے سے اتنی باتوں کی مجھے امید نہ تھی۔

''عجیب بونگی لڑکی ہے وہ حالات سے، اپنے آپ سے، کسی دوسرے سے سمجھوتہ کرنے والی نہیں۔''

سپرنگ بورڈ پر ایک امریکی لڑکی چڑھی اس نے ہوا میں سمر سالٹ لگایا اور سرخ لباس غسل سمیت پانی تلے غائب ہو گئی۔۔۔اس لڑکی اور سیمی میں بلا کی مشابہت تھی

میں نے سانس روک لی اور آرزو کی کہ جلدی سے وہ پانی کی سطح پر واپس نکل آئے۔

آفتاب نے منڈپ کی طرف دیکھا۔ دولہن میں اب عمومی دلچسپی کم ہو چکی تھی اور اسے اسی کے گھر والی عورتیں سہیلیاں اور چھوٹی بچیوں نے گھرے میں لیے بیٹھی تھیں۔ شاید آفتاب کو زیبا سے بھی محبت تھی۔

''سیمی کبھی سمجھ نہیں سکتی۔۔۔وہ بہت زیادہ زندہ ہے۔۔۔۔محبت کرتی ہے جی جان سے۔۔۔زندگی حساب کا سوال نہیں ہے لیکن وہ اسے کسی فارمولے سے حل کرنا چاہتی ہے۔۔۔'' نمبر ایک نمبر دو۔۔۔۔تین والا بے تکان بول رہا تھا۔۔۔۔

''سب کا اپنا اپنا طریہ ہے آفتاب۔۔۔ہم کسی پر اپنا طریقہ ٹھونس نہیں سکتے۔''

اس نے گلے سے تمام ہار اتارے کر سامنے میز پر رکھ دیے اور پھر ٹنڈ منڈ ہو کر کرسی سے پشت لگا دی۔ آفتاب کم گو تھا۔۔۔وہ صرف امجد کے ساتھ سیمی کے ٹاپک پر باتیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس وقت پتہ نہیں کیوں وہ کیوں وہ اس قدر بھر کم باتیں کرنے لگ

''زندگی سے موت تک کئی راستے ہیں جس راستے پر بھی پڑ جاؤ قیوم اس کی کچھ راحتیں ہوتی ہیں۔ اس میں کچھ تکلیفیں پیش اتی ہیں کچھ اس راہ پر چلنے کے تغمے ہوتے ہیں کچھ قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں دراصل کوئی راہ اختیار کر لو۔۔۔کسی راستے پر پڑ جاؤ وقفہ اتنا لمبا ہے کہ مسافروں کا سانس اکھڑے ہی اکھڑے۔۔۔''

کیا آفتاب ہمیشہ سے ایسا تھا؟

یا کسی واقعہ نے اس کی طبعیت کو بدل دیا تھا۔۔۔مجھے وہ دن یاد آ گیا۔ جب پہلی بار ہم سب نے اپنا اپنا تعارف پروفیسر سہیل کی کلاس میں کرایا تھا۔ اس روز آفتاب کس قدر موڈی، کنوارا اور خوبصورت نظر آتا تھا۔

وہ بولے گیا۔۔۔ ''دیکھو ناں قیوم جب مسافر کا دم اکھڑتا ہے تو پہلی سوچ

اس کی یہ ہوتی ہے کہ۔۔۔ کہ مسافت میں تھکا دینے والا بنیادی نقص اس کی پسند کا تھا اگر اس نے کسی دوسری راہ کو پسند کیا ہوتا تو شاید راستہ آسانی سے کٹتا۔۔۔"

"کبھی کبھی درست انتخاب راستے کی طوالت کو کم کر دیتا ہے" میں نے کہا۔

"غلط میرے بھائی غلط۔۔۔ جھوٹ بکواس! کسی راہ پر چلے جاؤ۔۔۔ کم وقت نہیں لگے گا۔۔۔ اسی لیے تو کوئی پسند کی راہ درست نہیں ہوتی بالآخر۔۔۔"

یہ باتیں ایک دولہا کے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔ دولہا تو شرماتا پان چباتا اور مسکراتا ہی پیارا لگتا ہے۔

"فرض کرو ایک راستہ ہے پتھریلا، آسمان پر سورج خط استوا جیسا۔۔۔ اس راستے پر چلنے والا ضرور سوچے گا کہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں جو تاکستانوں کی چھاؤں میں انگوروں کے کوشے کھاتے چل رہے ہیں اگر تاکستان والی راہ پر نکلو تو وہاں کے چلنے والے بتائیں گے کہ ہر خوشے میں کالی وردیوں والے کالی بلی بریے ہیں شہد کی مکھیاں ہیں۔ اس کے جسم پر ہر جگہ بھڑوں کا کاٹے کیسوجن ہے۔۔۔ پھر یہ تاکستانوں میں چلنے والا سوچتا ہے کہ وہ شخص جو لکڑی کا پھٹہ ڈالے بن چتوار اترائی کے رخ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ جا رہا ہے خوشصیب ہے اس کی راہ آسان ہے، بن چتوارے سے پوچھو تو وہ کہتا ہے۔۔۔ خبردار یہاں کی مچھلیاں آدم خور ہیں۔۔۔ سنسار منہ کھولے پڑے ہیں، اور ڈھلوان پر جانے والے پانی میں از خود بھنور پڑتے ہیں"

"اگر ہر راہ پر خطر ہے۔۔۔ تو پھر پسند کیسی۔۔۔ یہ پسند کا شوشہ چھوڑ کر تو فطرت نے انسان کو احمق بنایا ہے۔"

"اور ہمی جیسے احمق اپنی Choice پر ڈٹے رہیں گے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ راہ کے انتخاب سے وہ زندگی کی راحتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں حالانکہ وہ صرف ادل بدل سکتے ہیں راحتوں کو۔۔۔ اضافہ نہیں کر سکتے نہ غم میں نہ خوشی میں۔"

''یہ تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو آفتاب''

''میں نے کبھی اپنی پسند سے زندگی نہیں گزاری اور بڑی اسودگی میں وقت گزارا ہے مجھے دولت، محبت، آسودگی طمانیت سن اتفاقات ملی۔۔۔۔۔یہی۔۔۔۔یہی بات اسے سمجھ نہیں آئی میں اگر پسند کو زندگی میں شامل کر لوں تو بڑی مشکلات پیدا کر لیتا اپنے لیے۔۔۔دوسروں کے لیے۔''

یہ شخص یا تو انتہا کا خود غرض تھا یا بلا کا بے غرض۔۔۔۔۔میں اندازہ لگا سکا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟ لوگ اہم فیصلے کیسے کرتے ہیں۔ساری زندگی کے تمام فیصلے پسند ناپسند کے راستے یہ کیسے ہوتے ہیں اگر نتیجہ نہیں نکلتا تو فیصلے ہوتے کیوں ہیں آخر۔نیچر ہمارا وقت ضائع کرنا چاہتی ہے ہمیں بے وقوف بنانا اس کی منشا ہے؟'' میں نے پوچھا

آفتاب اب مجھے مکمل طور پر پروفیسر کی کاپی لگ رہا تھا۔اس نوجوان سے میری کوئی واقفیت نہ تھی۔

''دیکھو فیصلے ہم میں شروع ڈال دیے جاتے ہیں چوری چوری ہماری مرضی پوچھے بنا۔ہر انسان کے اندر ایک خمیر ہوتا ہے سرسوں کے بیج میں یہ فیصلہ ہوتا ہے اس کا زرد رنگ ہوگا تربوز کاٹو تو اس کا ہر بیج یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس سے جنم لینے والا تربوز سرخ ہوگا۔۔۔دیکھو قیوم نہ تربوز اپنی خوشی سے سرخ ہوتا ہے نہ چنبیلی اپنی مرضی سے خوشبودار۔۔۔سب کا بیج کا خمیر ہے جو آدمی چور بنتا ہے اس کے وجود کو غارت گری کا خمیر لگا ہوتا ہے کہیں۔۔۔نیک سازگار ماحول میں شاید ساری عمر اس کی یہ خوبی نہ کھلے لیکن جس کے اندر غارت گری کا خمیر نہیں ہوگا۔۔۔وہ ناسازگار ماحول میں بھی کچھ نہیں کر پائے گا۔۔۔کبھی چور نہیں بن سکے گا۔۔۔یار میرے سیدھی بات ہے سیب کو تم بھی گرتا دیکھتے ہو نیوٹن نے بھی دیکھا تھا تم کشش ثقل ایجاد نہیں کر سکے۔کیونکہ تمہارے بیج میں وہ راستہ نہیں تھا جو ایک سائنسدان کا

ہوتا ہے'' میں ۔۔۔ پروفیسر سہیل کی کمپنی میں اگر نہ رہتا تو شاید یہ باتیں مجھے سمجھ نہ آتیں اور ۔۔۔ شاید میں اپنی پسند کی زندگی بسر کرنا چاہتا ۔۔۔ لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں۔

کیا واقعی وہ سمجھ گیا تھا۔؟

کیا سیمی سے بچھڑ کر وہ ایسی باتیں کرنے پر مجبور تھا۔

کیا پروفیسر سہیل کی باتوں کا اثر تھا۔

کیا وہ ہمیشہ سے خاموشی کے غلاف تلے ایسی ہی باتیں سوچتا تھا۔

''اب میں احتجاج کرنے کے خلاف ہوں تہلکہ مچانے والے صرف اپنا نقصان ہی نہیں کرتے سب کو برباد کرتے ہیں سارے ماحول کو ۔۔۔ سیمی سمجھتی ہے کہ وہ اپنے رویے سے اپنی سوچ سے اپنی پسند سے خوشی اور غم لانے کی ضامن ہے ۔۔۔ وہ تو ایسی ضدی ہے کہ اپنی آرزو کے سامنے اللہ کی ساری کائنات توڑ پھوڑ سکتی ہے۔''

''میں بھی ایسے ہی سمجھتا ہوں۔

''بیکار ہے فضول ہے ۔۔۔ میں جانتا ہوں وہ خود ٹوٹ جائے گی اچانک۔''

''تمہیں سیمی سے محبت ہے؟''

وہ بڑی دیر خاموش رہا۔

''آفتاب ۔۔۔ میں نے ایک سوال کیا ہے تم سے۔''

''محبت ہونے نہ ہونے سے میرا راستہ نہیں بدل سکتا۔''

''کیوں؟''

''سیمی سمجھتی ہے میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچا نہیں ۔۔۔۔ بہت سوچا ہے میں نے قیوم بہت زیادہ ۔۔۔ سیمی کے ساتھ بھی زندگی میں کچھ راحتیں ہوتیں کچھ غم ہوتے ۔۔۔ زیبا کے ساتھ رہنے میں کچھ راحتیں ہوں گی غم ملیں گے ۔۔۔

زندگی کسی کے ساتھ گزار لو قیوم آخر میزان برابر رہتا ہے۔"

"ایسی منفی سوچ کی وجہ سے تم نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔"

"اگر میں اس کی زندگی تباہ نہ کرتا۔۔۔تو کچھ اور لوگوں کی زندگی تباہ کر دیتا یہ فیصلہ بھی مجھیں پہلے سے میرے اندر ہو چکا ہے۔"

"تمہیں یہ فیصلہ سیمی سے محبت کرنے سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔"

"میں نے کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔۔۔کیونکہ ہر فیصلہ میرے بیج میں پہلے سے موجود تھا اور اس بیج کے فیصلے سے مڑا نہیں جا سکتا۔ باقی تمام فیصلے اس پہلے فیصلے میں موجود ہوتے ہیں قیوم۔"

"مجھے خدا کے لیے بتاؤ تمہیں سیمی سے محبت ہے کہ نہیں۔"

اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔۔۔چند ثانیے اپنی نوبیاہتا کو دیکھا اور بولا۔

"محبت چھلاوہ ہے قیوم۔۔۔اس کی اصل حقیقت بڑی مشکل سے سمجھ آتی ہے۔ کچھ لوگ جو آپ سے اظہار محبت کرتے ہیں اتصال جسم کے خواہاں ہوتے ہیں۔ کچھ آپ کی روح کے لیے تڑپتے ہیں کسی کے جذبات پر آپ خود حاوی ہو جانا چاہتے ہیں۔ کچھ کو سمجھ سوچ ادراک کی سمتوں پر چھا جانے کا شوق ہوتا ہے۔۔۔ محبت چھلاوہ ہے لاکھ روپ بدلتی ہے۔۔۔اسی لیے لاکھ چاہو ایک آدمی آپ کی تمام ضروریات پوری کر دے یہ ممکن نہیں۔۔۔اور بالفرض کوئی آپ کی ہر سمت ہر جہت کے خلاء کو پورا بھی کر دے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ بھی اس کی ہر ضرورت کو ہر جگہ ہر موسم میں ہر عہد میں پورا کر سکیں گے۔۔۔انسان جامد نہیں ہے بڑھنے والا ہے اوپر دائیں بائیں۔۔۔اس کی ضروریات کو تم پابند نہیں کرتے۔۔۔ لیکن سیمی بڑی ضدی ہے۔۔۔بہت زیادہ۔۔۔وہ محبت کو کسی جامد لمحے میں بند کرنا چاہتی ہے۔"

شاید آفتاب اور میں ابھی اور کچھ دیر باتیں کرتے رہتے لیکن اس وقت امجد اور

جمال آ گئے وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

امجد نے آتے ہی آفتاب کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''کیا رازونیاز ہو رہے ہیں''

لیکن آفتاب ابھی جواب دینے نہ پایا تھا کہ جمال بولا ''یار ادھر چلو شالیمار میں اتنی پیاری پوپٹیں بیٹھی ہیں۔۔۔۔خدا قسم ذرا ہائے ادئی کرنے والی نہیں بڑے آرام سے تبادلی خیالات کرتی ہیں۔''

''ہاں سچ یار بڑی ڈیسنیٹ لڑکیاں ہیں۔ ایسے آرام سے باتیں کرنے لگیں ہم سے چلو۔'' امجد بولا۔

''چونکہ تم سے باتیں کرنے لگیں اس لیے ڈیسنٹ ہوئیں۔۔۔'' آفتاب نے مسکرا کر پوچھا۔

امجد نے آنکھ مار کر کہا۔۔۔''سچی یار ہمیں تو وہی ڈیسینٹ جو خواہ مخواہ ہمیں، یہ احساس نہ دلائیں کہ ہم کوئی خاص قسم کے غنڈے ہیں جو ان کی عصمت دری کیے بغیر دم نہ لیں گے۔۔۔اندر سے چاہے ویسے ہی ہوں لیکن احساس نہ دلائے تب لڑکی ڈیسیٹ ہوتی ہے اٹھو قوم۔۔۔۔اٹھو۔۔۔۔''

آفتاب نے مسکرا کر کہا۔۔۔۔''جاؤ بھائی۔۔۔۔ہم تو تنہی ہو گئے۔''

''اس کے ساتھ۔۔۔''جمال نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''نہیں اس کے ساتھ

ابرو کے اشارے سے آفتاب نے زیبا کی طرف اشارہ کیا۔۔۔جمال اور امجد نے بڑے زنت کاروں کی طرح کمریں لچکاتے کرسیوں میں بیٹھی ہوئی جنس مخالف کو ایس کیوزمی کرتے ہوئے اندر کی طرف چلے گئے۔

اس وقت پانی کی تہہ سے سرخ لباس غسل والی امریکن لڑکی نے سر نکالا اور ڈولفن کی طرح سر اٹھا کر جھٹکا۔۔۔لڑکی نیلی آنکھوں پر پانی کی تہہ میں تیرنے کی وجہ

سے ہلکی سی سرخی چھا گئی تھی۔۔۔آفتاب نے سامنے پڑے ہوئے گل دان میں سے ایک گیندے کا پھول توڑا اور اس کی طرف پھینکا۔لڑکی ایک انجانے راستے پر یوں تعریف ملتے دیکھ کر معصومیت اور خوشی سے مسکرائی پھر اس نے پھول کو فاختہ کی طرح منہ میں اٹھایا اور پانی کی تہہ میں چلی گئی۔

آفتاب میں وہ سب کچھ تھا جس سے لڑکیاں محبت کیا کرتی ہیں۔

ہوٹل سے نکل کر مجھے سارا راستہ کالج کی تعارفی کلاس یاد آتی رہی پتہ نہیں کیوں ساری

شام آفتاب کی باتوں سے پروفیسر سہیل کی خوشبو آتی رہی تھی جیسے میں آفتاب سے نہیں پروفیسر سہیل سے مل کر آرہا تھا۔

جمال اور امجد سے بہت پہلے میں شادی سے لوٹ آیا۔

رات کے پہلے پہر ہوسٹل بالکل اجاڑ تھا کمروں میں سے پنکھوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور سڑک پر چلنے والے ٹریفک کی دبی دبی سی آواز ایک مسلسل سرگوشی تھی میں ہوسٹل کی

زندگی سے مطمئن نہ تھا۔اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے پھر دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ ان قلیل چھٹیوں میں مجھے کیسے پڑھائی کرنی چاہئیے کیا میں بھائی کے پاس شاندہ چلا جاؤں کیا قصور میں دلجمعی سے پڑھائی ہوسکتی ہے یا پھر مجھے نیا ٹائم ٹیبل بنا کر یہیں ہوسٹل میں رہنا چاہئیے؟

ہوسٹل کی ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والے لڑکوں کی عادتیں اور پڑھائی کے اوقات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں کچھ نوجوان ساری رات سمادھی لگا کر پڑھتے ہیں اور صبح نیند کی گولیاں کھا کر مگر مچھ کی طرح بے سدھ لیٹ جاتے ہیں کچھ خائف رہتے ہیں اپنے حافظے کے ہاتھوں۔ان کو زیادہ پڑھنے

کے بعد نروس ہو کر دوسروں کے پاس اکلاتی جرائت۔ اعادہ سبق اور خوف کا علاج کرنے جانا پڑتا ہے ان کے علاوہ ایک جماعت خود غرضوں کی بھی ہوتی ہے وہ کوٹا بھر پڑھائی کر کے دوسروں کے پاس خوش گپی کے لیے اس وقت جاتے ہیں جب ابھی دوسرا بے چارہ پڑھائی کا سٹارٹ ہی لے رہا ہوتا ہے میں دن میں کئی مرتبہ پڑھائی کی کلی دبانے کی غرض سے جھوٹے سٹارٹ لیتا اور ہر بار کوئی نہ کوئی ہوسٹل کا باسی بریک لگانے پر مجبور کر دیتا۔ جمال کی عادت تھی کہ شہزادہ سات گھنٹے پڑھنے کے بعد حالیہ حالات پاکستان اور پاکستان کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لانے کے پروگرام بڑی تفصیل سے زیر بحث لا کر دو ڈھائی گھنٹے میرے پاس صرف کرتا۔

''بیٹھ جاؤ جمال۔۔۔۔'' میں کرسی پیش کرتا۔

''میں بس جا رہا ہو۔۔۔۔۔'' وہ کھڑا رہتا اور بولتا چلا جاتا۔

''ناں بھائی۔۔۔۔ تمہارا بھی ٹائم ویسٹ ہو گا۔۔۔۔ میرا بھی۔۔۔۔ بیٹھنا وٹھنا نہیں ہے۔''

میں اس کے سامنے کئی بار گھڑی دیکھتا۔ کئی پنسلیں گھڑ کر رکھ لی جاتیں۔ پن دھوئے جاتے۔ ان کی سیاہی بدلی جاتی کاغذوں کے نوٹ بنانے کے لیے پن لگاتا۔۔۔۔ جن

کتابوں سے مختلف Topics پر Refrence ملنے کی امید ہوتی۔ ان کتابوں میں جا بجا کاغذ کی پرچیاں رکھ کر ان کو اینٹوں کے چھٹے کی طرح جما کر رکھتا۔۔۔۔ میرے مشاغل نے کبھی جمال کو پریشان نہیں کیا۔ وہ سٹیل مل لگانے سے لے کر دہی بلونے والی چھوٹی رئی تک ان گنت فیکٹریاں پاکستان کے مختلف شہروں میں لگاتا رہتا۔ اس کی گفتگو سے سارا پاکستان کالا شاہ کاکو بن جاتا اور فضا میں سے بدبودار شیرے، ایران ارٹینڈری کے خام چمڑے کی بو آنے لگتی۔۔۔۔۔

جمال کے جانے کے بعد فضا میں فیکٹریوں کا دھواں اس قدر پھیلا ہوتا کہ میں

سانس برابر کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاتا۔ واپسی پر پڑھائی کے سٹارٹ میں کئی اوگھٹ گھاٹیاں آتیں ان کو پار کرنے کے بعد ابھی میں نے سپیڈ ہی پکڑی ہوتی کہ امجد آجاتا۔۔۔ امجد ہنگامی آدمی تھا وہ صرف پندرہ منٹ ٹھہرتا۔۔۔ لیکن اس کے ضمیمے کے بعد توجہ کتاب کی سکرین پر ٹھہر ہی نہ سکتی تھی۔

جس وقت میں آفتاب کی شادی سے لوٹا۔ میرا ارادہ شہر سے بھاگ جانے کا تھا جو کچھ آفتیں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ ان کی سردار مصیبت سیمی تھی۔ آفتاب کی شادی نے پتہ نہیں کیوں دل میں سیمی کی محبت پا لینے کے خواب کو از سرِ نو ہوا دے رکھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ کوئی ایسا خوف بھی تھا جو میٹرونوم پر بتا رہا تھا کہ اب بیٹا تم پاس ہی نہ ہو سکو گے اس لیے اس میں عافیت ہے کہ شہر، ہوسٹل۔ کالج چھوڑ کر کسی چھوٹے سے گاؤں میں بھاگ جاؤ، وہاں مقامی نمبردار سے دوستی لگا کر ایک چھوٹا سا سکول کھولو اور باقی ماندہ زندگی ان بچوں کو پڑھاؤ جو پڑھنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے۔

بالآخر میں نے پھر ایک جھوٹا سٹارٹ لیا۔ اپنی چارپائی سے بستر رول کر کے سرہانے کی جانب رکھا اور سوشیالوجی کے دوسرے پرچے کی تیاری کرنے لگا۔

اس وقت دروازے پر کسی نے انگوٹھی کے ساتھ دستک دی۔

دروازہ کھولا تو سیمی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مجھے بانس پر ٹنگا ہوا نظر آیا۔

''آجاؤں۔۔۔۔۔۔ کہ نہیں۔''

''اس وقت تمہیں اجازت کیسے ملی اندر آنے کی؟''

''بس مل گئی آجاؤں؟''

وہ چارپائی پر جوتے اتار کر بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کٹے ہوئے بالوں والی کسی لڑکی کو فلیپر پہن کر الانی چارپائی پر ننگے پاؤں بیٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے رول کیے ہوئے بستر پر اپنی کہنی جمائی اور نظریں جھکا کر پوچھا۔

''تو ہو گئی شادی؟''

شاید وہ مجھ سے نفی میں جواب کی آرزومند تھی۔

''ہاں ۔۔۔۔ ہو گئی۔۔۔''

بڑی دیر تک وہ سر ہلاتی ہلاتی رہی۔

پھر جیسے اس نے اپنے آپ کو قابو پا لیا۔ وہ بڑے سادی گھریلو انداز میں باتیں کرنے لگی۔

''بہت مہمان تھے۔۔۔۔ ہے نا۔۔۔''

''نہیں زیادہ نہیں تھے۔۔۔۔ یہی کوئی تین سو کے قریب۔۔۔۔''

''جمال اور امجد بھی گئے ہوں گے۔۔۔۔'' جیسے وہ شادی پر ہمارے ساتھ ہی تھی

''ہاں۔۔۔''

''اور۔۔۔؟ اور فرزانہ کوثر وغیرہ۔۔۔۔''

''وہ پڑھ رہی ہوں گی اس وقت۔۔۔۔ ان کمبختوں نے فسٹ ڈویژن لینی ہے ہماری طرح کوئی اپنا آگا تھوڑا مارنا ہے۔''

''ہاں۔۔۔ سمجھ دار ہیں وہ چاروں۔۔۔۔ کاش خدا ہمیں بھی عقل دیتا! انجیلا بھی نہیں آئی۔۔۔۔؟''

وہ چپ ہو گئی

اس وقت ایک بار امید نے مجھے بڑے بھرپور قسم کے سبز باغ دکھائے دراصل ہر شخص کو اپنے ملک کی لوک کہانیاں پر اندر ہی اندر بڑا اعتبار ہوتا ہے وہ بہت سمجھدار ہونے کے باوجود کبھی ان کہانیوں کے چنگل سے نکل نہیں سکتا۔ ملک کی مجموعی سائیکی ان ہی کہانیوں میں ہوتی ہے۔ اور میں بھی ان ہی کہانیوں کا ایک حصہ تھا۔ اس وقت مجھے یقین تھا کہ چونکہ ویلن کی شادی ہو گئی ہے اس لیے نیچرل نتیجہ یہی ہے کہ اب سیمی پوری قوت سے مجھ پر عاشق ہو جائے گی۔ راستے کی چٹان کٹتے ہی

اسے میرے سوائے اور کچھ نظر نہیں آنا چاہئیے۔ لیکن سیمی کچھ شوقیہ گلابی گلاسز نہیں پہنتی تھی۔ واقعی اس کی بصیرت کمزور تھی اسے آفتاب کے بعد کوئی شخص نظر نہ آیا۔

"انتظام کیسا تھا؟۔۔۔۔" اور میں نے یونہی پوچھا۔

دراصل وہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی اور میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔

میں اس سے وہ باتیں کیوں کرتا جو تالاب کنارے آفتاب نے مجھ سے کی تھیں

شاید میرے بیان کے ردوبدل سے وہ ان باتوں کو افتاب کی محبت پر محمول کرتی۔

بڑی دیر بعد میں نے جواب دیا۔۔۔۔"اچھا تھا جیسے ہوٹلوں کے انتظام ہوتے ہیں۔"

"پھر بھی۔۔۔"

"نکاح سے پہلے ڈرنکز تھیں۔۔۔کوکا کولا وغیرہ"

یکدم اس کا رنگ پھرفق ہوگیا۔ دوپہر کی دھوپ میں چمکتی سفید ریت کی طرح

"نکاح سے پہلے۔۔۔نکاح سے پہلے۔۔۔نکاح سے پہلے۔۔۔۔" وہ الاپنے لگی اس وقت مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید سیمی اب بھی مجھ سے محبت نہ کر سکے۔

"اور۔۔۔۔اور۔۔۔۔"

"چائے تھی۔۔۔۔نکاح کے بعد۔۔۔وہی معمول کی چیزیں، چیز فنگرز، مچھلی، پیسٹری اور ایک ٹرائفل قسم کی سویٹ تھی۔"

یکدم وہ بھڑک کر بولی۔۔۔"نکاح کے بعد کبھی ٹرائفل نہیں ہوتا۔۔۔ہمیشہ نکاح سے پہلے ٹرائفل ہوتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے جنہوں نے میرے اظہار محبت کو شارٹ سرکٹ کر دیا۔

"کیسی ہے؟۔۔۔۔" گلابی گلاسز کے پیچھے دھنسی ہوئی آنکھیں تھیں آنکھوں میں آنسو تھے اور ان پردوں کے پیچھے کہیں سیمی کھڑی تھی۔

''کون۔۔۔؟۔۔۔''

''وہی ٹرانفل۔۔۔''

''خوبصورت ہے۔۔۔۔جیسے کشمیری لڑکیاں ہوتی ہیں۔۔۔''میں نے لہجے کو خشک رنگ دے کر کہا۔

''قد۔۔۔؟۔۔۔''

''لمبا۔۔۔''

''آنکھیں۔۔۔؟۔۔۔''

''نیلی!۔۔۔لیکن میک اپ زیادہ تھا میں نقلی پلکوں کی وجہ سے دیکھ نہیں سکا اچھی طرح۔''

''رنگ۔۔۔؟۔۔۔''

''گورا۔۔۔گائے کے دہی جیسا۔''

اب آنسو اس کی گالوں پر بلا تکلف گرنے لگے۔

''اور وہ۔۔۔''

''وہ کون۔۔۔؟۔۔۔''

تھوڑی دیر کے لیے میں بھول گیا تھا کہ سیمی آفتاب سے محبت کرتی ہے۔

''دولہا؟۔۔۔آفتاب؟''

''ٹھیک تھا۔۔۔جیسے دولہا ہوتے ہیں کمخواب کی شیروانی، ملتانی کھسہ، سر پر سرحدی پٹکا۔۔۔سہرا۔۔۔ہار۔۔۔''

''یہ نہیں۔۔۔یہ نہیں۔۔۔بتاؤ قیوم وہ خوش تھا، خوش نظر آ رہا تھا۔۔۔؟ اسے خوش ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔۔۔مجھ سے بچھڑنے پر کم از کم اسے خوش تو نہیں ہونا چاہیئے۔۔۔ہے نا؟''

میں نے سیمی کو خوشنودی کے لیے کہا۔۔۔''نہیں بابا تم سے کس نے کہا وہ

خوش تھا۔۔۔۔۔مجھے تو وہ کچھ اداس نظر آیا۔"

اس کے خیال کے ساتھ اتنی آسانی کے ساتھ مطابقت کرنے پر وہ خالص افسروں کی طرح بگڑ گئی۔

"جھوٹ مت بولو۔۔۔خوشی کوئی اس کے چہرے پر تھوڑی ہوگی۔۔۔وہ تو اس کے دل میں ہوگی اندر یہاں۔۔۔۔"

"شاید۔۔۔"میں نے شرمندگی کے ساتھ کہا۔

اب اس نے رول کیے ہوئے بستر پر سر ٹکا دیا اور دھاری دار گدی پر اس کے تمام

بال بکھر گئے۔

"مانا اس کی بڈھی بے بے مجھ سے شادی پر رضامند نہ تھی۔لیکن کیا کچھ سال اور وہ رک نہ سکتا تھا۔۔۔کم از کم ہم دونوں ایم اے ہی اکٹھے کر لیتے۔۔۔۔ساتھ ساتھ۔۔۔لیکن اسے شوق تھا شادی کا۔۔۔اسے اپنی بچپن کی منگیتر سے محبت ہے قیوم۔۔۔تم نہیں جانتے وہ بے حد دوغلا ہے۔۔۔۔اس کی دو شخصیتیں ہیں۔۔۔مٹر کے چھلکوں کی طرح۔"

اس وقت میرا جی چاہا کہ اسے وہ ساری باتیں بتاؤں جو آفتاب نے سوئمنگ پول کرانے کی تھیں۔

"تم جو وہاں گئے تھے تو کیا کھانے پینے گئے تھے؟"میں چپ رہا۔

"لڑکیاں تاڑنے؟"اس نے پوچھا۔

"چھوڑو یار۔"

"پھر تم اتنا بھی پتہ نہ کر سکے کہ زیبا کے متعلق اس کا Reaction کیا ہے۔"

میں نے اس جلالی افسر سے جان بچانے کی خاطر کہا۔۔۔"میں نے انہیں باتیں کرتے تو نہیں دیکھا لیکن غالباً آفتاب کے ماں باپ نے زبردستی یہ لڑکی اس

کے گلے باندھی ہے۔"

"چھوڑو قیوم چھوڑو ۔۔۔۔ تم بھی مجھے فریب دینا چاہتے ہو آفتاب کی طرح ۔ وہ الو کا پٹھا بھی چاہتا ہے کہ خود تو بڑے مزے کی خوشگوار شادی شدہ زندگی گزارے اور میں یہ یقین رکھوں کہ وہ دل ہی دل میں مجھ پر مرتا ہے اس لیے ساری عمر مین شادی نہ کروں؟"

امید نے پھر سر اٹھایا۔

"نہیں تمہیں شادی ضرور کرنی چاہیئے بلکہ جلد از جلد ۔۔۔"

"مائی فٹ ۔۔۔۔ شادی! میں لعنت بھیجتی ہوں شادی پر ۔۔۔۔ میں تو امتحان نہیں

دے سکی اس کے بغیر ۔۔۔۔ میں شادی کیا کروں گی؟"

میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ سیمی کے جسم کو چھونا میرے لیے حجر اسود کو چومنے سے کم نہ تھا میرا رواں رواں رقت اور عقیدت سے بھر گیا۔ دیر تک میرا ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا رہا اس نے کوئی مزاحمت نہ کی ۔ شاید وہ اس بات ہی سے آگاہ نہ تھی کہ میرا ہاتھ اس کے کندھے پر لرز رہا ہے۔

"اس کے گھر میں چاہے کوئی رہے دل میں تم رہو گی سیمی۔"

سیمی نے لمبی آہ بھری اس کی ہنسلی کی ہڈی اور ابھر آئی۔

"جانے دو قیوم جانے دو ۔۔۔۔ دل کی پوسٹ تو میں نے پنڈی جانے سے پہلے خالی کر دی۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ پوسٹ خالی ہو چکی ہے اور یہ موقع افسر کی میز پر اپنی عرضی رکھنے کا ہے۔ میں نے ہاتھ اس کے زانوں پر رکھا۔ وہ پہلے کی طرح بے دھیانی بیٹھی رہی۔"

"سنو سیمی! ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں بتا رہا

ہوں۔۔۔آفتاب اس وقت اسی فیصد خوش ہے۔۔۔بیس فیصد خوشی اسے رفتہ رفتہ مل جائے گی۔۔۔کیونکہ وہ زیادہ شدید نہیں ہے۔۔۔مسئلہ تمہارا ہے تمہیں خوش رہنے کے لیے کوئی بندوبست کرنا چاہیئے''

وہ کسی قسم کے بندوبست کے لیے تیار نہ تھی۔

''وہ اس قدر بے رحم نہیں ہو سکتا۔۔۔وہ ایسا بے وفا نہیں ہے قیوم۔۔۔ہم دونوں تو ایک دوسرے کے علاوہ کسی کے ساتھ خوش رہ ہی نہیں سکتے تھے۔۔۔''

پھر یہ کیسے ہوا کہ وہ تو زیبا کو پا کر خوش ہو گیا اور میں۔۔۔اور میرے لیے خوشی ایک مسئلہ بن گئی۔۔۔کیسے؟

''تمہیں بھی اپنے لیے خوشی کی کوئی راہ تلاش کرنی ہو گی سیمی۔۔۔پیچھے رہ جانے

والوں کے لیے اور کوئی صورت نہیں ہوتی!''

وہ محبت کے ترازو میں برابر کا تلنا چاہتی تھی اور دوسری طرف کے پلڑے میں مجھے ایسے کوئی بٹہ رکھنا نہیں آتا تھا جس کی وجہ سے اس کا توازن ٹھیک ہو جاتا۔اگر میں آفتاب کو خوش ظاہر کرتا تو وہ تنفر کی صورت میں بے قابو ہو جاتی اگر میں اسے اداس ظاہر کرتا تو بے یقینی نا امیدی اور شدید غم تلے دب کر آہیں بھرنے لگتی، محبت کا آرا اوپر تلے برابر اس کے تختے کاٹتا چلا جا رہا تھا۔

میں سوشیالوجی کے طالب علم کی طرح سوچنے لگا کہ جب انسان نے سوسائیٹی کو تشکیل دیا ہو گا تو یہ ضرورت محسوس کی ہو گی کہ فرد علیحدہ علیحدہ مطمئن زندگی بسر نہیں کر سکتے۔باہمی ہمدردی میل جول اور ضروریات نے معاشرہ کو جنم دیا ہو گا۔لیکن رفتہ رفتہ سوسائیٹی اتنی پیچ در پیچ ہو گئی کہ باہمی میل جول، ہمدردی اور ضرورت نے تہذیب کے جذباتی انتشار کا بنیادی پتھر رکھا۔جس محبت کے تصور کے بغیر معاشرے کی تشکیل ممکن نہ تھی۔شاید اسی محبت کو مبالغہ پسند انسان نے خدا ہی سمجھ لیا اور انسان

دوستی کو انسانیت کی معراج ٹھہرایا۔ پھر یہی محبت جگہ جگہ نفرت حقارت اور غصے سے زیادہ لوگوں کی زندگیاں سلب کرنے لگی۔ محبت کی خاطر قتل ہونے لگے۔۔۔۔ خود کشی وجود میں آئی۔۔۔۔ سوسائیٹی اغوا سے شنجون سے متعارف ہوئی۔ رفتہ رفتہ محبت ہی سوسائیٹی کا ایک بڑا روگ بن گئی اس جن کو ناپ کی باتل میں بند رکھنا معاشرے کے لیے ممکن نہ رہا اب محبت کے وجود یا عدم وجود پر ادب پیدا ہونے لگا۔۔۔۔ بچوں کی سائیکلوجی جنم لینے لگی۔ محبت کے حصول پر مقدمے ہونے لگے۔ ساس بن کر ماں ڈائین کا روپ دھارنے لگی۔ معاشرے میں محبت کے خمیر کی وجہ سے کئی قسم کا ناگوار Bactria پیدا ہوا۔

نفرت کا سیدھا سادا شیطانی روپ ہے۔ محبت سفید لباس میں ملبوس عمر عیار ہے۔ ہمیشہ دوراہوں پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اس کی راہ پر ہر جگہ راستہ دکھانے کو صلیب کا نشان گڑا ہوتا ہے۔ محبتی جھمیلوں میں کبھی فیصلہ کن سزا نہیں ہوتی ہمیشہ عمر قید ہوتی ہے۔ جس معاشرے نے محبت کو علم بنا کر آگے قدم رکھا وہ اندر ہی اندر اس کے انتظار سے بری طرح متاثر بھی ہوتی چلی گئی۔ جائز و ناجائز محبت کے کچھ ٹریفک رولز بنائے لیکن ہائی سپیڈ معاشرے میں ایسے سپیڈ بریکر کسی کام کے نہیں ہوتے کیونکہ محبت کا خمیر ہی ایسا ہے...... زیادہ خمیر لگ جائے تو بھی سوسائٹی پھول جاتی ہے۔ کم رہ جائے تو بھی پیپڑی کی طرح تڑخ جاتی ہے۔

شکست و ریخت۔

بدبختی و سوختہ سامانی۔

آج تک سوسائٹی جرائم کی بیخ کنی پر اپنی تمام قوت استعمال کرتی رہی ہے۔ اس نے اندازہ نہیں لگایا کہ کتنے گھروں میں کتنے مسلکوں میں سارا نقص۔ ہی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ سوسائٹی کا بنیادی تضاد ہی ہے کہ ابھی تک وہ محبت کا علم اٹھائے ہوئے ہے۔ حالانکہ وہ اس کے ہاتھوں توفیق بھر تکلیف اٹھا چکی ہے۔ جب تک یہ

جن دوبارہ بوتل میں بند نہیں ہو جاتا اور اس کے ٹریفک رولز مقرر نہیں ہوتے' تب تک شانتی ممکن نہیں۔ کیونکہ محبت کا مزاج ہوا کی طرح ہے کہیں ٹکتا نہیں اور معاشرے کو کسی ٹھوس چیز کی ضرورت ہے۔

محبت میں بیک وقت توڑنے اور جوڑنے کی صلاحیت ہے۔ سوسائٹی کا رنگ اسی کی بدولت نکھرتا ہے اور اسی جذبے کی وجہ سے شدید کالک بھی منہ پر لگتی ہے میں اور سیمی اگر اب بھی ہم جماعت ہوتے تو محبت کے اس پہلو پر کئی گھنٹے بحث کرتے رہتے پھر وہ ابن خلدون' ڈرخائم' کومٹ اور مارکس کے نکتہ نظر پیش کر کے بحث کو بڑا Objective اور خوب صورت بنا دیتی ہم کسی نئی تھیوڑی کے سر پر پہنچ کر اپنے آپ کو بہت ذہین تصور کرنے پر مجبور ہو جاتے...... ایسی بحثیں جو عام طور پر ہم کیفے ٹریا میں کیا کرتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے
سے کس قدر دور لے جایا کرتی تھیں اور ان ہی کی وجہ سے ہم نے کتنے فاصلے طے کیے تھے۔ لیکن اس وقت وہ میری ہم جماعت نہ تھی۔ وہ مائی توبہ توبہ کی پتلی تھی۔

میرے گاؤں چندرا میں ایک پرانا بھٹہ تھا۔ اینٹیں بنانے والے یہاں سے کبھی کے جا چکے تھے۔ لیکن جا بجا ٹوٹی اینٹوں کے چھٹے' لال گیروے رنگ کی پکی مٹی اور گہری کھائیاں تھیں جن سے مٹی کھود کھود کر اینٹیں بنائی جاتی ہوں گی۔ برسات میں ان کھائیوں میں برساتی پانی بہہ کر اکٹھا ہو جایا کرتا۔ پرانے بھٹے کے پاس مائی توبہ توبہ کی جھگی تھی۔ پتہ نہیں اس کا اصلی نام کیا تھا۔ لیکن اب سارے گاؤں میں اسے سب مائی توبہ توبہ کہتے تھے۔ سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ وہ کالا علم جانتی ہے۔ لیکن دو ایک بار میری موجودگی میں کسی نے اس سے استفسار کیا تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر توبہ توبہ کرنے لگی۔ ایک روز میں شام گئے گھر نہ لوٹ سکا۔ باہر امرود کے باغ میں کچے پکے امرود توڑتے مجھے دیر ہو گئی۔ پتہ نہیں میرے باقی ساتھی کیا ہوئے لیکن

جس وقت میں باغ سے باہر نکلا تو ہلکی ہلکی بوندا بوندی ہو رہی تھی۔ پرانے بھٹے تک پہنچتے پہنچتے بارش کا یہ عالم تھا کہ مجھے لگا۔ پانی کا ریلا مجھے زمین مین میٹھا چاہتا ہے۔ اس روز میں نے مائی توبہ توبہ کی جھگی میں پناہ لی۔

جس وقت جھگی میں داخل ہوا۔ مائی توبہ توبہ نے منہ پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ میں پھوس کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر سہم گیا۔ مائی اس وقت ایک آٹے کا پتلا بنا رہی تھی۔ اس نے بڑی توجہ سے ایک گھٹّیا آٹے کا اندھا بونا بنایا۔ پھر چولہے میں من کی چھٹیوں کی آگ جلائی۔ اب وہ اس آٹے کے پتلے میں سویاں کھبونے لگی۔ ہر سوئی پتلے میں فٹ کرنے کے بدوہ آنکھیں پھراتی اور دیر تک چھو چھو کرتی جس وقت اس نے اس آٹیکے پتلے کو آگ میں ڈالا۔ بجلی اس زور سے کڑکی کہ بھٹے سے لے کر امرود کے باغ تک ساری دھرتی سفید ہو گئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھول کر بھاگنا چاہا۔ لیکن اس وقت کسی نے پیچھے سے میرا کرتا پکڑ کر کہا...... ''دیکھ اگر کسی سے بات کی تو سویاں چبھو کر تجھے بھی آگ میں جھونک دوں گی...... کسی کو بتایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔''

اس وقت میرے سامنے میری ہم جماعت نہیں تھی جس سے میں سوشیالوجی کی بحثیں کیا کرتا تھا۔ بلکہ وہ مائی توبہ توبہ کی پتلی تھی۔ جس میں پتہ نہیں کتنی ان گنت سویاں چبھی ہوئی تھں اا ور وہ بھٹی میں اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو قیوم؟''

آفتاب کیسا آدمی ہے؟''

''مجھے کیا پتہ؟''

''وہ تمہارا روم میٹ تھا''

مین نے نثری انداز میں بولنا شروع کر دیا ''وہ اکتوبر کے مہینے کی پیداوار ہے اس ناطے سے وہ Libra ہے ایسے لوگوں میں ایک قدرتی ہوتا ہے۔''

''اور......اور......''

''تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا ہے۔''

'' یہ تم مجھے کیا بتا رہے ہو...... یہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔''

''جو کچھ تم جانتی ہو' میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔''

'' اس نے کیسے وہ سب کچھ بھلا دیا میری محبت...... ہمارا......میل جول وہ سب کچھ''

''یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔''

'' پھر یہ سب۔ کیا ہے؟ ...... یہ شادی...... یہ زیبا...... یہ ماں باپ کی فرمانبرداری...... یہ سب کچھ!''

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

میں اسے آفتاب کی ایسی کوئی بات بتانا نہ چاہتا تھا جو اس کی محبت کو اور پختہ کرتی اور پھر بھی میں اسے تسلی دینے پر مجبور تھا۔

'' وہ کون ہے؟ ......کیا ہے؟......کیسا آدمی ہے؟ ......خدا کے لیے تم تو اتنے اچھے تجزیے کیا کرتے تھے......بتاؤ ناں......اس کی اصلیت کیا ہے؟''

میں نے سر کھجلایا اور دانشور بن کر بولا...... '' دنیا میں رنگ رنگ کے لوگ ہیں ان کی سٹڈی کے الگ الگ علوم ہیں......تمہارا کیا خیال ہے کہ......کہ آفتاب۔''

''تبت کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کے گرد رنگ کا ایک ہالا ہوتا ہے اور یہ ہالا اس کی اصلی سائیکی کا indez ہوتا ہے۔ کچھ لال ہین کچھ پیلے کچھ سبز......

جن کے گرد نیلا ہالا ہوتا ہے وہ لوگ ہمدردی کرنے والے ہوتے ہیں۔سرخ رنگ والے شدید ہوتے ہیں......سوسائٹی سے یوں بھڑ جاتے ہیں جیسے ماتا دور کا سرخ مینٹل سانڈ کے سینگوں سے الجھتا ہے۔ جذبے کے غلام جنس کے غلام یہ لوگ توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔تمہارے آفتاب کا ہالا بادل کے رنگ کا ہے......اس پر سورج

کی شعاعیں پڑیں۔

تو اس کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ زمین کا عکس پڑے تو مٹی رنگا ہو جاتا ہے۔ تمہارے آفتاب کے کئی جلوے ہیں کئی رنگ ہیں۔''

''ہاں...... ہاں...... اب اس بادل پر زیبا کا رنگ چڑھنے لگے گا۔''

میں اسے جان سے نہ مارنا چاہتا تھا۔

''وہ بہت خوبصورت ہے......'' سیمی نے میری طرف اس امید سے دیکھا کہ میں اس جملے کی تردید کر دوں۔

''ہاں خوبصورت ہے لیکن بے رنگ ہے۔''

''اس کی بیوی ہے...... وہ اس کی محبت کی زیادہ مستحق ہے...... ہے نا۔ ہے نا بولو؟

''

خدا جانے محبت کا دراصل مستحق کون ہوتا ہے؟ میں نے دیکھا ہے کہ بگڑے دل رئیس جنہیں بہت محبت ملتی ہے عموماً اسی محبت کی مٹھاس کا مزہ زائل کرنے کے لیے اپنی پشتوں کی

عزت اتروانے طوائفوں کے پاس جاتے ہیں...... شہر کے مشہور دانشور ایسی عورتوں کے پیروں پر نماز پڑھتے ہیں۔ جو انہیں کتے کے باسن میں کھلاتی ہیں۔ انسان کا دل ہمیشہ محبت کا متلاشی نہیں ہوتا۔ جب محبت کی گیس سے اس کا غبارہ پھٹنے لگتا ہے تو اس کی آرزو ہوتی ہے کہ کوئی سوئی ہلکا سا چھید کر کے اس کی انا کو کم کر دے جو لوگ ہماری عزت اتارتے ہیں اور ے درے دفع دور رکھتے ہیں وہ ہماری انا کو کترنے والی قینچی ہوتے ہیں۔ انا کا سائز بہت بڑا ہو جاتا ہے تو ایسی قینچی کہیں نہ کہیں سے پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان ہمیشہ محبت کی فضا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیشہ فرعون بنے رہنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ وہ خدا سے لے کر معمولی بد تک ہر سٹیج پر اترتا چڑھتا رہتا ہے۔ جیسے سات سروں پر انگلیاں پھرتی ہیں۔ جب مختلف

طریقوں سے کئی بار یہ پھرت ہو چکتی ہے تو ایک انسان کا گیت مکمل ہوتا ہے۔اسی لیے زندگی کے لیے محبت بھی ضروری ہے اور نفرت بھی...... جب نفرت پاتال میں لے اترتی ہے۔تو پھر کہیں سے محت اوپر اٹھاتی ہے اتنا اٹھائے لیے جاتی ہے کہ آدمی غبارہ بن کر آسمانوں کو چھونے لگتا ہے جب یہ غبارہ اور اوپر نہیں جا سکتا لیکن اس کی آرزو کم نہیں ہوتی تو کہیں سے حقارت.........نضرت کی سوئی گیس کم کرنے کو آنکلتی ہے یہ عمل مسلسل ہے.........زندگی کے ساتھ ساتھ ہے.........خدا سے لے کر عبد تک عمل فرشتے سے لے کر شیطان تک کی منزل۔

ان مٹ سے لے کر ناپائیدار تک

''تم کیا سوچتے ہو۔۔۔کہاں چلے جاتے ہو تم قیوم۔۔۔۔تم کو اپنی پڑھائی کا اس قدر فکر کیوں ہے؟''

میں چپ رہا۔

''مجھے بتاؤ۔۔۔۔سمجھاؤ مجھے خدا کے لیے۔۔۔۔جس طرح تم مجھے ڈرفائم کی تھوری سمجھایا کرتے تھے خودکشی کی۔۔۔۔بتاؤ قیوم محبت کہاں ملتی ہے؟۔۔۔۔کن کو ملتی ہے

۔۔۔۔۔؟''

میں اسے کیا بتاتا۔

میں تو خود بچپن سے محبت کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا۔مجھے کیا معلوم تھا کہ محبت کہاں ملتی ہے کن کو ملتی ہے اور کن وجوہات کی بنا پر ملتی ہے لیکن جب کبھی وہ مجھ سے بات کرنے کی توقع رکھتی میں بولتا جاتا۔

''محبت کا تحفہ بیسی عموماً دو قسم کے لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔۔۔۔ایک وہ فرعون صفت لوگ جو اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتے جو چلتے نہیں اچھلتے ہیں ان کو انا کو پرقینچ کرنے کے لیے ان کی زندگی میں کوئی شخص محبت کا گلدستہ لے کر داخل ہوتا ہے

گلدستہ وصول کرتے وقت فرعون شکل لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کانٹے بھی ہیں اور چیونٹیاں بھی۔۔۔۔عموماً ان ہی چیونٹیوں کے ہاتھوں بڑے بڑے ہاتھی جاب بحق ہو جاتے ہیں۔"

"میں تمہاری بات سمجھی نہیں قیوم۔۔۔۔یا شاید آج میرا دماغ درست نہیں"

"ایک وہ لوگ جو خدا سے بھی نہیں ڈرتے ان کو انسان بنانے کے لیے۔۔۔۔عہد بنانے کے لیے محبت عطا ہوتی ہے ان کی حیثیت سمجھانے کے لیے۔ان کا قد عام انسانوں جتنا کرنے کے لیے۔۔۔۔یا پھر محبت ان لوگوں کو ملتی ہے جو ہرنے کی آرزو میں جیتے ہیں جان بلب ہوتے ہیں ان کے لیے محبت کا تریاق آتا ہے غیب سے۔ یکدم ان مردہ لاشوں میں زندگی کے آثار اجاگر ہوتے ہیں وہ درختوں کو پرندوں کو چاند ستاروں کو ازسرنو دیکھنا شروع کرتے ہیں بچے کی حیرت کے ساتھ موسم ان پر اثر انداز ہوتے ہیں ایک بار پھر۔۔۔۔"

"کیا کیا کیا؟۔"

"سنو سیمی سنو۔۔۔۔محبت مارتی بھی ہے اور زندہ بھی کرتی ہے۔۔۔۔پھنکارتی انا کو مارنے کے لیے بھی محبت کا ذہر ہے اور قریب المرگ زندگی کو زندہ کرنے کے لیے بھی محبت

ہی کا تریاق ہے۔"

اب وہ چِڑ گئی

"تم سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔تم بھی ایویں ہی ہو۔۔۔۔واہیات۔۔۔۔صرف کچے کچے فلاسفروں بالکل ڈاکٹر سہیل کی کاربن کاپی۔"

"تمہیں تسلی کیسے ہوگی۔"

"محبت سے صرف محبت سے"

میں ہنس دیا۔

''اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔''

میں نے دکھی سے کہا۔۔۔۔تمہیں محبت نہیں چاہیئے سیمی۔۔۔۔تمہیں صرف آفتاب درکار ہے۔۔۔۔سب کا یہی حال ہے۔۔۔۔سب کا سب کو محبت چاہیئے لیکن صرف اس شخص کی جسے اس کا اپنا دل شدت سے چاہتا ہے۔۔۔۔باقی سب محبتیں کیلے کا چھلکا ہیں وافر واہیات۔۔۔۔غیر ضروری۔۔۔۔ایویں۔

''تم نے کبھی محبت کی ہو۔۔۔۔تو تمہیں پتہ ہو آدمی کس کرب سے نکلتا ہے تم کو تو ہر وقت پڑھائی کی پڑی رہتی ہے۔۔۔۔اپنی تھیوریاں بنانے میں لگے رہتے ہو پروفیسر سہیل کے ساتھ سوشلزم کی بحث کرنے میں وقت گزرتا ہے تمہارا۔۔۔۔جاؤ جا کر مارکس پڑھو۔۔۔۔اینگلز پر سر کھپاؤ۔۔۔۔تم کو کیا پتہ کہ ایک ایسا وقت انسان پر آتا ہے جب وہ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے باوجود خودکشی کر لیتا ہے۔۔۔۔ تم کو کیا پتہ۔۔۔۔سب کچھ معاشرہ نہیں ہوتا۔معاشیات سے انسان کی فلاح مکمل طور پر بندھی ہوئی نہیں ہے۔۔۔۔تمہیں کیا پتہ۔''

''مجھے پتہ ہے۔۔۔۔پتہ ہے۔'' میں چلایا

اس نے اپنا پرس اٹھایا لکڑی کی ہیل والے جوتے تلاش کیے اور اٹھ گئی

''تمہیں میری باتے سننا ہو گی۔۔۔۔میں نے بھی محبت کی ہے کسی سے۔۔۔۔ شدت کے ساتھ۔۔۔۔آج تمہیں میری طرف کی کہانی بھی سننا پڑے گی سیمی۔''

''سنوں گی قیوم۔۔۔۔غرور سنوں گی لیکن آج نہیں۔۔۔۔دیکھو ناں آج میرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی۔۔۔۔''صرف ایک جملہ۔''

''آج نہیں قیوم پتہ ہے آج ہی تو اس کی شادی ہوئی ہے۔۔۔۔آج ہی تو لینڈ سلائیڈ ہوا ہے زبردست قسم کا۔''

وہ چپ چاپ باہر نکل گئی۔صرف اس کا چھوٹا سا پھولدار رومال الانی چارپائی پر

پڑا رہا۔

اسے میرے اظہار محبت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔۔۔ میں اسے کیسے بتاتا؟ کہ میرے سارے فلسفے میرے تمام تجزیے پروفیسر سہیل کے ساتھ ہونے والے مباحثے اس ایک نا آسودہ جذبے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

کیا میں جنسی محرومی کا شکار تھا۔ کیا میں صرف Frustrated تھا؟

کیا میری ذہانت ان محرومیوں کی وجہ سے سان پر چڑھی تھی۔؟

سیمی کے جانے کے بعد فوراً کتابوں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے کٹے بال پھولدار رومال۔۔۔ کئی چیزیں! جیسے شہد کی مکھیاں میرے تعاقب میں تھیں اور میں ان سے بھاگ کر کہیں جا نہ سکتا تھا کئی بار باتیں کرتے کرتے وہ اپنی بائیں گال کے تل کو جڑ سے اکھاڑنے کی ایسی کوشش کرتی کہ مجھے اس کی کیوٹکس لگے ناخنوں سے نفرت ہو جاتی۔۔۔ سیمی جا چکی تھی صرف اس کی خوشبو باقی تھی۔۔۔ تار پر سوکھنے والے کپڑوں کی طرح چارپائی پر رومال پڑا تھا اور اس کے جانے والی کی ذات کا کمپیوٹر چل رہا تھا۔

میں نے پہلے تو اس رومال کے باوجود پڑھنے کی کوشش کی پھر مجھے خیال آیا کہ جب تک وہ ایک لاوارث بچے کی طرح چارپائی پر بلکتا رہے گا میں توجہ سے نہ پڑھ سکوں گا۔ میں نے رومال اٹھایا سونگھا اس کی تہیں بالکل ویسے جمائیں جیسے پہلے تھیں پھر اسے پاس رکھ کر پڑھنے لگا لیکن اب رومال بلی کے بچے کی طرح بڑا جاندار ہو گیا تھا۔ وہ پنکھے کی ہوا میں پھول رہا تھا۔ شکلیں بدل رہا تھا فضا میں اپنی خوشبو کو آنسو گیس کی طرح پھیلائے جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے بار بار میری آنکھیں نمناک ہو جاتی تھیں اور جب میں آنکھیں پونچھ کر دوبارہ اسے میز پر رکھتا تو وہ پہلے سے زیادہ نڈر اور کھلنڈرا ہو جاتا۔

اس رومال کو ٹھکانے لگانے کے لیے میں کواڈرینگل سے نکل کر انارکلی کی طرف

چلا گیا۔ دن کے وقت انارکلی کا کچھ اور رنگ ہوتا ہے۔

گاہکوں کی سرگرمیاں، دوکانداروں کی گرم جوشیاں اور بکاؤ مال کی وافر نمائش کچھ دیکھنے نہیں دیتی کچھ کار و الے سائیکل والے، پیدل، سکوٹر سوار، بازار میں خرید و فروخت کے لیے نہیں آتے فقط اضافی آمد و رفت بن کر آتے ہیں انہیں اس راستے کہیں اور مثلاً رنگ محل یا شاہ عالمی جانا ہوتا ہے اس مجمع سے بھیڑ بھاڑ میں اور اضافہ ہوتا ہے کچھ ان لونڈوں کا ٹریفک ہوتا ہے جن کا خرید و فروخت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ محض دوکانوں پر چائے یا بوتلیں لے جانے یا واپس کرنے میں مصروف ہوتے ہیں ان کے کندھوں پر مکسڈ چائے کی پیالیاں، نان چھولے، کباب یا بوتلیں ہوتی ہیں۔۔۔۔ طرارے بھرتے لوگوں میں راستہ بناتے وہ بھونرے سے نکل جاتے ہیں لیکن چونکہ وہ ٹریفک کے بہاؤ کے ساتھ نہیں ہوتے اس لیے ان سے بھی آمد و رفت کا تار ٹوٹتا ہے پھر کالج کے طالب علموں کی وہ ٹولیاں بھی ہوتی ہیں جو لڑکیاں تاڑنے دوکانوں کے تھڑوں کے پاس کھڑے ہوتے ہیں ان کا بھی براہ راست بازار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بڑے پتھروں کی طرح نظروں سے بازار کے بہاؤ کو روک لیتے ہیں اس کے علاوہ دوکانداروں کے بچے رشتہ دار اور بوڑھے بازار میں ملنے کی غرض سے آتے ہیں ان کا بھی خریداری سے تو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی وجہ سے انارکلی کا راستہ تنگ پڑ جاتا ہے ٹریفک رک رک جاتا ہے اور انارکلی کی شکل داتا دربار کے عرس جیسی ہو جاتی ہے۔

میں رومال کو انارکلی کے اس سرے سے لے کر شاہ عالمی تک بہلانے لے گیا۔ لیکن پتہ نہیں وہ کیوں آنسوؤں سے بھیگتا جا رہا تھا؟ رات کے پچھلے پہر امتحانوں سے قریب سونی انارکلی میں بلا تکلف روتے جانے میں کوئی قباحت نہ تھی دوکانوں پر جستی پھاٹک چڑھے تھے اور ان کے دونوں طرف دوہرے دوہرے تالے تھے۔۔ ۔۔ لوگ تھڑوں پر سوئے ہوئے تھے۔۔۔ ٹریفک اب بھی تھا۔۔۔ لیکن اتنی

رات گئے اکا دوکا آنے والوں کو پروا نہ تھی کہ کوئی لیڈیز رومال سے آنکھیں پونچھتا کہاجارہاہے۔

آج رات سیمی نے میرے دل کے بازار سے کچھ خریدے بغیر اس میں ساری ٹریفک بند کر دیا تھا۔۔۔۔ جیسے اس نے اپنا تری ٹرز گلی کے ناکے پر لا کھڑا کیا۔ اب پچھلی گاڑیاں ہارن بجا رہی تھیں۔ پی پی پاں پاں کر رہی تھیں کچھ بے چین کاروں سے اتر اتر کر اس کھڑے ملٹری کے تھری ٹز کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ گلی کے دہانے پر جما کھڑا تھا۔۔۔ اس کی بریکیں فیل ہوگئی تھیں سلف جواب دے گیا تھا۔

سیمی اس رومال کی صورت میں میرے اندر ایک تھری ٹز کھڑا کر گئی تھی میں اس رومال کے ہوتے ہوئے نارمل آمدو رفت کا حامل نہ ہوسکتا تھا۔ ہوسٹل پہنچ کر میں نے پہلے سے تکیے تلے رکھا پھر میز کی دراز میں ابن خلدون کی کتاب کے بائیسویں صفحے کے اندر چھپایا ابھی میں تین صفحے بھی پڑھنے نہ پایا تھا کہ میں نے اسے وہاں سے نکال کر اپنی جیب تننے لگی تو میں نے اسے سوٹ کیس میں بند کر دیا۔

پہلا بوسہ، پہلا تحفہ۔۔۔ پہلی مرتبہ اقرار محبت میں گرمیوں کی اولین بارش جیسی کیفیت ہوتی ہے سارے میں مٹی کی سوندھی خوشبو پھیل جاتی ہے۔

حالانکہ یہ رومال نہ تحفہ تھا نہ بوسہ نہ اقرار محبت۔۔۔۔ پھر بھی سیمی سے وابستہ پہلی چیز جو میرے ہاتھ آئی تھی کچھ دیر بعد میں نے رومال کو سٹ کیس سے بھی نکال لیا۔۔ اچانک وہ بہت غیر محفوظ ہوگیا تھا۔ اس کے بعد پڑھائی، رومال اور میں آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔۔۔ میں ہر پانچ منٹ کے بعد اس کی جگہ تبدیل کرنے لگا۔ ۔۔۔ کبھی اس کی باری مفلر تلے آتی۔۔۔ کبھی میں اسے بش سرٹوں کے اوپر رکھتا۔ ۔۔۔ یہاں سے نکال کر پتلون کی اندرونی تہہ اس کا پڑاؤ بنتی۔۔۔ آخر میں بہت سوچنے کے بعد میں نے اسے سوٹ کیس کے نیچے بچھے ہوئے اخبار تلے بچھا کر سوٹ کیس کو تالا لگا دیا۔

بچپن میں ہمارے گاؤں میں اسی طرح میرے چچا ایک نیا سائیکل لے کر آئے تھے۔۔۔ابھی اس کے ڈنڈوں پر خاکی کاغذ چڑھا تھا اور پچھلے مڈگاڈ پر لگا ہوا تالا بڑی مشکل سے کھلتا تھا۔۔۔چچا کی سائیکل نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی سائیکل پر چڑھنا میرے مقدر میں نہ تھا میں صرف اسے صاف کر کے باہر والی حویلی میں کھڑا کر دیتا تھا چچا کے اٹھنے سے بہت پہلے میں اسے ہتی والے نلکے کے پاس لے جاتا سائیکل صاف کرنے کا سارا سامان میرے پاس ہوتا پرانے ٹوتھ برش، گریس کا ڈبہ صاف اور گندے چیتھڑے، ڈھبریاں کسنے کے پیچ کس، ہتھوڑی، موم۔۔۔میں نے سائیکل صاف کرنے کے لیے جو سامان اکٹھا کر رکھا تھا وہ کار کی سروس کے لیے کافی ہوتا۔ایک بار سائیکل صاف ہو جاتی تو پھر کبھی آنگن میں کبھی گھڑونجی کے پاس کبھی برآمدے میں اس کے پارک کرنے کی مشکل پیش آتی جس طرح ماڈرن لڑکیاں دھوپ سے بچتی ہیں اور اپنی جلد کا خیال رکھتی ہیں۔۔۔میں سائیکل کے پینٹ کے لیے فکر کرتا رہتا۔

پھر چچا اٹھتے باہر کی حویلی سے سائیکل اٹھاتے۔کچی مٹی سے بھری سڑکوں پر اونچی نیچی منڈیروں پر کھلیانوں میں بنجر گزرگاہوں پر ہول کے کانٹوں سے بھری پٹڑیوں میں نہر کنارے والی سڑک پر یہاں وہاں جانے کہاں کہاں سائیکل لیے پھرتے۔واپسی پر جب وہ گھر لوٹتے تو سائیکل گرد کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی۔

بازار سے واپسی پر میں کافی دیر اپنے نئے ٹائم ٹیبل کے مطابق خالص انداز میں بظاہر پڑھتا رہا لیکن سندر ہی سندر کہیں سوچ کی ٹکٹکی اور لگی ہوئی تھی۔جیسے گھڑی کی بیرونی سوئیاں منٹ گھنٹے دکھاتی ہیں لیکن اندر کی گراریوں کی رفتار سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا گو میں بظاہر بیڈ لیمپ جلا کر اس روشنی میں رات کے تین بجے تک سوشیالوجی پڑھتا رہا لیکن میرے اندر بار بار آفتاب کی شادی ہوتی رہی کبھی کاروں سے بڑے

تکلف کے ساتھ اترتی عورتیں نظر آنے لگتیں۔ کبھی بیرے چائے کے ٹرے اٹھائے

نظروں میں گھوم جاتے کبھی آفتاب صاف دکھائی دیتا۔ اس کی اچکن شلوار سر سے

بندھا ہوا سنہری تاروں والا سہرا اور گلے میں پڑے ہوئے بڑے بڑے نوٹوں کے

ہار۔۔۔کس طرح وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا تھا اور کس طرح اس

نے اپنی اچکن اور ہار بیٹھنے کے بعد درست کیے تھے۔

''لڑکی کوئی نہیں آئی۔۔۔۔'' اس نے بہت آہستہ سے مجھ سے پوچھا تھا۔

پتہ نہیں وہ کس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔

آفتاب کی شادی کے پلے بیک پر میمی کی آہوں کا **مسلسل** میوزک سوپر امپوز ہو

چکا تھا کوئی بینڈ کوئی ڈھولکی کوئی گیت میرے ذہن میں نہیں ابھر رہا تھا۔ بلکہ **مسلسل**

میمی کا رونا آہستہ آہستہ بیک گراؤنڈ میوزک کی طرح ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔۔۔

۔

سوشیالوجی کی کتاب میرے سامنے کھلی تھی رات کا پچھلا پہر تھا اور م، یں ماسٹر غلا

م رسول کی طرح اڑا ہوا تھا کہ پڑھ کر دم لوں گا۔

سونے پڑھنے پریشان خواب دیکھنے کا یہ تیسرا **Phase** تھا جب دروازے پر

دستک ہوئی اور جمال داخل ہوا۔

''کون ہے؟۔۔۔۔'' میں کئی خوابوں کو توڑ کر جواب دیا۔

''جمال۔۔۔جمال رشید۔۔۔دروازہ کھولو۔۔۔۔''

جب میں نے دروازہ کھولا تو تھوڑی دیر کے لیے وہ بھی مجھے اپنی سوچ کا ہی ایک

حصہ نظر آیا۔

''کیا ہے۔۔۔۔کیا چاہیے۔۔۔۔''

جمال نے اپنے ہونٹ کاٹے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بولا

''یار امجد کا **Accident** ہو گیا۔۔۔مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔''

''کس کا۔۔۔۔۔۔کس کا۔۔۔۔۔''

''امجد کا۔''

''وہ آفتاب کی شادی سے میرے ساتھ واپس آیا۔ بیوقوف کی عقل ملاحظہ ہو، موٹر سائیکل پر پنڈی گیا راستے میں اینٹوں سے لدے ہوئے ٹرک سے اس کا موٹر سائیکل ٹکرا گیا۔۔۔۔وہیں Finished پھڑک گیا۔۔۔۔۔یار ہم سب اس کی ذہانت سے کتنا کھچتے تھے؟۔۔۔۔۔ہم سب اس کو Beat کرنے کی کتنی کوشش کرتے تھے۔۔۔۔کیا شہزادگی سے منہ کی مار گیا۔۔۔۔خدا قسم مجھے اس وقت بڑی Guilt ہو رہی ہے۔''

''یار ابھی تو وہ ہمارے ساتھ تھا۔۔۔۔آفتاب کی شادی پر۔۔۔۔کیسے۔۔۔۔کیوں؟''

''کئی بار میں نے آرزو کی تھی کہ۔۔۔۔کہ اگر وہ امتحان نہ دے تو میں فسٹ آ سکتا ہوں۔۔۔۔یار میری آرزو نے اس کی جان لے لی۔''

''احمق نہ بنو۔۔۔۔ایسی آرزو کبھی پوری تھوڑی ہوتی ہے۔۔۔۔لیکن اسے مصیبت کیا تھی کہ آدھی رات کو موٹر سائیکل پر۔۔۔۔''

''وہ فسٹ آنا چاہتا تھا۔۔۔۔کہنے لگا ہوسٹل میں میرا ٹائم ویسٹ ہوتا ہے راتوں رات پہنچ جاؤں گا۔۔۔۔صبح سے تیاری کروں گا سنجیدگی کے ساتھ۔''

وہ یہ کہتا ہی پھرکی کی جیسا گھوم کر واپس چلا گیا۔

میں واپس آ کر سوشیالوجی کی کھلی کتاب کو پڑھے بغیر دیکھنے لگا۔

ہر منزل پر پہنچنے سے پہلے عموماً راہ گیروں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔

کرسمس کی چھٹیوں سے بعد اور امتحانوں سے کچھ پہلے عموماً عجیب عجیب واقعات ہونے لگتے ہیں کرسمس کی چھٹیوں کے بعد ہی کالج میں نہیں لوٹی فائنل کے امتحانوں سے اس قدر قریب آفتاب کی شادی کا ہو جانا حادثہ تھا پھر اب سپورٹس مین امجد کی

موت!

کیا ہر امتحان سے پہلے نیچرل سلیکشن بھی ہوتی ہے؟

کیا فطرت کچھ افراد کے فیل ہو جانے سے خود ڈرتی ہے۔

کیا پاس ہو جانے کی خوشی کچھ پر پیش از وقت اثر انداز ہوتی ہے۔

ہر منزل پر پہنچنے سے پہلے امتحان گاہ میں جانے سے پہلے نفری کم ہو جانے کی آخری وجہ کیا ہے؟

آفتاب کی شادی سے بہت پہلے سیمی لاہور چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی؟

ایم اے سوشیالوجی کا امتحان دینے کے بعد میں اپنے بڑے بھائی کے پاس سانده چلا گیا۔ میرے پاس جانے کے لیے اور کوئی جگہ نہ تھی۔ میرے بڑے بھائی مختار سیکٹریٹ میں ملازم تھے اور ان کے لیے یہ رہائش گاہ دفتر سے قریب تھی۔ کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ تک ہم بسوں میں آتے اور وہاں سے چل کر سانده پہنچتے۔ راستے میں بوچڑ خانہ گندے نالے سے سیراب کھیت، گدھے اور تعفن ہر روز ملتا۔

سانده کلاں کا یہ گھر دو منزلوں پر مشتمل تھا۔ نچلی منزل میں بھائی مختار ان کی ایف اے پاس بیوی صولت اور دو بیٹے رہتے تھے۔۔۔ اوپر والی منزل کے اکلوتے کمرے میں کاسنی رضائی، سیکنڈ ہینڈ کتابیں تیل سے جلنے والے سٹور لیمپ اور میں رہتے تھے۔۔۔۔ باقی ضروریات کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی تھیں لیکن کاسنی رضائی کتابیں اور سٹور لمپ میری طرح جاندار تھے ان میں حدت تھی اور وہ اپنی گم سم زندگی بالکل میری طرح چپ چاپ بسر کرتے تھے۔

بھابھی کم گو کم آمیز اور تیوری دار عورت تھی۔ اسے خوش گپی خوش گفتاری اور ہنسوڑ بازی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اس کے چہرے پر مردنی کا ایک غلاف چڑھ گیا تھا۔ پھلبہری جیسے سفید چہرے پر براؤن تتلیوں جیسی چھائیاں پڑی ہوئی تھیں صولت بھابھی کے چہرے کے بجائے ان کے بازو اور پاؤں زیادہ جاذب نظر

تھے۔ ان کے ساتھ رہنے میں سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ وہ کام کی بات کرنے کے بعد جھٹ روپوش ہو جاتی تھیں۔

''تمہارے کپڑے دھوبی کو دے دیے تھے۔''

''اچھا جی۔''

''کھانا نعمت خانے میں دھرا ہے۔''

''اچھا جی۔''

''رات کو دیر سے آؤ گے''

''اچھا جی۔''

ہم دونوں کی گفتگو میں ہر دس قدم کے فاصلے پر خود بخود بریک لگ جاتی اس لیے رفتہ رفتہ ہم نے ایک دوسرے سے ضروری باتیں کرنا بھی چھوڑ دیں بھابھی کے دو لڑکے کرشن نگر کے کسی سکول میں پڑھنے جاتے تھے، ان کی نیکریں ڈھیلی کف گندے اور بستے ہمیشہ پھٹے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مجھے گھر سے باہر ایک پیڈل پر سائیکل چلاتے نظر آجاتے تھے پتہ نہیں وہ واقعی بھابھی صولت کی طرح کم گو تھے کہ ان کے دل میں اپنے چچا کا تہور بیٹھ گیا تھا۔ گھر پر وہ اول تو محسوس نہ ہوتے اور اگر کبھی پڑھائیوں سے فارغ ہو بھی جاتے تو انہیں ایک ہی کھیل آتی تھی برآمدے میں رکھے ہوئے ایک تخت پوش پر چڑھ کر وہ گھنٹوں ڈیڑھ فٹ نیچے فرش پر چھلانگیں لگاتے رہتے اور ہر چھلانگ کے بعد ان کو پہلے سے زیادہ حظ حاصل ہوتا۔

بھائی مختار درمیانے درجے کے ایسے افسر تھے کن کی ذہنیت کلرک کی ہوتی ہے آفس ڈاک، پالیسی، فائیل، کیس ڈی او وغیرہ ان کا روزمرہ تھا۔ وہ ایم اے پاس تھے اپنے وقت کے ذہین آدمی تھے لیکن اب نوکری ان پر مسلط ہو گئی تھی وہ نوکری کے علاوہ اور کسی چیز کے متعلق جانداری کے ساتھ سوچنے کے اہل نہ رہے تھے۔

اوپر والی منزل میں رزلٹ آنے تک میں اور میرے خیالات دست پنجہ ملا کر

رہے۔ کالج کے تمام ساتھی آخری پرچے کے بعد غائب ہو گئے۔ کبھی کبھی اچانک کسی دوکان پر کسی بس میں کوئی آشنا چہرہ مل جاتا رسمی سی گفتگو ہوتی اور پھر راہیں علیحدہ ہو جاتیں میرا معمول تھا کہ ہر روز صبح کے اخبار میں نوکریوں کی تلاش کرتا سینما پیج اور Wanted دیکھنے کے بعد میں تھک کر پلنگ پر جا لیٹتا۔

یہ برساتوں کا موسم تھا۔

بارش نہ ہوتی تو حبس ہوتا۔۔۔۔بارش ہوتی تو سلاخوں والی کھڑکی سے ہوا اور بارش اچانک آ کر پرانی کتابوں سے لدی ہوئی میز پر حملہ کر دیتی۔ امتحانوں کے بعد ہر موسم چاہے کوئی بھی ہو لیکن برساتوں کا موسم خاص کر فریب خیال کا موسم ہوتا ہے۔۔۔۔سیمی کرسمس کی چھٹیوں کے بعد کالج نہیں آئی تھی۔ لیکن اب خدا جانے کیوں اور کیسے ہر بارش کے ساتھ وہ اندر آ جاتی اس نے تو موسون کے ساتھ ٹھیکہ کر لیا تھا خوش آمد خوابوں سے لے کر نسیاں تک اور سیمی کے پوتے نواسے پرورش کے سے لے کر جنگل تھل بیلے میں الف پھرنے تک ہر دہشت میں پھر چکا تھا۔ کبھی کبھی اپنی جنون آمیز سوچوں کی وجہ سے میں پہروں بغیر پنکھے کے لیٹا رہتا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا گردن کے نیچے نمکین سوئیاں چبھنے لگتیں پھر اسلاخوں والی کھڑکی کی خود بخود کھل جاتی اور برسات کی پھوار کے ساتھ سیمی کمرے داخل ہو کر سب کچھ بھگو دیتی

اس روز اخبار میں ایک نوکری کا اشتہار دیکھ کر میں نے درخواست لکھی گو مجھے یقین تھا کہ میں مر رہا ہوں اور مجھے نوکری کی حاجت نہیں ہو گی، پھر بھی میں نے بھائی مختار کو خوش کرنے کے لیے ایک عرضی لکھی اور اسے رجسٹرڈ کرانے کے لیے جی پی او چلا گیا۔

یہاں ہی اچانک سیڑھیوں پر میری ملاقات آفتاب سے ہوئی۔ وہ کچھ خط لفافے اٹھائے برامدے میں آ رہا تھا۔ گو وہ کافی دیر میرا روم میٹ رہا لیکن ہم دونوں میں

دوستی تو ایک طرف بے تکلفی بھی نہ تھی یکدم وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا اور بیرونی ممالک سے آئی ہوئی ڈاک کے نیلے لفافے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔

''واہ قیوم کیا خوش نصیبی ہے میری۔ میری بروقت ملاقات ہوئی''

''کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔ آجکل۔۔۔۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں پوسٹ بکس ہے میرا۔۔۔۔ ڈاک لینے آیا تھا۔۔۔۔'' آفتاب نے فرش سے لفافے چنتے ہوئے کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں۔۔۔۔ کیا کر رہے ہو آج کل؟ نوکری، بزنس، یا عیش۔''

''تاجر کا بیٹا کیا کرے گا تاجری۔۔۔۔ ابے کا کاروبار ہے۔۔۔۔۔ ہم بھی دھنس گئے ہیں قالینوں میں۔''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دیر تک باتیں کرتا رہا۔۔۔۔۔ میں اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتا تھا لیکن آفتاب کی مسکراہٹ ہمیشہ سے ایسی رہی کہ اس کی ہر بات مان لینے کو جی چاہتا، ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے کے بعد جب میں بائیں برآمدے کی جانب بڑھا تو پھر آواز آئی۔

''قیوم۔۔۔۔'' میں رک گیا۔

آفتاب میرے پاس آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔۔۔۔ ''یار میں لندن جا رہا ہوں۔''

''بزنس مین ہو تمہارے لیے یہ عام بات ہے۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔۔۔۔ میں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں میری Immigration کے تمام کاغذات پورے ہو چکے ہیں بس اب سٹیٹ بنک کا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔''

''کب؟''

''ہفتے کو شام چار بجے کی فلائیٹ ہے۔۔۔۔ پہنچ جانا ایئر پورٹ پر میں تمہارا

انتظار کروں گا۔۔۔۔خدا حافظ"

میں آفتاب کا دوست نہیں تھا

میں ایئرپورٹ جانا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے باوجود میں وہاں گیا کیونکہ آفتاب کا میسی سے گہرا تعلق رہا تھا۔ آفتاب کو دیکھ کر کئی قسم کے جذبات سے دوچار ہونے کی مجھے عادت تھی۔ یہ تمام جذبات تکلیف دہ تھے مجھے نچوڑتے تھے، میرا سانس بند کرتے تھے پھر بھی میں ایئرپورٹ جانے سے آپنے آپ کو بچا نہ سکا۔

بڑے ہال میں داخل ہوا تو دور دور تک آفتاب کہیں موجود نہ تھا۔۔۔۔مسافر یوں کھچا کھچ بھرے تھے جیسے یہ ریل کا پلیٹ فارم ہو۔ سیلنگ فین بکثرت چل رہے تھے۔ لیکن اتنے جسموں کی گرمی کے باعث ہوا کہیں نہیں لگ رہی تھی۔ ایک گرم گرم ترکی حمام تھا۔ جس میں لوگ Baggage ٹکٹ اور سیٹ نمبت لیے آجا رہے تھے۔ لوگوں کے ٹخنوں سے لوہے کی ریڑھیاں بچا بچا کر خاکی وردی والے پورٹر آڑے ترچھے راستہ تلاش کر رہے تھے۔۔۔۔سیاہ لیدر کے صوفوں کے اردگرد سوٹ کیس ٹوکریاں وینٹی بکس اپنی اہمیت کی وجہ سے کچھ پھولے پھولے سے تھے۔ اندجنگلے کی جانب قطاروں میں کھڑے ایسے مسافر جو اکانومی میں سفر کرنیوالے تھے۔ اس کوشش میں مصروف تھے کہ انہیں ہوئی جہاز میں وہاں جگہ ملے جہاں سے فسٹ کلاس شروع ہوتا ہے اور ٹانگوں کی لگی خوب کھلی ہوتی ہے۔ غالباً کراچی جانے والے کی ایک اناؤنسمنٹ میرے آنے سے پہلے ہو چکی تھی کیوں کہ کچھ مسافر جنگلے کے پاس کھڑے الوداعی بغل گیریوں میں مشغول تھے۔ پھر ان کے ملنے والے جپھیوں کے فرائض سے سبکدوش ہو کر بغلی رستے سے باہر اس طرف جانے لگے جہاں جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو کر کھلا ایئرپورٹ نظر آتا ہے۔ میں نے سب طرف نظر دوڑائی لیکن آفتاب کا کہیں پتہ نہ تھا کہ اس کے ملنے والے بہت امیر ہیں۔ لڑکیاں

کٹے بالوں سے ہوں گی چہروں پر سکوئیر سز پیروں میں لکڑیوں کی پیل والی بدہیت جوتیاں اوران پر آہستہ آہستہ ہاتھی کے کان ہلاتے بل باٹم ۔۔۔۔ یا نیلی جینز۔

دور پار آفتاب کا پتہ نہ تھا

میں ہر گروپ کو غور سے دیکھتا رہا۔لیکن کوئی چہرہ مجھے آفتاب کا مشابہہ نظر نہ آیا۔ ائیر ہوسٹس لڑکیوں کی رودیاں ابھی کچھ دیر پہلے ہی بدل گئی تھیں وہ آتشی گلابی کرتے گہری سبز شلواریں اور پر غذ دوپٹے پہنے آپ کو پاکستانی کم اور فرانسیسی زیادہ محسوس کر رہی تھیں۔ان کے آنے جانے میں خوش اعتمادی اور اپنا پن تھا جو بھی پائیلٹ مسافروں کی جانب آتا۔سفید وردی میں اصیل معغے کی طرح ذرا ذرا سا ٹیڑھا چلتا دکھائی پڑتا۔پی آئی اے کا عملہ اس احاطے میں کتنا اہم محسوس کر رہا تھا اس کا اندازان جمعدارنیوں سے لگانا چاہیے جو بڑے بڑے ڈنڈوں کے ساتھ بندھی ہوئی رسیوں کے ساتھ جگہ بناتی موروں کی طرح تھرکتی فرش صاف کرتی پھر رہی تھیں۔

میں سیون اپ پینے کے لیے کیور شاپ کے پاس چلا گیا۔

یہاں سے سارا ہال نظر آ رہا تھا۔۔۔۔ لیکن آفتاب کا کہیں پتہ نہ تھا اور اناؤنسمنٹ ہو چکی تھی۔ بیرونی ممالک کو جانے والے مسافروں کی مائیں رو رہی تھیں بیویاں آنسو پونچھتی سوچ میں مبتلا تھیں کہ وہاں سویڈن میں تو آزادی بہت ہے۔جانے یہ خط بھی لکھیں گے کہ بھول جائیں،خرچہ بھی بھیجیں کہ نئی میم بیاہ لیں؟ باپ اپنے جھوٹے پڑتے ہوئے اعظاء کو گھسیٹ کو بہادر بننے کی کوشش میں آنسو روک رہے تھے۔ان کی آرزو تھی کہ جلدی سے الوداعی رسم ختم ہو اور وہ واپس جا کر چارپائی پر لیٹیں ۔۔۔ بھائیوں کے دلوں میں حسد تھا۔آرزو تھی تو اتنی کہ کب وہ وقت آئے جب ان کی جیب میں بھی پاسپورٹ ہو Vaccination کارڈ ہو اور وہ بھی بار بار اپنا ٹکٹ نکال کر دیکھیں اور واپس بریف کیس میں رکھیں۔چچا اپنے بھائی کی اولاد کے ساتھ اپنی اولاد کا موازنہ کر رہے تھے۔یکدم انہیں اپنی بیوی پر خدا جانے

کیوں غصہ آنے لگا تھا۔ جس نے بچوں کی اچھی پرورش نہ کی ورنہ آج وہ بھتیجے کو خدا حافظ کہنے نہ آتے بلکہ اپنے بیٹے کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کرنے کے لیے حاضر ہوتے ۔۔۔۔ ماموں برادری اداس تھی یکدم انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ ان کی بہن بوڑھی ہوگئی ہے اور بھانجے بھانجیاں جوان ہوگئے ہیں۔

ائیرپورٹ کا ہال بچھڑنے اور ملنے کی وجہ سے جذبات سے بوجھل ہو رہا تھا۔ میں شاید اور نہ ٹھہرتا اچانک دونوں کندھوں پر بیگ لٹکائے سیاہ چشمہ پہنے آفتاب جلدی جلدی چلتا ہوا داخل ہوا اس کے پیچھے زیبا تھی۔ تھوڑی صوفیہ لورین ۔۔۔ زرا سی فردوس ایکٹرس اور کچھ کچھ سکول کی استانی۔

یکدم لیدر کے تین سیاہ صوفوں پر سے بھاری بھرکم سفید عورتیں اٹھیں یک چھاتا سا دائرہ بن گیا اور آفتاب اور اس کی بیوی اس دائرے میں بوسی بازی اور بغل گیری کرنے لگے۔ وقت کم تھا ملاقاتی زیادہ تھے۔ رومال سے آنسو پونچھنے والی نوعمر لڑکیاں دوپٹوں کے کنارے بھگونے والی عورتیں، عینکوں کے پیچھے بھیگی آنکھوں والے مرد خوشی خوشی چھپی ڈالے والے لڑکے اور دائرے کے باہر سے اندر والوں کا منظر دیکھنے والے لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔

میرا ارادہ اس وقت کھسک جانے کا تھا اور شاید میں چلا بھی جاتا اگر یکدم آفتاب کی نظر مجھ پر نہ پڑ جاتی۔ وہ دائرہ توڑ کر مجھ تک آیا۔ زور سے مجھے سینے سے لگا کر بولا ۔۔۔۔ "یار دیر ہوگئی وہاں جنگلے کے پاس پہنچو۔"

baggage کارڈ بنوا کر وہ جنگلے کی دوسری طرف آگیا۔ اس وقت ہم دونوں کے درمیان پھر جنگلا حائل تھا اور اس کی بیوی وینٹی بکس اٹھائے آہستہ آہستہ لاونج کی طرف جا رہی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سسرال والوں کو رومال ہلا کر الوداع کہتی اور پھر آفتاب کی طرف دیکھ لیتی۔

ہم چپ چاپ کھڑے تھے، پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا

پتہ نہیں مجھے کیا کہنا چاہیے تھا

بالآخر میں نے کہا۔۔۔۔۔ ''یار تمہیں دیر ہوگئی ہے اب اندر چلے جاؤ۔''

''گھر پر ایک جم غفیر تھا۔۔۔۔ دراصل ہم کشمیری لوگ کوے ہوتے ہیں۔۔۔ ذرا سی بات ہو تو اکھٹے ہو جاتے ہیں ان ہی کی وجہ سے دیر ہوگئی۔کبھی لندن آؤ تو میرے پاس ٹھہرنا۔''

''ضرور۔۔۔''

''اچھا بھئی۔۔۔۔'' اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا۔

''اچھا بھئی۔۔''

''ایسے ہی ہے۔''

''ہاں بس ایسے ہی ہے۔''

''وطن بھی چھوٹ جاتا ہے آخر۔''

میں چپ رہا۔۔۔۔ مجھے وطن سے محبت کرنے کی عادت نہ تھی۔

اسی وقت اس کے ملنے والے گروپ میں سے ایک نوجوان ہمارے پاس ایا وہ جوانی کی اس سٹیج پر تھا جہاں آواز بدلتی ہے۔اور ایک جملے میں دو تین Tones بدلتیں ہیں۔

''چاچا جی۔۔۔۔ بہت دیر ہوگئی ہے ابا جی کہتے ہیں اب آپ چلے جائیں۔''

''ہاں دیر ہوگئی ہے۔۔۔۔ جا رہا ہوں۔۔۔۔ بس ابھی گیا۔''

آفتاب کھویا ہوا تھا جیسے ایئر پورٹ پر نہ ہو دھند میں راستہ تلاش کر رہا ہو۔

فاصلے پر ایک ہاتھ میں وینٹی بکس اور سورے میں رومال پکڑے زیبا افتاب کو دیکھ رہی تھی۔

''جاؤ آفتاب دیر ہوگئی ہے۔''

''ہاں۔''

''خدا حافظ۔''میں نے ہاتھ بڑھایا۔

''تم سیمی سے ملے۔۔۔۔۔؟۔۔۔''نظریں جھکا کر اس نے پوچھا۔

''تمہاری شادی کے روز ملا تھا پھر وہ پنڈی طلی گئی۔''

''کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہی ہو گی۔''

''میں کوشش کروں گا۔''

''کیسی کوشش؟۔۔۔''میں نے پوچھا۔

''کہ۔۔۔۔کہ پاکستان کبھی نہ آؤ۔۔۔شاید وقت۔۔۔فاصلے۔۔۔۔ شاید دوری۔۔۔اچھا خدا حافظ۔''

''سنو آفتاب۔۔۔سنو وہ جب بھی مجھ سے ملے گی ضرور پوچھے گی۔۔۔''پتہ نہیں یکدم میں نے کیا سوچ کر کہا۔

''کیا؟۔''

''بس پوچھے گی سب کچھ۔۔۔تمہاری بیوی سے لیکر تمہارے متعلق۔''

''مثلاً کیا۔۔۔''اب اسے بیگ وزنی لگنے لگے تھے اور وہ کندھے جھٹکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''مثلاً یہی کہ۔۔۔۔کہ آفتاب خوش تھا؟''

وہ ہنس دیا۔۔۔قالین فروش باپ کا بیٹا۔۔۔۔تازہ ٹیشو پیپر جیسی تازہ مسکراہٹ والا آفتاب۔

''قیوم آگے جانے والے پیچھے رہے ہوئے لوگوں کی طرح کبھی یاد نہیں کرتے گھر سے بندھی ہوئی گائے اور طرح یاد کرتی ہے اور تانگے میں جتا ہوا گھوڑا اور طرح جن سے یاد کرتا ہے جس کو کچھ مل جائے۔اچھا یا برا اس کی یادداشت کمزور ہونے لگتی ہے جن کو سب کچھ کھو کر اس کا ٹوٹا پھوٹا نعم البدل بھی نہ ملے ان کا حافظہ بہت تیز

ہو جاتا ہے۔اور ہر یاد بھالے کی طرح ترتی ہے۔۔۔۔دل میں۔۔۔سیمی۔۔۔۔
اور۔۔۔میری پچویشن میں بہت فرق ہے قیوم۔"

"آفتاب۔"

"کہو۔"

"تمہیں سیمی سے محبت ہے؟۔۔۔بولو۔۔۔تمہیں سیمی سے محبت ہے کہ نہیں؟وہ مجھ سے پوچھ گی۔۔۔ضرور۔۔۔"

آفتاب نے مڑکر اپنی بیوی کی طرف دیکھا رشتہ داروں کو ہاتھ ہلا کرالوداع کہا اور کندھوں پر بیگ درست کرتا ہوا بیوی کی جانب مڑ گیا۔

مجھے خدا جانے کیوں شبہ ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔

کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر باہر نکلا۔بھائی مختار کی موٹر سائیکل سٹینڈ سے لی اور ایئر پورٹ سے باہر نکل آیا۔

پتہ نہیں میں ایئر پورٹ کیوں گیا تھا۔

آفتاب میرا دوست نہیں تھا اس سے میری کوئی بے تکلفی بھیں تھی پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ پتہ نہیں کیوں اگر میں کبھی لندن گیا تو اس سے ملے بغیر نہ رہ سکوں گا۔۔۔
۔دنیا میں آفتاب سے زیادہ کوئی میرے قریب نہ تھا

کیا اس کی وجہ سیمی تھی۔

کیا ان دونوں کی محبت کی وجہ سے میں انہیں ملنے پر مجبور تھا؟۔۔۔میں سوچتا جا رہا تھا۔

چھاؤنی میں پڑنے والی شام کا سکوت میرے موٹر سائیکل کے شور سے ٹوٹ رہا تھا۔

عجیب بات ہے شام کے وقت بجلی کی روشنی کے باعث غروب آفتاب کو کوئی نہیں پہچانتا پر ہمارے اندر رہنے والے پتھر اور دھات کے زمانے والے انسان کے ساتھ

بہت کچھ بیت جاتی ہے۔۔۔تہذیب کے ہر قیدی کے اندر سانس کے ساتھ شام داخل ہوتی ہے شام چاہے سردیوں کی ہو چاہے برساتوں کی چاہے اس میں گرمی کی لو شامل ہو یا خزاں دیدہ پتوں کی سرسراہٹ۔۔۔شام کا انسان کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔۔۔کندھے پر شکار کیا ہوا بارہ سنگھا لٹکائے ہزاروں سال پہلے غار کا رہنے والا جس طرح گھر کو بھاگتا تھا۔آج بھی اپنی اپنی جان کو کندھوں پر مشکیزے کی طرح لٹکائے سب شہری لوگ پناہ کی طرف بھاگتے ہیں

سب شام سے بدکتے ہیں

اندھیرے سے ڈرتے ہیں

ان ہونی ان دیکھی ان کہی سے سب کے ہونٹ سوکھتے ہیں

شام کو بسوں کا رنگ، تانگوں کی رفتار، کاروں کا مڑنا، دوکانوں کے شوکیس، سائیکلوں کی گھنٹیاں، رکشا کے گیئر سب۔۔۔سارا شہر خطرے کی گھنٹیاں بجانے لگتا ہے بے جان عمارتیں اپنی کھڑکیاں دروازے کھولنے بند کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتی ہیں خوفزدہ لوگ گھروں سے کافی ہاؤس، کلب، سینما، ہوٹل میں پناہ لیتے ہیں۔۔۔کسی آشنا کا چہرہ، کسی محبوب کا لمس، کسی دوست کی غم آشنا آنکھیں، کسی بچے کی کھلی بانہیں، کسی عورت کے ڈھیلے قدموں کی چاپ، بریک لگنے والی آواز کسی سٹینڈ پر سائیکل کھڑی کرنے کا شور۔۔۔بلانے بٹھائے قریب ہونے کی گھڑی یہ سب کچھ اور اس سے سوا اور بہت کچھ۔۔۔

یہ سب شام کو جالنے کا عمل ہے۔۔۔کیونکہ شام رات سے زیادہ غمگین ہوتی ہے، جب اتنا اندھیرا نہیں ہوتا کہ سب کچھ چھپ جائے۔ایسے نظر نہیں آتا جیسے دن کو سب کچھ دکھائی دیتا ہے سارے منظر یوں لگتے ہیں جیسے بارش کھڑکی پر پڑ رہی ہو، اور آپ دوسری منزل کی کھڑکی سے دیکھیں کہ آپ کا رقیب نہیں ہے۔کبھی آپ کو گمان گزرے کہ یہ آپ کی محبوبہ نہیں ہو سکتی۔۔۔شام خوف اور گمان سے بھری

چلی آتی ہے۔

رات آنے سے پہلے لحاف کی کوکھ میں چھپنے سے بہت پہلے اور نیند کے گھٹنے پر سر رکھنے سے بہت پہلے سب ذی روح سورج سے بچھڑنے کا سوگ کرتے ہیں نظام شمسی کا تعلق سورج سے بہت پرانا ہے وہ دورہ کر ایسے گرم کرتا رہتا ہے کہ موسموں کے آنے جانے کی چھاپ دل پر نہیں رہتی۔ سورج غروب سے پہلے زمین کا روشن حصہ ہر روز شعلہ رو ہو کر سلگتا ہے پھر اس کے کناروں کو آگ لگ جاتی ہے جیسے ستی ہونے والی عورت کے پلو آگ پکڑ لیں کچھ سورج گنوانے کا غم کچھ آفتاب کا کسی اور خطے میں طلوع ہونے کا حسد روشن زمین کے حصے کو کانسی جیسا روپ عطا کرتا ہے۔ جب بچھڑنا رفتہ رفتہ یقینی ہو جاتا ہے تو شام بیراگنوں جیسا لباس پہن لیتی ہے جیسے بجھی ہوئی راکھ ہو۔ روشنی رہتی ہے لیکن نور نہیں رہتا اندھیرے میں سیاہی پوری طرح حلول نہیں کر پاتی۔ پھکیاں بن کر سب طرف بکھر جاتی ہے۔

یہ وقت شام کے سمے ہر شخص کے لیے بڑا اداس ہوتا ہے۔

لوگ دفتروں کو چھوڑ کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں عورتیں گھر چھوڑ کر دہلیز پھاٹکوں اور دروازوں پر جا رکتی ہیں بوڑھے سیر کا بہانہ بنا کر چار دیواری سے باہر بھاگنے چاہتے ہیں بچے پارکوں کو پلے گراؤنڈ سے بھاگ کر ماؤں کی طرف سرپٹ آتے ہیں سب وہاں نہیں رہنا چاہتے۔ جہاں وہ پہلے موجود ہوتے ہیں۔

موسموں کے تغیر سے کہیں زیادہ رات کی آمد انسان کو خوفزدہ کرتی ہے۔ انسان کی سائیکی سے نباتات کی روئیدگی سے جانداروں کی نشوونما سے جمادات کی پوشیدہ طاقت و پختگی کے ساتھ، ہواؤں سمندروں چاند ستاروں سے سورج کا رشتہ بہت پرانا ہے اگر کبھی کوئی شخص کھلی جگہ میں ہو، دریا کا کنارہ، پہاڑ کا دامن کھیتوں کی پگڈنڈی، کھلے کھلیان میں اگر وہ سورج سے بچھڑتے تو اس کی سائیکی کا یہ گونگا پن اجتماعی سائکی کے گونگے پن چھا جاتا ہے اس طرح فرد فرد کی سائیکی کا یہ گونگا پن

اجتماعی سائگی کے گونگے پن کو جنم دیتا ہے ایسی جگہوں میں جہاں لوگوں کا ہجوم ہو، جیسے سینما گھر، ہسپتال، ہوٹل ان میں بھی شام کے وقت عجیب قسم کی خاموشی ٹھہر ٹھہر کر وارد ہوتی ہے بولتے ہوئے چہرے اجتماعی گونگے پن سے نجات حاصل کرنے کے لیے بولتے چلے جاتے ہیں اور خاموش لوگ اور اندر دھنستے جاتے ہیں اور اندر۔۔۔۔۔اور اندر محفلوں میں تنہائیوں کی نسبت بڑھنے لگتی ہے۔۔۔۔جلوت خلوت کا روپ دھارتی ہے اور لوگ الگ الگ محسوسکرتے ہیں کہ ان کا یہ احساس کہ وہ مجلس میں رہ کر کس قدر تنہا ہیں بڑھتا جاتا ہے۔

مجھے شام اس پل پر ملی جو چھاؤنی کو شہر سے ملاتی ہے۔اس پل کے عقب میں سٹیڈیم تھا اور سامنے دورویہ سڑک تھی۔لاہور شہر تھا پل کے نیچے ایک ڈیزل انجن شنٹ کرنے کی حالت میں آجا رہا تھا کچھ آفتاب سے ملنے کا اثر تھا کچھ پل پر اچانک شام سے ملاقات ہوگئی پھر پل کے نیچے شنٹ کرتے ہوئے انجن نے احساس دلایا کہ میں بھی ساری باتوں نے ایک لخت مجھے اداس کر دیا۔

ان دنوں میری عادت تھی کہ جب بھی میں خودترسی کا شکار ہوتا تو ہمیشہ لارنس باغ

چلا جاتا۔

پتہ نہیں لارنس باغ کا نام بدل کر کیوں جناح باغ کر دیا گیا؟ کچھ شہر والوں کی صلاح سے ملکہ وکٹوریا کا بت اٹھوایا جا چکا ہے یار دوستوں نے سڑکوں کے نام اسلامی دیئے ہیں پرانے شہروں کو نئے ناموں سے نواز دیا تاکہ پچھلی تاریخ کا نشان نہ رہے نئی نسل پرانے مظالم کے نشانات نہ دیکھ سکے۔پھر ان کے دل میں وہ نفرت نہ جاگ سکے جو ایسے سمبل دیکھ کر عموماً جوان سال لوگوں میں جاگتی ہے اس طرح بچے اپنی تاریخ سے بھی کٹے رہیں اور روایت کا حصہ بھی نہ بن سکیں۔

میں منٹگمری ہال کی طرف سے باغ میں داخل ہوا چھوٹے سے ٹی سال کے پاس میں نے اپنی موٹر سائیکل پارک کی ایک ڈبیا سگریٹ خریدی پلٹ کر ان چیڑھ کے

درختوں پر نظر ڈالی جو پہاڑوں کو چھوڑ کر شرمندہ شرمندہ میدانوں میں آباد ہو گئے تھے۔ لیکن جن کے دل میں ابھی تک پہاڑوں کو دیکھنے کی آرزو اتنی شدید تھی کہ وہ آسمان کی طرف بہت اوپر نکل گئے تھے۔

باغوں سے محبت کرنے والے لوگ بنچوں پر سڑکوں پر گھاس کے ٹکڑوں پر موجود تھے کہیں دور ریستوران کے سپیکر سے گانے کی آواز آ رہی تھی کھلی لانوں میں اب اکا دوکا کوے موجود تھے اگر میں گھنٹہ بھر پہلے یہاں پہنچتا تو کووں کی ٹولیاں ہزاروں کی تعداد میں لانوں کے گھڑے پانیوں میں نہاتی نظر آتی۔

میں بار بار آفتاب سے ملاقات کی جگالی ذہن میں کر رہا تھا۔

سیمی کہاں تھی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ آفتاب ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ وہ پنڈی میں کس کے پاس رہتی تھی۔۔۔۔ کیا کرتی تھی سیمی جیسی لڑکیاں کس قدر بے وقوف ہوتی ہیں جو پچھتاتیں نہیں۔ عشق لاحاصل کی قلابازی کھا کر۔

ملک التجار کا بچہ!

وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟

کیا لوگوں کے دل اس لیے ہوتے ہیں کہ اپنے دل بہلانے کے لیے استعمال کیے جائیں۔

کہیں دور باغ میں ایک کوئل بار بار بلک رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ بابا ترت مراد کے مزار کو جانے والی سڑک پر جا رہا تھا۔ پھر میں نے سیمی کو دیکھا۔ کافی فاصلے سے۔۔۔ وہ کافور کے درخت تلے زانوؤں پر سر دھرے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ کافور کا درخت۔۔۔ سیمی۔۔۔ اور شام مجھے میرے خوابوں کا حصہ لگے۔۔۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا اور دست بستہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ صرف آنسو اس کی گالوں پر بہنے لگے۔ وہ چغتائی کی

تصویروں میں بنی ہوئی غزال رولڑکیوں کی طرح اس وقت عشق بلب تھی۔اس کی روح کا ہر مولی کیول زخمی تھا اور وہ عشق کے پانیوں میں یوں اترا ہی تھی جیسے شہر سیلاب کے پانیوں میں غرقاب ہوتے ہیں۔

''تم پنڈی سے کب آئیں سیمی۔''

سیمی نے جواب نہ دیا۔

''تم۔۔۔تم آفتاب کو الوداع کہنے آئی تھیں کہ۔۔۔''

وہ پہلے سے زیادہ خاموش ہوگئی یعنی جو آنسو بہہ رہے تھے وہ بھی خشک ہو گئے غالباً یہ وقت راجہ گدھ کا وقت تھا۔شاید میں نے اس مرتی ہوئی سیمی کو چھاؤنی والے پل پر سے دیکھ لیا تھا۔شاید اس متعفن لاشے کی خوشبو میرے نتھنوں میں ایئر پورٹ پر پہنچی تھی وہ اس قدر دبلی ہو چکی تھی کہ اس کی ناک کا تختہ اب چہرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتا نظر آتا تھا۔ماتھے کی ہڈی ابھر واں ہو کر آنکھوں پر چھجے کی صورت باہر نکل آئی تھی۔لپ سٹک سے آشنا ہونٹ آج پھیکے بے رنگ اور جھڑ بیری کے بیروں کی طرح جھریوں سے بھرے ہوئے تھے سارے چہرے کا ہاتھوں کا رنگ یرقان زدہ تھا۔

میں نے اس لاش کو ہاتھ لگایا۔

''تم ہو ناں قیوم۔۔۔''اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

''ہاں۔''

''میں جانتی تھی تم آؤ گے۔۔۔مجھے پتہ تھا تم ویسے نہیں ہو۔''

''تمہیں کیسے پتہ سیمی۔۔۔''میں نے حیران ہو کر کہا۔

''بس پتہ ہوتا ہے۔۔۔پتہ چلتا رہتا ہے۔''

''لیکن پھر بھی۔۔۔کیسے؟''

''مجھے پتہ تھا تم پہلے ایئر پورٹ جاؤ گے پھر یہاں آؤ گے۔''

''لیکن کیسے کیونکر؟۔۔۔کیا تم Chairvoyant ہو۔''

''میں نے۔۔۔۔ہی تو تمہیں ائرپورٹ بھیجا تھا قیوم۔۔۔۔جب تم۔۔۔۔ موٹر سائیکل پر واپس آ رہے تھے۔۔۔تو میں نے ہی تو تمہیں آواز دی تھی۔۔۔۔ بلایا تھا زور سے پوری طاقت سے۔''

''کیا۔۔کیا کہہ رہی ہو؟۔۔۔تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں۔۔۔۔۔میں۔۔ ۔۔؟''

''تمہیں شاید معلوم نہ ہو۔۔۔کہ آج آفتاب نے جب شیو کی تو اس کی ٹھوڑی پر گہرا کٹ لگ گیا تھا۔۔۔۔تم نے دیکھا نہیں اس کی ٹھوڑی پر زخم تھا جاتے وقت۔''

میں ہکا بکا رہ گیا۔۔۔جب آفتاب رخصت ہوا تو واقعی اس کی ٹھوڑی پر تازہ زخم کا نشان تھا۔

''تمہیں کیونکر پتہ چلا سیمی۔۔۔بولو بتاؤ۔''

سیمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں بازو ڈھیلے چھوڑ دیئے اور کافور کے درخت سے کمر لگا کر بیٹھ گئی۔

میں دم دبائے کتے کی طرح اس کے پاس بیٹھا تھا۔۔۔اس کی آنکھیں بند تھیں پر وہ حیات کی دنیا سے پرے بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ میں کھلی آنکھوں پاس تھا اور یہ بھی اور یہ بھی نہ جانتا تھا کہ اسے میرے آنے کی خوشی ہوئی ہے کہ غم۔۔۔۔ دراصل مجھے کبھی علم نہ ہو سکا کہ سیمی کے پاس کس وقت جانا چاہیئے اور کس وقت اس کے پاس سے اٹھ جانا بہتر ہے۔ کس وقت وہ میری صحبت سے اوب جاتی ہے اور کس وقت اسے میرے پاس رہ کر لطف ملتا ہے۔ دوطرفہ محبت میں گومگوں کی حالت نہیں ہوتی۔ وہاں ہمیشہ لوہے اور مقناطیس کا میل ہوتا ہے۔ خفگی، ناراضگی غم کوئی بھی موڈ کیوں نہ ہو ملاقات احساس خوشی کا باعث بنتی ہے۔ ایسے عاشق بن بلائے مہمان

کی طرح میزبان کے گھر میں داخل ہوتے وقت اندر باہر نہیں ہو رہے ہوتے۔

ڈرتے ڈرتے میں نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

''تمہاری اس خوبی کا کالج میں تو پتہ نہیں تھا کسی کو۔۔۔''

''تب مجھ میں یہ خوبی تھی ہی نہیں۔۔۔ یہ Senstivity مجھ میں اب پیدا ہوئی ہے آفتاب کو کھو کر۔''

''لیکن کیسے کیسے۔۔۔ کیسے تمہیں ان باتوں کی اطلاع ہوتی ہے۔''

''محبت کرنے والے دلوں پر کئی بھید کھلتے رہتے ہیں آپی آپ قیوم۔۔۔ آپی آپ۔۔۔''

یکدم اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اندر دھنسی ہوئی پرکشش آنکھیں۔

''پھر چھوڑ آئے اسے؟''

''تم۔۔۔ تم کیوں نہیں آئیں''

''آ تو گئی ہوں۔۔۔ پنڈی سے۔''

''اسے ایئر پورٹ چھوڑنے کیوں نہیں آئیں۔''

وہ کافور کے پتوں کو مٹھی میں لے کر مسلنے لگی۔

''کیا کرتی ایئر پورٹ پر آ کر۔۔۔ اس کی زنجیر اس کی بیوی کے ہاتھ میں ہوتی۔ میں تو اس کے رشتہ داروں کے سامنے رو بھی نہ سکتی کھل کر۔''

ایک موٹا سا آنسو اس کی گال پر لڑھک آیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ آنکھیں اپنے کوٹے کے تمام آنسو بہا چکی ہیں۔

''بیوی۔۔۔ آفتاب کی بیوی۔۔۔ کیسا عجیب لگتا ہے کہ۔۔۔ کہ کوئی اور آفتاب کی بیوی ہو۔۔۔ زیبا آفتاب۔۔۔ زیبا آفتاب۔''

وہ زیبا کے لفظ کو یوں دوہراتی رہی جیسے نئے کھلونے لے کر کوئی بچہ انہیں ہتھیلیوں

میں پھراتا ہے۔

میری عقل داڑھ سیکنڈ ایئر میں نکلی تھی۔۔۔ان دنوں ماموں کے گھر کے لیے یہا یک بہت بڑا مسئلہ تھا۔۔۔پچھلے مسوڑھے سوج کر چھوٹی چھوٹی گلابی پلاسٹک کی گلٹیاں بن گئے تھے ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ چیرہ دیے بغیر عقل ڈاڑھ کا نکلنا ناممکن ہے۔ میں راتوں کو لیٹے لیٹے ان سوجے ہوئے مسوڑھوں پر زبان پھیرتا گلٹیوں میں دورہوتی اس دورہلکی سی لذت ہوتی۔ پھر یہ خوف مسلط ہوجاتا کہ جب ڈاکٹر چیرہ دے گا تو کیسی دورہوگی۔بار بار آفتاب کی بیوی کا نام لے کر میں بھی ایسی ہی خوفزدہ لذت سے آشنا ہو رہی تھی۔

''وہ لندن میں اس کے ساتھ رہے گا کسی Apartment میں۔۔۔ہیں ناں قیوم۔''

میں چپ رہا۔

''اس کے گھر کی کھڑکی کے آگے تین جرنیم کے گملے ہوں گے۔دروازے کی کال بل ڈھیلی ہوگی۔جب کبھی آفتاب کال بل پر انگلی رکھے گا۔زیبا اندر سے جاکر اس کے لیے دروازہ کھولے گی۔لندن میں ٹھنڈ شروع ہوگئی ہوگی۔زیبا آفتاب کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں پکڑلے گی۔''

''جو اذیت تم نے دیکھی نہیں سہی۔۔۔اس تخیل کی مدد سے کیوں اس قدر جان لیوا کر رہی ہو۔''

اس نے میری بات کا نوٹس نہ لیا وہ کافور کے پتے مسلتی ہوئی بولے جارہی تھی۔۔

۔۔۔

''سردیوں میں۔۔۔لمبی راتوں میں ایک ہی تکیے پر سر دھرے وہ آدھی رات تک باتیں کریں گے۔۔۔اور آفتاب اسے میرے متعلق ایسے سب کچھ بتائے گا جیسے۔۔۔ میں حقیقت نہیں تھی ایک وہم تھی۔۔۔ ایک

"Infatnation"

''شاید اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہی تکیے پر سر رکھ کر بھی سوتے ہوں۔''

''لیکن کوئی بھی اس سے آدھی رات تک باتیں نہ کرتا ہو''

''سب اسی طرح سوتے ہیں سب اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔تم چپ رہو تمہاری کوئی شادی ہوئی ہے۔''

میں نے پورے دو سال اس لڑکی سے یک طرفہ محبت کی تھی۔۔۔۔ایسی یک طرفہ محبت جس میں اتنی امید بھی نہ تھی کہ میری محبت کو قبول ہی کر لیا جائے گا۔آفتاب درمیان سے نکل گیا تھا۔ہوسکتا ہے یہ کافور کے درخت کا اثر تھا یا شاید جان بلب سیمی کے جسم کی خوشبو تھی ہوسکتا ہے کہ سارے باغ میں گرمی میں جھلسا ہوا اندھیرا چھا گیا تھا۔پتہ نہیں کیا چیز تھی جس نے بغیر امید کے میرے حوصلے بلند کر دیے تھے، اس وقت میری جسمانی جذباتی اور قلبی اشتہابت بڑھ گئی تھی۔میں کبھی ہنستے چہروں سے پیار نہ کر سکا۔شاید بہتے آنسو دیکھ کر میری روح میں کسی خاص قسم کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔

میں نے اس سارے عشق کے اظہار کا ارادہ کر لیا جو ایک عرصہ سے میرے دل میں دفن تھا۔مجھے علم تھا کہ اس اظہار سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوگا۔۔۔۔۔نہ ہمدردی، نہ محبت۔وہ کسی اور نیوکلس کے گرد کسی اور محور پر گھوم رہی تھی۔۔۔۔میں جانتا تھا کہ جب تک میں اس کی خاطر اپنی ذات کو مٹاتا رہوں گا وہ میرے وجود کو برداشت کرتی رہے گی۔لیکن جہاں سے میری ذات کے تقاضے شروع ہوں گے وہ دریا کنارے کھڑی سیاہ چشمہ لگائے ڈوبنے والی کشتی کا منظر دیکھ کر ہاؤ سویٹ کہے گی اور پیٹھ موڑ لے گی۔میں اس کا کریڈٹ کارڈ تھا جسے دکھا کر بھنوا کر وہ ہمیشہ آفتاب حاصل کرتی تھی میں ہنر ماسٹرز وائس تھا جونہی اس کی سوئی مجھ پر پڑتی میں آفتاب پکارنے لگتا اس سے پرے کچھ نہ تھا۔

اتنا سب کچھ جاننے کے باوجود میں اس کے سامنے بالکل مجبور تھا۔

میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر پوچھا۔۔۔۔۔ ''کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ۔۔۔۔۔ کہ کبھی آفتاب کو تم سے محبت تھی؟۔''

وہ ہنس دی۔۔۔۔ اس کا چہرہ اس قدر قریب تھا کہ باسی چیونگ گم کی خوشبو کے بھبھاکے میری طرف آنے لگے۔

''محبت پانے والا کبھی اس بات پر تو مطمئن نہیں ہو جاتا کہ اسے ایک دن کے لیے مکمل طور پر ایک شخص کی محبت حاصل ہوئی تھی۔ محبت تو قیوم ہر دن کے ساتھ اعادہ چاہتی ہے۔ جب تک روز اس تصویر میں رنگ نہ بھرو تصویر فیڈ کرنے لگتی ہے جیسے۔۔۔۔ جیسے روز سورج نہ چڑھے تو دن نہیں ہوتا۔ اسی طرح جس روز محبت آفتاب طلوع نہ ہو رات رہتی ہے۔۔۔۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔۔۔۔۔ مجھے غم نے فلسفی بنا دیا ہے۔۔۔۔ تمہیں کیا پتہ زمین کا ہر قطعہ سورج کیوں مانگتا ہے جس شخص سے محبت ملے ہمیشہ اسی کے پاس رہنے کو کیوں جی چاہتا ہے۔۔۔۔''وہ خدا جانے کب اور کیسے اتنی اردو سیکھ گئی تھی۔

''اب۔۔۔۔ اب وقت ہے۔۔۔۔ اتر راجہ گدھا اب وقت ہے۔۔۔۔''میں نے جی کی بات سن کر اندر ہی اندر کہا۔

''کچھ لوگوں کو ایک دن کے لیے بھی اپنا من چاہا۔۔۔۔ آفتاب نہیں ملتا۔ سیمی اندھیروں کے متعلق کیا ارشاد ہے جو ہمیشہ روشنیوں سے ہٹ کر رہتے ہیں''میں نے پوچھا۔

اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور پھر لاتعلق ہو گئی۔۔۔۔ اسے میرے اندھیروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرے اظہار عشق سے اس کا وقت ضائع ہوتا تھا۔ دراصل وہ کوئی ایسی بات سن ہی نہیں سکتی تھی۔ جس کا اس کی اپنی ذات کے ساتھ تعلق نہ ہو۔ اس کے اندر کہیں ایسا کٹ آؤٹ لگا تھا جو اپنا ذکر بند ہوتے ہی فوراً ساری بجلی کا کرنٹ

بند کر دیتا۔۔۔

''اسے مجھ سے بڑی محبت تھی قیوم۔۔۔اب تو۔۔۔میں کوئی ثبوت بھی نہیں دے سکتی۔۔۔لیکن فقتھ ائیر میں وہ مجھ سے بڑی شدید محبت کرتا تھا۔۔۔کبھی کبھی مجھے لگتا میرے بغیر وہ مر جائے گا۔۔۔یا شاید۔۔۔یا شاید یہ بھی میرا وہم تھا۔''

''ان باتوں سے حاصل سیمی؟ اس توڑ پھوڑ سے کیا بنے گا۔''

''مجھے اب اپنا کچھ نہیں بنانا قیوم۔''

''تم اسے خط لکھنا چاہو گی۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیا ملے گا خط لکھ کر؟ میرے خط تو شاخوں پر ہی سوکھ گئے نہ میں نے انہیں گلدان میں سجایا نہ کسی نے انہیں گلے کا ہار کیا۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس طرح کسمسائی جیسے غلطی سے ٹھنڈے پانی کا شاور سردیوں میں اپنے اوپر کھل جائے۔

''سنو سیمی تم ماڈرن لڑکی ہو۔۔۔تمہارے کٹے ہوئے بال ہیں۔ لباس چال ڈھال سب ماڈرن ہے۔ تم نے آفتاب کی نقل میں اپنے آپ کو مشرقی کر لیا۔ اردو سیکھ لی یہ اور بات ہے۔۔۔لیکن اندر سے تم Liberated لڑکی ہو۔ خدا قسم ایسی لڑکی قتل کرتی تو اچھی لگتی ہے قتل ہوتی کچھ اوپری سی لگتی ہے۔''

''پھر میں کیا کروں کیا کروں قیوم۔۔۔اس نے زیبا کو مجھ پر کیوں ترجیح دی۔ کیوں کیوں کیوں؟''

''آج کا ماڈرن مرد اور عورت سمجھوتہ کرتے ہیں ماحول سے اپنی غلطیوں سے اپنی Genetics سے۔''

وہ اب رات کے پہلے اندھیروں میں کھو رہی تھی۔ صرف اس کی آنکھوں کی دھنسی ہوئی چمک جگنوؤں کی طرح اندھیارا روشن کرنا چاہتی تھی۔

''اس کی خاطر میں نے ایم اے چھوڑا۔۔۔ گھر چھوڑا۔۔۔ اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میرا دل مانے بھی۔۔۔ دل مانتا تو مر جانے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ آفتاب چلا گیا اب کچھ ہو تھوڑا جا سکتا ہے۔''

میں اس کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔۔۔ ''سنو سیمی ان باتوں سے کچھ نفع نقصان نہیں ہوتا کبھی۔۔۔ یہ باتیں ہر جگہ ہر سے ہر رت میں یہاں وہاں ہوتی رہتی ہیں تمہیں کبھی اس اعتقاد سے نہیں ہٹنا چاہیئے کہ جیسی محبت اس نے تم سے کی پھر کبھی کسی سے نہ کر سکے گا۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟۔۔۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''وہ۔۔۔ بڑا شرمیلا اور محتاط تھا سیمی۔۔۔ میں نے کسی لڑکی سے اسے بات کرتے کبھی نہیں دیکھا تمہاری جانب وہ خود بخود کھنچتا جاتا تھا۔ اس کی روح۔۔۔ اس کی سائیکی اس کا جسم سب تمہارے تابع تھے۔۔۔ اسے نہ بدنامی کا ڈر تھا۔۔۔ نہ بربادی کا۔۔۔ بس وہ کھنچتا رہتا تھا خود بخود۔۔۔ خود بخود۔۔۔''

''مائی فٹ او تم چھوڑو قیوم۔۔۔ اچھا خود بخود تھا اسی لیے اتنی آسانی سے چلا گیا۔''

ایسی سیمی کو میں کیا بتاتا کہ میں اس سے پورے دو سال عشق کرتا رہا ہوں۔ شاعروں کا سا عشق۔۔۔ مجذوبوں کی سی لگن کے ساتھ۔۔۔ میں ایسی لڑکی کو کیا بتاتا کہ کچھ لوگ پہاڑوں کی اس جانب ہوتے ہیں جہاں سورج کبھی نہیں چمکتا۔۔۔ ۔ جو سورج کی حدت کو ہواؤں سے اخذ کرتے ہیں کچھ لوگ اپنے جسم پر خوشبو نہیں لگاتے۔ دوسروں کے لباس میں لگی خوشبو کو سانسوں سے اپنے اندر پہنچاتے ہیں۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔ سیمی۔۔۔ کیا یہ تمہارے لیے کافی ہو سکتی ہے؟''

میں نے لجاجت سے کہا۔

''آئی ایم سوری لیکن میں تمہاری محبت کو کیا کروں قیوم ۔۔۔اس کا تو نکاح ہو گیا۔۔۔پورا اور اصل ۔۔۔پکے کاغذوں والا''

کسی نو بیاہتا بیوی کی طرح وہ میرے کندھے سے لگ کر ہولے ہولے کراہنے لگی۔

میں نے اس کے سر کر بوسہ دیا۔۔۔یہ بوسہ میری روح کا تحفہ تھا۔

پھر میں نے اس کے ماتھے کو چوما۔۔۔اس التفات میں میرے دل کا نذرانہ تھا آہستہ سے میں نے اس کی گال پر اپنے ہونٹ ثبت کیے۔میری ذات دست بستہ جھکی لیکن جس طرح وہ میرے الفاظ سے بے نیاز رہی اسی طرح میرے لمس سے بھی اس میں کوئی حدت پیدا نہ ہوئی۔

''ہائے میں مر جاؤں سیدھا نکاح ۔۔۔دو گواہوں والا ۔۔۔برات والا ۔۔۔ہم میں تو کبھی لڑائی بھی نہیں ہوئی۔۔۔ہم تو کبھی ایک دوسرے سے ناراض بھی نہیں ہوئے۔پھر یہ کیسی سزا دی مجھے ۔۔۔کیوں قیوم کیوں؟''

''سنو سیمی نہ شادی کا محبت سے تعلق ہے نہ محبت کا شادی سے ۔۔۔ساختہ کو بے ساختہ سے کیا میل۔''

وہ یکدم سیدھی بیٹھ گئی کبھی کبھی سوشیالوجی کی کلاس میں وہ کسی پروفیسر سے نخشنے لگتی تھی تو اس کے چہرے پر ایسے ہی اتار چڑھاؤ آجاتے تھے۔

''لیکن شادی کا رفاقت سے تو تعلق ہے ۔۔۔ایک پلنگ ایک چھت ۔۔۔ایک گھر سانجھے بچے ۔۔۔ان چیزوں کو تم پورے طور پر Ignore بھی نہیں کر سکتے قیوم۔''

میں چپ رہا۔۔۔وہ دیر تک میرا چہرہ دیکھتی رہی لیکن اس دیکھنے میں میری پہچان نہ تھی وہ مجھ سے پرے پروفیسر کی نگاہ سے ایک اہم مسئلے کو ایک تعلیم یافتہ لڑکی

کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت الفاظ تلاش کر رہی تھی جیسے کم بیلنس والے لوگ چیک لکھتے وقت ذہن میں پڑتا لگاتے ہیں کہ کتنی رقم کا چیک لکھیں تو پیسے مل جائیں گے۔ وہ بار بار منہ کھولتی اور بند کر لیتی اس کے اندر کا پریشر کھلنے کے لیے بے قرار تھا لیکن نکاس کی کوئی صورت نہ تھی۔

شاید اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں اس کے ماتھے اور گالوں کو چوم چکا تھا۔!

''میں پنڈی واپس جانا نہیں چاہتی۔ حالانکہ وہاں مجھے ایک ٹریول ایجنسی میں نوکری مل گئی ہے۔''

''چلی جاؤ''

''نہیں جا سکتی۔''

''پھر!۔''

''یہاں لاہور میں میرے Parents ہیں میں ان کے پاس جا سکتی ہوں۔''

''تو چلو۔۔۔۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔''

''نہیں جا سکتی۔''

''تو کہا جاؤ گی اتنی رات گئے۔''

''یہیں رہوں گی۔''

''اتنی گرمی میں ساری رات۔''

''جب تک مجھے سمجھ نہ آجائے قیوم۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔ اس نے مجھے کیوں چھوڑا۔ یا میرا دل نہ مان جائے کہ یہ سب کچھ جھوٹ تھا میں کہاں جا سکتی ہوں بھلا؟ بتاؤ ناں۔۔۔''

مجھے کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ میں کیا کروں۔ اب گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے مال روڈ کے ٹریفک کی آواز بھی کم ہو چکی تھی۔

گرمی تھی حبس تھا۔۔۔ اور سارے میں کافور کی اندھی خوشبو تھی ایک کونونٹ کی

پڑھی لکھی لڑکی کا منہ زور عشق تھا۔

''تم آفتاب کو نہیں جانتیں۔ وہ کسی پریشر تلے کچھ کرنے کا عادی نہ تھا۔۔۔ اس نے تمہیں کسی دباؤ تلے نہیں چاہا اور کسی پریشر تلے اس نے شادی نہیں کی ہے۔ اس بات سے تمہیں سمجھوتہ کرنا ہوگا سیمی۔۔۔ آفتاب کا جسم ضرور زیبا کا ہے لیکن اس کا دل۔''

وہ اب پھر کلاس میں بیٹھی تھی۔۔۔ اس کا چہرے پر سوال بھی تھے اور جواب بھی۔ ۔۔۔ جیسے وہ سوشیالوجی کی کوئی دقیق کتاب ساری رات۔۔۔ پڑھتی رہی ہو۔

''جانے دو قیوم۔۔۔ انسانوں کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔۔۔ آدمی دولت بانٹ سکتا ہے مراعات میں انصاف کر سکتا لیکن اپنے اندر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا، پتہ نہیں تم میری بات سمجھ بھی رہے ہو کہ نہیں۔۔۔ سنو۔۔۔ ینگ مین۔۔۔ ٹکڑے ٹکڑے انسان سے کسی کی سیری نہیں ہوتی۔ اگر میری اس سے شادی ہو جاتی تو کیا میں برداشت کر لیتی کہ دل میں ہو کسی اور کی پرستش کرتا رہے اور جسمانی طور پر میرا رہے۔ اور جسمانی طور پر میرا رہے۔۔۔۔ کبھی گارڈ آدھے یا پونے پہیے پر بھی چلی ہے؟ آدمی پورا مل جائے تو خلا نہیں بھرتا تم آدھے پونے کی بات کر رہے ہو۔''

میں نے سیمی پر نظر ڈالی۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھے کچھ سودا ہے جو میں اس گرمی میں جب کہ زمین اور آسمان دونوں حبس میں لرز رہے ہیں گہری رات کے وقت ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ ایسی لڑکی جس کا محبوب اسے چھوڑ کر لندن چلا گیا اور جو اس کے فراق میں آگے پیچھے دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھ سکتی

لیکن ہم تو کرگس کے لوگ ہیں۔ ہم تو ازل سے ان مردوں پر پلے تھے۔ ہم گدھ برادری کے لوگ سیمی کو آدھے پونے کی بات کیا سمجھاتے۔۔۔ ہم تو گرم خون کے

عادی ہی نہ تھے ہم اسے کیسے سمجھاتے کچھ لوگوں کو صرف جسم کے سہارے زندہ رہنے کا حکم ہوتا ہے

''جب آفتاب نے مجھ سے کہا کہ وہ شادی کر رہا ہے تو۔۔۔ تو میں نے اس سے پوچھا تھا۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ کیوں آفتاب؟۔۔۔ پر اس نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔''

''شاید اس کے پاس ایسا کوئی جواب نہ تھا جو اس کی اپنی تشفی کر سکتا ہو۔''

''اس روز اس نے آسمانی کے رنگ سے بھی ہلکی چیز کلاتھ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ میں نے اسے کالروں سے پکڑا کر اتنی بار پوچھا کہ اس کے کالر کی سلائی نکل گئی قیوم۔۔۔۔''

''کیا پوچھا۔''

''دل ساتھ نہ ہو تو شادی کا فائدہ آفتاب۔۔۔ جسم ساتھ نہ دے تو ہمیشہ کے سنجوگ سے حاصل۔۔۔ میں سے کھنچتی رہی پوچھتی رہی اور وہ کہتا رہا کیا لنگڑے زندہ نہیں رہتے کیا اندھے چلتے پھرتے نہیں۔۔۔ میں مر رہی تھی اور وہ کمینہ میری بات کا جواب بھی نہ دیتا تھا۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ مر رہی تھی۔

اس وقت ریسوران سے آنے والی موسیقی کی آواز بند ہوگئی۔ دیر سے جانے والوں کی چاپ بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ کبھی کبھی دور سے کسی سپاہی کی سیٹی اچانک سر سے نکل کر درختوں پر سوئے پرندوں کو جگا دیتی اور تھوڑی دیر کے لیے درختوں پر پھڑ پھڑانے کی ہلچل ہوتی اور پھر سب خاموش ہو جاتا۔

ستمبر کی گرم رات کا پچھلا گرم پہر۔

میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اس کے دونوں کندھے جھنجھوڑ کر میں نے پوچھا۔۔۔ ''تمہیں محبت چاہیئے۔۔۔ وفا چاہیئے۔۔۔ رفاقت؟''

''ہاں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ میں بچپن سے بہت

Pampered ہوں قیوم میں محبت کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی لیکن ۔۔۔لیکن اب زندہ رہنے کی ضرورت بھی کیا ہے ۔۔۔" بار بار متعدی بیماری کی طرح مایوسی اس پر حملہ کردیتی۔

"میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔ جس طرح سات ماہ کے بچے کو ہسپتال کے Incubator میں زندہ رکھتے ہیں۔"

"اچھا قیوم؟ ۔۔۔تم مجھے بچالوگے ۔۔۔اس سے میمی سے؟ ۔۔۔میں جانتی ہوں تم بھی مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دوگے کسی دن۔"

"نہیں نہیں میمی میں تمہیں اپنی روح کی حدت سے زندہ رکھوں گا ۔۔۔خدا قسم میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا Never"

یہ صرف گدھ جاتی کی عقل ہے کہ وہ مرے ہوؤں سے زندگی کا وعدہ کرتے ہیں اس وقت میرے پاس کچھ نہ تھا۔صرف ہمدردی کا ست رنگا جال ۔۔۔آفتاب نے یہ غزال شہر شکار کیا تھا مجھے اس مردہ لاش کو کھانے کا حکم تھا۔وہ نڈھال نڈھال کافور کے درخت تلے نیم مردہ پڑی تھی۔یہ لارنس باغ کا وہ حصہ تھا جہاں شام پڑتے ہی جنات کا پہرہ ہو جاتا ہے کئی صاحب دل لوگوں کو یہ جنات خود مل چکے ہیں۔کچھ ان کو مشعلیں جلائے درختوں میں غائب ہوئے دیکھا ہے کچھ ان کے گنجے سر، نوگزے قد دیکھ کر باغ سے سرپٹ بھاگے ہیں اس وقت ان ہی جنات کے خوف ۔۔۔ سے

کوئی مالی چوکیدار سپاہی ادھر نہیں آتا۔

سارے میں جگنو مقیش لگے دوپٹے کی طرح چمک رہے تھے اور میمی کافور کے پتوں پر ہلکے ہلکے پسینے میں ٹھنڈی بوتل کی طرح ہولے ہولے بھاپ چھوڑ رہی تھی۔

یہاں میمی سے میرا ایک نیا تعلق پیدا ہوا۔جسمانی رفاقت کا بانجھ سفر میمی کو اپنی پرواہ نہ تھی وہ آفتاب کے بعد کس کی تھی کیوں تھی؟ اس بات کی اسے خبر نہ تھی۔دراصل

مغربی تعلیم نے اس کے اندر ایک خاص قسم کی منفرد وفا پیدا کر دی تھی جس کا تعلق صرف روح سے تھا اسے جسمانی تعلقات کی رتی برابر بھی پروا نہ تھی کافور کے درخت تلے سیمی سے میں ہمیشہ کے لیے منسلک ہو گا جیسے اسی کے جسم کا حصہ تھا اور وہ اپنے آپ کو میری تحویل میں دینے کے باوجود بالکل الگ تھلگ رہی۔۔۔ جیسے بنک کا ٹوکن۔۔۔ آپ کی مٹھی میں ضرور ہوتا ہے لیکن آپ کی ملکیت نہیں ہوتا۔

جب آفتاب کو اس کے جسم کی ضرورت نہ تھی تو اس کا جسم کوڑے کا ڈھیر تھا۔ اب اسے فکر نہ تھی کہ اس کوڑے کے ڈھیر پر کون اپنی غلاظت پھینکتا ہے اپنا جسم میرے سپرد کرنے سے کچھ لمحے پہلے وہ ملاتیہ فرقے میں شامل ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر یار سے بے دریا ہو گ ۔ سیمی میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ میرا مقابلہ کر سکتی وہ مرنے سے بہت پہلے مرنے کا راز پا گئی تھی اسنے منہ سے ایک لفظ نہ کہا کھلی آنکھوں سے مجھے ایسے دیکھتی رہی جیسے میں موجود نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہونے کا راستہ نہ ہو تو دل تک جانے کے اور بھی کئی راستے ہو سکتے ہیں۔

اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ دل صرف ایک راہ جاتی ہے اور وہ جسم کا راستہ نہیں ہے جسم کے جنکشن پر انجن رک سکتا ہے۔ کوئلہ پانی درست کر سکتا ہے لیکن ہمیشہ جنکشن پر کھڑا نہیں رہ سکتا، جسموں کے اتصال سے ایک نیا جسم ایک نئی روح جنم لے سکتی ہے لیکن ایک روح دوسری روح سے نہیں مل سکتی۔ بشرطیکہ ان کی روحیں پہلے ہی یک رنگی اختیار نہ کر چکی ہوں ویسی صورت میں یہ ملاپ بندوق کی لبلبی کا کام دیتا ہے تڑاہ تڑاہ کی آواز بھی نکلتی ہے فائر بھی چلتا ہے اور دو شکار ایک وقت میں مرتے ہیں روحوں کا اتصال پہلے نہ ہو چکا ہو تو جسمانی تعلق احساس گناہ بھی ہے۔۔۔ اور ہمہ شکستگی بھی۔

جب میں نے اس کا کف دوبارہ بند کیا تو وہ آنکھیں بند کیے چپ لیٹی تھی وہ نہ میرے ساتھ تھی نہ میرے مخالف۔ وہ کسی ایسے شرابی کی بیوی تھی جو ہزار مجبوریوں

کے باعث مدافعت کے قابل نہیں رہتی۔

یہ بھی عجیب رابطہ تھا۔مردار کو گدھ ہڈیوں تک شفاف کر چکا تھا لیکن وہ اپنی بے عزتی کا نظارہ کرنے لیے موجود ہی نہ تھی وہ تو اس وقت کہیں اور تھی کسی اور کے ساتھ تھی یہ بھی اپنی نوعیت کا رابطہ تھا ادھر سے کوئی مدافعت نہ تھی سومناتھ کا مندر رکھلا پڑا تھا۔صرف ارد گرد ایک بھی پجاری نہ تھا سیمی قسم کی کوئی روح کوسوں میل تک موجود نہ تھی۔

جس وقت ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ہم مکمل طور پر کھ کھلے تھے۔ میں جانتا تھا کہ سیمی کبھی میری نہ ہو سکے گی۔وہ غالباً سمجھتی تھی کہ اپنے ساتھ میری لعنت لگا کر اس نے آفتاب سے بدلہ لے لیا ہے شاید وہ اپنے آپ کو ذلیل کر کے ہی اپنی ذات کو کچھ دیر کے لیے بچا سکتی تھی۔

رات کے پچھلے پہر کا چاند چیڑھ کے درختوں میں قرص بن ٹنگا ہوا تھا

''چلیں؟۔۔۔۔''سیمی نے بالآخر پوچھا۔

''کہاں۔۔۔؟''

''ڈرو نہیں میں وائی ڈبلیو سی اے جاؤں گی۔''

''میں نہیں ڈرتا کسی چیز سے۔''

''اگر میں تمہارے گھر جانا چاہوں تو۔۔۔۔''

''تو چلو ناں۔۔۔۔''میں نے اس کا بازو گھسیٹ کر کہا۔

''نہیں قیوم میرا کوئی گھر نہیں ہے مجھے وائی ڈبلیو سی اے تک پہنچا دو۔وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔''

''اتنی رات گئے۔''

''وہ جانتی ہے میں پاگل ہوں Assignment لکھتے وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن آج پروفیسر سہیل کو بتا سکتی ہوں دیوانے پن کی اصلی وجہ۔''

جس وقت ہم ٹک شاپ کے پچھواڑے پہنچے تو سیمی نے میرے بازو کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔

''قیوم۔''

''ہاں۔''

''موٹر سائیکل مت چلانا باغ میں۔ مال پر جا کر سٹارٹ کرنا۔''

''کیوں۔''

''اس وقت ہمیں کسی سپاہی نے دیکھ لیا تو تھانے لے جائے گا۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں ہے کوئی مجھے تھانے لے جائے کہ جہنم لے جائے لیکن تمہارا رزلٹ نکلنے والا ہے۔ پھر تمہیں نوکری چاہیئے ہو گی۔''

''مجھے پروا نہیں۔''

''ہونی چاہیئے ناں پروا۔ سپاہی نازیبا حرکتیں کرنے والوں کو تھانے لے جاتے ہیں گندے بچے۔ نقص امن ہے یہ بھی۔''

''وہ ہلکا سا مسکرائی۔ پہلی بار۔''

میں نے محسوس کیا یہ مسکراہٹ دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی میری محبت نے میری جسمانی وارفتگی نے اس کے وجود کو ذرا سا بھی ڈرائی کلین نہیں کیا تھا۔

وائی ڈبلیو سی اے سے میں باہر نکلا تو شہر پوری طرح سویا ہوا تھا۔۔۔ سینٹ انتھونی کے گرجے کی سیاہی مائل عمارت کے پیچھے چاند میری موٹر سائیکل کی رفتار کے ساتھ ساتھ سفید روسی کتے کی طرح بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

دن کے وقت مال کی شکل کچھ اور ہوتی ہے لیکن اس وقت عمارتیں بہت گرانڈیل سڑکیں کشادہ اور بتیاں بہت زیادہ روشن تھیں اکا دکا کاریں آ جا رہی تھیں۔ پر ان کے رنگ اور رفتار کچھ اجنبی سے نظر پڑتے رہے۔۔۔ پوسٹ آفس کی گلابی عمارت

سے لیکر کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ تک سارا دن قریباً ٹل تک رہتا ہے لیکن رات گئے یہاں صرف بتیاں پلکیں کھولے کھڑی تھیں اور کسی کسی راہ گیر کو حیرانی سے تک رہی تھیں جس وقت میں کرشن نگر سے نکل کر بوچڑ خانے کے پہلو میں بائیں ہاتھ کو مڑا تو مجھے دودھ کو بلوٹے لادے ہوئے ایک گوجر کے ریڑھے نے کراس کیا۔ ابھی صبح کاذب بھی نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ شہر کے بیدار ہونے میں اب تھوڑی ہی دیر ہے۔

ساری رات سیمی کے ساتھ کافور کے درخت تلے گزارنے کے بعد مجھے اپنا کمرہ، پرانی زندگی، رات سب کچھ غیر مرئی لگ رہا تھا جب آدمی کافی دیر تک جاگتا رہے اور نیند کو غالب نہ ہونے دے تو اس کے اعضا سست پڑ کر یا تو بہت ہلکے ہوجاتے ہیں اور یا بہت بھاری محسوس ہونے لگتے ہیں اس کے سر سے کچھ بوجھ سا اتر جاتا ہے۔۔۔ حقیقتوں کا بوجھ اور وہ جاگتے میں خواب تو نہیں دیکھتا لیکن اس کی نقل و حرکت کچھ Slow motion جیسی ہوجاتی ہے۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں شہ نشین پر بیٹھا بیٹھا اونگھ گیا ہوں لیکن آنکھ کھلی تو سامنے مختار بھائی کھڑے تھے ان کے سر پر پورا سورج چمک رہا تھا اور وہ تعجب سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''یار ساری رات یہاں ہی بیٹھے رہے ہو؟۔۔۔'' انہوں نے اپنی عینک کے ڈبل شیشے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں میں تو بہت صبح یہاں آ کر بیٹھا تھا۔''

''موٹر سائیکل کہاں ہے۔''

''نیچے گلی میں۔''

میں عموماً جب کبھی ان کی موٹر سائیکل مستعار لیتا تو اسے آنگین کی اس بغلی گلی میں کھڑا کر دیتا۔۔۔ جس میں میرے کمرے کی اوپر آنے والی سیڑھیاں کھلتی تھیں۔

''اچھا۔۔۔تم پاس ہو گئے ہو۔۔۔رزلٹ آ گیا ہے۔۔۔اخبار میں۔۔۔ہے۔''

سیمی کے عشق میں فیل ہو کر مجھے پاس ہونے کی خبر عجیب سی لگی۔

''نیچے اپنی بھابھی سے اخبار لے لینا۔۔۔۔مبارک ہو۔''

بھائی مختر رومال سے منہ پونچھتے ہوئے بیرونی سیڑھیوں سے باہر اتر گئے۔

جب رات میں گھر داخل ہوا تو مجھے پورا یقین تھا کہ اب میں سیمی سے کبھی نہیں ملوں گا۔۔۔اس کے بہت قریب رہ کر مجھے علم ہو گیا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔۔۔لیکن ہمیشہ کی طرح سارا دن میں رزلٹ کے بجائے اسی کے خیالوں میں الجھتا رہا۔۔۔رہ رہ کر اس کی باتیں، بیٹھنے کا طریقہ اس کے بے طور بہنے والے آنسو، آفتاب سے اس کی بے ساختہ اور وارفتہ محبت میرا محاصرہ کرتی رہی۔

جس وقت دھوپ ڈھلے میں وائی ڈبلیو سی اے کے سامنے پہنچا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں سیمی سے ملنے جا رہا ہوں زیادہ سے زیادہ میرا یہ ارادہ تھا کہ اپنی ایک ہم جماعت کو سوشیالوجی کا رزلٹ سنا دوں گا۔وہ بغیر پھاٹک والے بڑے ستون کے پاس کھڑی تھی میں نے مختار بھائی کا ہونڈا اس کے پاس روک۔۔۔یوں لگتا تھا کہ ساری رات جاگنے کے بعد وہ دن بھر بھی نہیں ہوئی۔

''آ گئے۔۔۔۔مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے۔''

''کیسے؟''

''مریض کو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر آئے گا۔''

''تم کو اتنا کچھ کیسے معلوم ہوتا ہے سیمی۔''

اس نے آج اپنے ابرو Pluck نہیں کیے تھے اور چھوٹے چھوٹے نئے بال

چیونٹیوں کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے۔

''ہوتا ہے معلوم۔۔۔۔تعلق ہو تو سب کچھ پتہ لگ سکتا ہے۔۔۔رزلٹ نکل آیا؟''

''ہاں۔۔۔تم نے اخبار دیکھا۔''

''نہیں۔۔۔لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ رزلٹ نکل آیا ہے سوشیالوجی کا۔۔۔ میں اخبار دیکھ کر کیا کرتی۔''

''میں پس ہو گیا ہوں۔''

''اچھا؟۔۔۔مبارک۔''

صبح بھائی مختار نے دن چڑھے بھابھی صولت نے اور اب سیمی نے ایک سے لہجے میں مبارک دی تھی۔

ان تینوں کا تعلق ایک جیسا تھا۔

''کون سی ڈویژن؟۔''

''سیکنڈ۔''

''اچھا ہے۔۔۔میں اور آفتاب تو یہ بھی حاصل نہ کر سکے۔''

وہ چپ کھڑی تھی۔

آج پھر اس نے جینز پر سفید وائل کا کرتی پہن رکھا تھا۔۔۔لیس کی باڈس صاف نظر آ رہی تھی۔۔۔کٹے ہوئے بال اس نے تجاہل کے ساتھ ربر بینڈ سے باندھ رکھے تھے کندھے سے لٹکا ہوا کینوس کا تھیلا اس کے گھٹنوں تک تھا۔اور وہ اس وقت تھوڑی سی فقیری تھوڑی سی ہپی تھوڑی سی فرانسیسی لڑکی نظر آ رہی تھی۔

''چلیں؟۔۔۔''میں نے سوال کیا۔

''چلو۔''

''کہاں؟''

''کسی ہوٹل میں۔''

''میری ابھی نوکری نہیں لگی ۔۔۔۔میں زیادہ پیسے نہیں خرچ سکتا۔''

''میری تنخواہ جو ہے ۔۔۔بل میں ادا کروں گی ۔۔۔۔''اس نے کینوس کے تھیلے پر ہاتھ رکھ کر کہا

''پھر کسی روز سہی''

''تو پھر آج کہاں چلیں۔''اس نے پوچھا۔

''وہیں؟۔''

''وہیں کہاں؟۔۔۔۔''جیسے وہ رات کو، کافور کے درخت کو اور باقی سب کچھ یکسر بھول چکی تھی۔

اب ہمارا معلول ہو گیا کہ ہم دونوں شام گئے جناح باغ چلے جاتے۔اس خطے میں جہاں جنات کا پہرہ تھا اور روحیں آدھی رات کو لالٹین لے کر پھرتی تھیں۔یہاں بیٹھ کر ہم آدھی آدھی رات تک پچھلی باتیں کرتے رہے۔سیمی میرے متعلق کچھ جاننا نہیں چاہتی تھی اس لیے میرے تمام دروازے بند رہتے۔صرف وہ بولتی رہتی ۔۔۔۔اپنی محرومی کی تمام باتیں ایک ایک کر کے مجھے بتاتی رہتی۔اپنے بچپن کے واقعات، آفتاب سے ملاقاتیں، آفتاب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے ۔۔۔ باتیں وہی تھیں لیکن وہ تاپ کے پتے کچھ اس طرح پھینکتی کہ ہر بار ہم دونوں کے ہاتھوں میں نئے پتے آجاتے ۔۔۔میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں ان ہی باتوں کی سیڑھی لگا کر اس تک پہنچوں جب میں اس کے بہت قریب ہو جاتا اور اس کی آستین کو رول کرنے لگتا تو وہ ہمیشہ آنکھیں بند کر لیتی ۔۔۔اس کے بعد وہ آفتاب کی آغوش میں ہوتی۔

جسمانی تعلق کے عین تین سیکنڈ بعد وہ ہمیشہ آفتاب کا نام لے کر اٹھ بیٹھتی یہ نام

میری کنپٹی میں گولی کی طرح لگتا۔

''آفتاب تمہارا دوست تھا؟۔۔۔۔''ایک رات اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''بہت۔۔۔''میں اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

میں اس وقت سیمی کو بتانا چاہتا تھا کہ مجھ جیسوں کا یہاں۔۔۔۔وہاں کوئی دوست نہیں ہے ہماری کوئی محبوبہ نہیں ہوتی۔ہم صرف لوگوں سے ملتے رہتے ہیں جیسے پائے کھانے والے آفتاب کی محبت میں کیسے مبتلا ہو گئی۔بھنڈی کے پھولوں جیسے زرد رنگ کی آڈری ہپر برن نے خدا جانے بھاری بھر کم شلوار قمیض پہننے والے پنجابی سی اونچی اونچی باتیں کرنے والے آفتاب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کیوں اختیار کیا؟

شاید آفتاب کی ساری کشش اس بات میں تھی کہ خدا نے اسے سرکش بنایا تھا نہ سرشار۔۔۔وہ اونچے شملے والوں میں پیدا ہوا تھا لیکن گھنائے ہوئے لوگوں سے اسے کوئی نفرت نہ تھی۔وہ کنول کے پھول کی طرح پانی ار کیچڑ دونوں سے بنا تھا۔شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہر ماحول میں ہر انسان کے ساتھ بڑی جلدی ہم آہنگی اختیار کر لیتا۔

ایک روز وہ اپنا صابن تولیہ اور برش لے کر کمرے سے رخصت ہوا۔لیکن چند لمحے بعد ہی واپس آ گیا میں اس وقت اٹھنے کی سوچ رہا تھا۔

''یار قیوم۔۔۔ٹیوب ہو گی۔۔۔ٹوتھ پیسٹ۔''

میں نے الماری میں رکھی ٹیوب کی طرف اشارہ کیا اس نے ٹیوب سے لمبا سا سفید گل نکالا اور احتیاط سے اپنے برش پر جما لیا۔کندھے پر تولیہ رکھے اس وقت وہ مجھے خدا خبر کیوں کسی پنجابی فلم کا ہیرو لگ رہا تھا میرا خیال تھا کہ اب وہ اتنی تیزی سے ہی لوٹ جائے گا جتنی جلدی وہ آیا تھا لیکن وہ دہلیز کے ساتھ کندھے جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔کشمیری آدمی پتہ نہیں کیوں صبح سویرے ڈھیلا ہوتا ہے۔

''یار یہ ہماری چوکھٹ کو دیمک لگ گئی ہے۔۔۔۔یہ دیکھو۔''

میں نے پلٹ کر چوکھٹ کی طرف دیکھا

''رپورٹ کرن ء چاہئیے وارڈن صاحب کو۔''

''ہاں کرنی تو چاہئیے''

وہ مسکرایا۔۔۔۔''لیکن کیا فائدہ؟ بڑے بڑے عالی شان قالین بودے ہو جاتے ہیں یہ تو پھر لکڑی ہے دیمک نہ لگے گی تو ویسے اس کی نیچ لائف ختم ہو جائے گی''

''آدمی اپنی احتیاط سے تھوڑی دیر کے لیے اس کے آگے بندھ باندھ سکتا ہے سارے Biocess کو ختم نہیں کر سکتا''

''اچھا۔''

وہ کھڑا رہا چپ چاپ۔

''میں ہاسٹل چھوڑ رہا ہوں۔''

''کیوں؟''

وہ تھوڑی دیر تک سر کھجلاتا رہا۔۔۔۔پھر بولا۔۔۔''یار میرے خیال تھا کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی Job کروں گا۔ایک بڑا افسر بنوں گا۔لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ سب کچھ یہ Put on میرے لہو میں نہیں ہے۔میرے باپ دادا قالین بیچتے آئے ہیں کشمیری چائے پیتے رہے ہیں۔۔۔کلچے کھاتے رہے ہیں۔میں پتلون کوٹ اور ٹائی پہن کر بہت اوپر الگوں گا۔اپنے آپ کو ٹکٹکی پر لگا لوں گا گورے صاحب کی طرح۔۔۔۔''

''کیا پڑھائی بھی چھوڑ دینے کا ارادہ ہے۔''

''ہاں کچھ ہی۔''

''کیوں؟''

''بھئی کچھ فرق نہیں پڑتا ہماری ٹریڈ میں۔''

میں چپ ہو گیا۔ اس کے چلے جانے سے تھوڑی سی امید بندھتی تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا۔

''عجیب بات ہے کچھ لوگوں کو محبت پائیدار کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے خاص کر لڑکیوں کو۔۔۔'' اس نے سر کھجلا کر کہا۔

وہ شاید سیمی کا نام لینا چاہتا تھا۔

''ایسے لوگوں کو وہم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ جوان رہیں گے۔ ہمیشہ محبت کر سکیں گے۔۔۔ ان لڑکیوں کے دماغ میں اس قدر بھوسہ کیوں بھرا ہوتا ہے۔''

''تو کیا آدمی کسی سے ہمیشہ محبت نہیں کر سکتا۔''

''کر سکتا ہے کر سکتا ہے لیکن ہر آدمی نہیں۔۔۔ ہم آج کل کی Generation تو بالکل نہیں۔ ہمیشی کی محبت بڑا مشکل کام ہے۔''

''تھوڑا وقت تو رہ گیا ہے اگر امتحان دے دیتے تو کوئی خاص ہرج بھی نہ تھا۔''

''لندن والی برانچ کا مینجر استعفا دے گیا ہے ابا جی آفر دے رہے ہیں اگر میں سوچتا رہا تو پھر یہ جگہ پر ہو جائے گی۔''

اس وقت میرا خیال تھا کہ وہ سیمی کو ساتھ لے جائے گا۔ جس روز کلاس میں یہ افواہ پھیلی کہ آفتاب نے نہ صرف کالج چھوڑ دیا ہے بلکہ وہ اپنی کزن سے شادی بھی کر رہا ہے تو مجھے بڑا تعجب اور سکون ہوا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو قیوم۔''

''کچھ نہیں۔۔۔ کالج کی پرانی باتیں۔''

پھر اس نے میرا ہاتھ اٹھا کر لبو سے لگایا۔ دبلے پن کی وجہ سے اس کی ہاتھوں پر کتنی ہی نسیں ابھری ہوئی تھیں اور تیسری انگلی میں فیروزے کی انگوٹھی آگے پیچھے ڈھلک رہی تھی۔

''اگر تم بھی نہ ہوتے قیوم۔۔۔ذرا سوچو تم بھی نہ ہوتے تو اس رات میں اس درخت تلے مر جاتی Joke نہیں خدا قسم مر جاتی۔۔۔پھر دوسری صبح میرے ممی ڈیڈی میری لاش شناخت کرنے تھانے آتے۔''

''سیمی تم اپنے والدین کے پاس واپس کیوں نہیں چلی جاتیں۔''

''گلبرگ تھری میں۔۔۔امریکی ہسپتال کی پشت پر۔''

''ہاں وہیں۔''

''جیسے اس وقت میں اٹھنا چاہتی ہوں لیکن اٹھ نہیں سکتی۔۔۔اس طرح میں وہاں جانا چاہتی ہوں لیکن جا نہیں سکتی۔''

''لیکن کیوں آخر کیوں؟''

وہ زار زار رونے لگی۔اس کے رونے میں ایک ایسے چشمے کی آواز تھی جو پتھریلی جگہ سے سر پھوڑ کر گزر رہا ہو۔

''آؤ آفتاب کی باتیں کریں'' میں نے اسے دلاسہ دے کر کہا۔

یکدم وہ مکمل دلچسپی بن گئی۔

''وہ تمہارا دوست تھا ناں بتاؤ ناں؟ بتاؤ تمہیں اس سے محبت تھی؟ ضرور ہو گی۔ میں نے سنا ہے ہوسٹل میں لڑکے Homo sexual ہوتے ہیں۔سچ سچ بتانا۔کیا تمہارا اس کا جسمانی تعلق تھا۔''

میں دنگ رہ گیا۔۔۔بھنڈی کے زرد پھولوں جیسی رنگت پر اس وقت ہلکی ہلکی سرخی چھا رہی تھی۔۔۔میں سوچنے لگا شاید مجھ سے جسمانی تعلقات استوار کرنے کی بھی یہی وجہ نی ہو کہ اسے اپنے جسم کی پرا نہیں بلکہ شاید میرے توسط سے اب بھی وہ آفتاب تک پہنچنا چاہتی ہو۔

میں چپ ہو گیا۔۔۔وہ بہت خطرناک پانیوں میں بغیر لائف سیونگ بلٹ کے تیر رہی تھی۔

''اچھا نہ سہی ۔۔۔تم مجھے اپنے متعلق کچھ بات نہیں بتانا چاہتے میں نے تو تم سے کچھ نہیں چھپایا قیوم ۔۔۔اندر سے اندر کی باتیں بھی تمہیں بتا دی ہیں نہ بتانے والی بھی۔۔۔۔۔''

اس وقت میں نے سیمی کو جو کچھ بتایا وہ میری آپ بیتی تھی لیکن میں نے اپنی کہانی لمحہ بہ لمحہ جذبہ بہ درجذبہ اور واقعہ درواقعہ آفتاب سے منسوب کر کے اسے سنائی۔آفتاب کا نام میں نے اس لیے لیا۔کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میری کوئی بات وہ غور سے نہیں سنے گی اس کا کٹ آؤٹ کام آئے گا اور بجلی کا کرنٹ اس کے دل تک نہ پہنچ سکے گا۔

میں نے بتایا ذرہ ذرہ احوال ۔۔۔جب پہلی بار وہ کلاس میں آئی تھی۔اس نے کس سے پہلے بات کی تھی اور وہ کب رخصت ہوگئی۔میں نے اسے وہ سارے خط سنائے جو میں لکھتا رہا لیکن پوسٹ نہ کر سکا۔میں نے وہ تمام واقعات بیان کیے جب میں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے مل نہ سکا۔اپنی ڈائری کے صفحات بیان کرنے میں آسمان کا رنگ پرانی چاندی جیسا ہو گیا اور مجھے شبہ ہوا کہ دن چڑھنے والا ہے۔

''لیکن یہ ساری باتیں تو مجھے آفتاب نے کبھی نہیں بتائیں۔''

''وہ جذبات کے اظہار میں گونگا آدمی تھا۔۔۔ایسے آدمی کچھ نہیں بتایا کرتے۔''

''لیکن ۔۔۔ہم دونوں تو گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔۔۔تمہیں بھی تو اس نے سب کچھ بتایا۔۔۔اتنی ساری محرومیوں کی مجھ سے تو کبھی اس نے شکایت نہیں کی۔مجھے تو معلوم نہیں کہ وہ مجھے خط لکھتا تھا بغیر پوسٹ کیے۔''

میں اندر ہی اندر ہنسا اور بولا ۔۔۔میرا تو دوست تھا سیمی ۔۔۔دوست۔۔۔ہومو۔۔۔۔۔

''آہ ان باتوں کا فائدہ۔۔۔اور ان سے حاصل ۔۔۔۔؟ شاپنگ گم

ہو جائے تو رسیدوں سے فائدہ؟''

میں نے بازو پھیلا کر اسے اپنے وجود کے ساتھ لپٹا لیا۔ راجہ گدھ کو ایسے لمحوں کا بہت انتظار رہتا ہے جب کوئی شخص دنیا کو بے فائدہ سمجھ کر اس سے منہ موڑنے کی کوشش کرے، اس نے اپنے اعضاء ڈھیلے چھوڑ دیے جیسے طوفان کے بعد ٹوٹی ہوئی کشتی اپنے تختے ساکت پانیوں پر چھوڑ دیتی ہے اس گلدستے میں میرے لیے ان گنت کانٹے تھے۔ لیکن ان کانٹوں کے باوجود میں اسے سینے سے لگانے پر مجبور تھا۔

''سیمی ۔۔۔۔۔ محبت کی فریم میں کبھی کبھی تصویر بدلنا پڑتی ہے۔''

اس نے آنکھ کی جھری سے دیکھا وہ اس وقت میرے ساتھ نہیں تھی۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں فیروزی مائل سیاہ آئی شیڈ والے پپوٹوں کے نیچے ان آنکھوں میں آفتاب کی شکل گھوم پھر رہی تھی۔

''جانے دو ۔۔۔ مجھے جانے دو ۔۔۔ میں ان تصورات سے ختم ہو جاؤں گی''

''کیسے تصورات سیمی؟ ۔۔۔ کیسے؟''

''وہ دونوں ۔۔۔ ایک ڈبل بیڈ پر ہیں۔ وہ میرا آفتاب ۔۔۔ میرا اسے چوم رہا ہے زیبا کو ۔۔۔ تم نہیں سمجھ سکتے قیوم ۔۔۔ یہ تصورات مجھے ختم کر دیں گے۔ پتہ نہیں سارا سارا دن مجھے کیا کچھ نظر آتا رہتا ہے۔''

میں نے خفگی سے کہا ۔۔۔ ''ہم بھی تو ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں سیمی۔''

اس نے ندامت سے سر جھکا لیا اور لجاجت سے بولی ۔۔۔۔ ''یہ اور بات ہے قیوم ۔۔۔ اسے اپنی زیبا سے محبت ہو گئی ہے ۔۔۔ وہ بے وفا ہے ۔۔۔ بے وفا ۔۔۔ اتنی جلدی میرے بعد اسے محبت ہو گئی ۔۔۔ وہ زیبا کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا ۔۔۔ ہمیں کوئی محبت تھوڑی ہے؟ ۔۔۔ ہیں قیوم ۔۔۔؟''

میں چپ رہا۔

جہاں تک سیمی کا تعلق تھا وہ مجھے چومتی ضرور تھی لیکن اسے مجھ سے محبت نہ تھی، کم از کم یہاں تک وہ سچی تھی۔

سیمی باوفا کیونکہ وہ صرف احساس تشکر میں آ کر قیوم کے وجود کو برداشت کرتی تھی۔۔۔۔۔اور میں۔۔۔۔میں ان دونوں کے درمیان کیا تھا؟۔۔۔۔۔میں اپنے آپ کو کس طبقے کس کلاس کس گریڈ میں رکھتا؟۔۔۔۔شاید کرگس جاری کے لوگوں کی کوئی Catagory نہیں ہوتی وہ تو محض لائین ہوتے ہیں نہ دائرہ نہ چوکور نہ مستطیل۔۔۔محض لائین۔۔۔۔جو ان دائروں کی مستطیلوں کی سرحدیں متعین کرتی ہے۔

اس وقت سفید چادر میں ملبوس نوفٹ کا ایک آدمی مشعل لیے سامنے ایک جھاڑی سے نکلا اس کے سر پر کوئی بال نہ تھے اور وہ دائرے میں چلتا تھا اس نے تین مرتبہ اپنی مشعل اونچی کی اور پھر واپس جھاڑی میں گھس گیا۔۔۔۔اس وقت پتہ نہیں کیوں میرے اندر ایک گہرا گیان پیدا ہوا۔جیسے استخارہ کر لینے کے بعد گومگوں کی حالت ختم ہو جاتی ہے میرے اندر آفتاب نے گھس کر دو چار ہاتھ کراٹے کے مارے اور قیوم کو ختم کر دیا۔اس کے بعد میرے اندر آفتاب ایسے بھرتا گیا جیسے بوتل میں پانی۔۔۔ سر کی آخروٹی ہڈی سے لے کر پیروں کی پیچیدہ ہڈیوں تک آفتاب بیٹھ گیا۔اس کے بعد اس آفتاب کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔۔۔جس وقت وہ چاہتا چلا جاتا اور قیوم سٹنڈ ٹو ہو جاتا۔جس وقت وہ آتا قیوم خود ہی ڈرائیور کی سیٹ چھوڑ کر پچھلی نشست پر جا بیٹھتا۔

اس رات کے بعد مشعل والے جن کو کھلی آنکھوں دیکھا اور آفتاب اور قیوم کی ادلی بدلی سے لطف اٹھانا میرا محبوب مشغلہ بن گیا۔۔۔اس وقت کو سیمی جانتی تھی۔

۔۔۔پہلے میں نے قیوم بن کر اس کے دل میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔لیکن وہ یلغار بے سود تھی۔اب میں نے آفتاب بن کر بھیس بدل کر اس پر شبخون مارا

اور اس کی ایک ایک بوٹی اتار لی ۔۔۔ میں نے اس کی اداسیوں کو چوم چوم کر اس کے وجود سے اکھیڑنا چاہا۔لیکن جو بیمار عشق ہوتے ہیں ان پہ اس انٹی بائیوٹک کا اثر نہیں ہوتا ۔۔۔ ان کی اداسی کوئی پوشیدہ پینٹ نہیں جسے کھرچ کر نئے پینٹ کی تہہ جما دی جائے ۔۔۔ جوں جوں میں اسے چومتا۔وہ ہر ہر اداسی کے ساتھ اپنے وجود کی ایک ایک اینٹ بھی اتار پھینکتی جاتی حتیٰ کہ صبح کے قریب وہ صرف ملبہ رہ جاتا۔ پرانی اینٹوں کا تتر بتر ملبہ۔

عموماً محبت میں ناکامی کے بعد لوگ اپنی ہی نفی اور اپنی ذات کی تذلیل میں مصروف ہوجاتے ہیں ۔۔۔ جب بند سیپی سے برآمد ہونے والے آبدار موتی کو اصل خریدار نہیں ملتا ۔۔۔ تو پھر موتی اپنا آپ ریت کے حوالے کر دیتا ہے یہاں لہروں کے ساتھ رلنے کے علاوہ اس کی اور کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ناکام عاشقوں کو جسم پر جملہ حقوق محفوظ لکھوانے کی حاجت نہیں رہتی ۔۔۔ وہ ہر کس ناکس کے ہو کر کسی کے نہیں رہتے ۔۔۔ رفتہ رفتہ اپنے جسم کی تذلیل میں انہیں لذت محسوس ہونے لگتی ہے ۔۔۔ زندگی کا ہر وہ رنگ جو انہیں اپنے آپ پر ہنسنے کا موقع دے انہیں دل سے مرغوب ہوجاتا ہے۔شراب عورت جواء کئی ذلتوں کی پریس سے مرد نکلتا ہے۔

محبت میں ناکام ہو کر عموماً عورت کے دل سے جسم کی حرمت عصمت اور عزت کو تصور جاتا رہتا ہے۔

کئی بار سیمی جیسی ماڈرن لڑکی کو علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اوپر لعنت بھیج رہی ہے۔

لیکن آہستہ آہستہ دھنستی وہ بھی چلی ہی جاتی ہے۔

سیمی کو بھی معلوم نہ ہو سکا ۔۔۔ کہ وہ میری داشتہ بن گئی ہے۔

اور میں بھی پوری طرح سمجھ نہ سکا کہ میں ہی اس کے کفن کا آخری کیل ہوں۔

میں کوٹھے کے فرش پر دری بچھائے پڑا تھا کہ بھائی کے دونوں لڑکے اوپر آئے ان کی نیکریں اور قمیضیں ایک سی تھیں۔شاید توام بھائی تھے۔کیونکہ ان کی شکلیں عادتیں، کپڑے بول چال سب ایک طرح کا تھا۔وہ تخت پوش سے ایک ہی سٹائل میں چھلانگ لگاتے تھے

''آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔''

پتہ نہیں کیوں بھابھی صولت۔۔۔۔بہت کم کوٹھے پر آتی تھیں؟

''کیا کام ہے۔''

''پتہ نہیں۔۔۔۔''بڑے بھائی نے کہا۔

''پتہ نہیں۔۔۔۔۔''چھوٹے بھائی نے نقل کی۔

''ادھر آؤ مسعود۔۔۔۔''میں نے محبت سے کہا۔

''ہم جا رہے ہیں۔۔۔۔''مسعود بولا۔

''ہم جا رہے ہیں۔۔۔۔''فرید نے بھی کہا۔

وہ دونوں باغ والے نوگزے کی طرح زن سے غائب ہو گئے۔تھوڑی دیر کے بعد سفید طباق چہرے پہ چھائیوں کی تتلیاں سجائے بھابھی صولت آئیں۔یہ عورت اس قدر سنجیدہ نہ ہوتی تو مزے دار ہو سکتی تھی۔

''قیوم۔''

''میں آ رہا تھا جی۔۔۔۔وہ ذرا۔۔۔۔''

''کوئی بات نہیں۔''

''بیٹھے بھابھی۔''

بھابھی صولت کھڑی رہیں

''تم جانتے ہو۔ابا جی کی زمینوں سے اب کچھ نہیں ملتا۔۔۔مختار صاحب مجھے یہ

اخبار دے گئے ہیں اس میں جو نوکری ہے اس کے لیے عرضی دے دو آج ہی۔"

"آپ۔۔۔۔آپ چاہتی ہیں۔۔۔۔میں یہاں سے چلا جاؤں۔۔۔۔" میں نے سوال کیا۔

"ہے نا پاگل۔۔۔۔ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اب تم بے کار نہ رہو، نوکری کر لو۔۔۔"

میرے سامنے اخبار رکھ کر بھابھی صولت چپ چاپ نیچے چلی گئی۔

اخبار میں ریڈیو سٹیشن کی طرف سے پروڈیوسر کی آسامی کا اعلان چھپا تھا۔۔۔۔ اس نوکری کے لیے میری تعلیمی سند کافی تھی لیکن پتہ نہیں یہ دن اور راتیں کیسے گزر رہی تھیں۔ میں کہیں پارٹ ٹائم نوکری تو کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کسی مستقل نوکری کے لیے ابھی ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔

رات گئے تک میں کوٹھے کے بیرونی صحن میں ٹہلتا رہتا۔۔۔ چاند رات میں گھر کی چھت سے لگ کر جب چاند مجھے دیکھتا تو طے کرتے میں میرا سایہ گدھ کی طرح نظر آتا۔ میری انگلیاں ہونٹ دانت سب مسلسل سگریٹ نوشی کے باعث براؤن ہو چکے تھے۔ میں نے ان لمبی راتوں میں ہیمی سے لے کر Abiogeneus تک ہر مسئلے پر دماغ کو کھپایا تھا ان سوچوں کی وجہ سے میرے وجود کی حالت بھوے سے بھرے ہوئے مراد چیتے جیسی ہو جاتی۔۔۔ جسے دیکھ کر بچے ڈرتے ہیں اور جو بالکل بے ضرر ہوا کرتا ہے۔

بھائی مختار اور ان کا گھرانہ بڑے سکھی لوگ تھے۔

بھائی مختار اپنے گھر بیوی اور بچوں سے پیار کرتے تھے۔ انہیں اپنی ساری ملکیت سے پیار تھا۔ متوسط عقل، متوسط اخلاقی قدریں ڈیموکریسی کی پرستش اور سرمائے دار نظام کی برکتوں کے سہارے ان کا گزارا چلتا تھا۔۔۔۔ بھائی مختار کی ساری منزلیں مادی تھیں۔۔۔۔ وہ سانڈھے سے گلبرگ تک پہنچنا چاہتے تھے۔۔۔ ان کے

سامنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کا گوں تھا موٹر سائیکل سے جاپانی کار تک کا سفر، بیوی کے کپڑے زیورات کی فکر، سوسائیٹی میں اچھی پوزیشن اور ساکھ کے لیے کوشش اپنی نوکری میں سالانہ رپورٹ کی عمدگی اور سال بہ سال ترقی کے امکانات کے لیے جدوجہد۔۔۔۔۔نچلی منزل میں کبھی چاند نے شکل نہ فکھائی تھی۔۔۔۔وہاں دن چڑھتے ہی چیونٹیوں کا سفر شروع ہو جاتا۔مختار بھائی تفریح کے وقت ٹرانسسٹر نستے۔جس طرح کاسٹیم جیولری سے عورت میں کچھ ٹین پن کچھ سنتھیٹل فائبر شامل ہو جاتا ہے اسی طرح زیادہ ریڈیو سننے والوں کے نکتہ نظر بڑے عقلی، مادی، جمہوریت پسند ہو جاتے ہیں وہ ریڈیو پر ہونے والے مباحثوں سے ضمنی مسائل چن کر باتیں کرتے ہیں۔۔ان کی زندگیوں سے چاند کا سفر ختم ہو جاتا ہے صرف چیونٹیوں کی منزلیں باقی رہ جاتی ہیں۔

میرا خیال تھا کہ مجھے زیادہ دیر تک نوکری کی ضرورت نہ ہوگی۔کیونکہ اندر ہی اندر مجھے شبہ تھا کہ جس طرح میں رات رات بھر تصور جاناں کیے ہوئے بیٹھا رہتا ہوں۔یہ کیفیت مجھے زیادہ دن زندہ رہنے کی مہلت نہیں دے گی۔پکی نوکری، ترقی، پھر اس نوکری کی دیکھ ریکھ یہ سب کچھ میرے حالیہ پروگرام کی مکمل نفی تھا۔اس کے باوجود بھائی مختار کو خوش کرنے کے لیے میں نے ریڈیو سٹیشن کی نوکری کے لیے درخواست بھیج دی۔

سیمی کچھ دنوں کے لیے لاہور آئی تھی لیکن جلد ہی اس نے پنڈی استعفیٰ بھجوا دیا اور وائی ڈبلیو سی اے میں اپنا کمرہ لے کر رہنے لگی جب بھی میں اس سے پوچھتا کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے؟ تو وہ بیزار ہو کر جواب دیتی۔۔۔۔"کوئی ارادہ نہیں۔۔۔"

"پھر بھی۔۔۔۔کوئی نوکری کوئی۔۔۔۔اور پروگرام۔"

وہ چپ رہتی جیسے اندر ہی اندر اس نے کوئی پروگرام بنا رکھا تھا لیکن وہ اسے مجھے بتانا نہ چاہتی تھی۔

ایک روز میں نے بہت عملی بن کر کہا۔۔۔۔"آج کے اخبار میں ایئر ہوسٹس کا Job نکلا ہے تم اس کے لیے اپلائی کیوں نہیں کر دیتیں؟"

وہ مسکرائی پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔۔۔۔"اچھا Idea ہے۔"

"سچ سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں تمہارا فگر بھی اچھا ہے انگریزی خوب بولتی ہو تمہیں بہت جلد Select کر لیا جائے گا۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہتی گئی۔۔۔۔"پھر میں فارن فلائیٹ پر لگ جاؤں گی۔۔۔کراچی بیروت لندن۔۔۔لندن فرانک فرٹ تہران کراچی۔"

پھر کسی روز آفتاب میرے طیارے میں چڑھے گا اپنے چھوٹے سے بیٹے کی انگلی پکڑ کر۔۔۔اسکی زیبا کے ہاتھ میں وینٹی بکس ہوگا۔۔۔وہ دونوں ساتھ ساتھ سیٹوں پر بیٹھیں گے اور میں ان کے سامنے ناشتے کی ٹرے لگاؤں گا۔۔۔کافی کی پیالی بنا کر دوں گی۔ آفتاب مجھ سے کہے گا ذرا اس ہفتے کا ٹائم تو پکڑا دیجیے۔۔۔۔میں جب اسے ٹائم پکڑانے کے لیے بڑھاؤں گی تو اس کی بیوی پہلے رسالہ مجھ سے پکڑے گی اور کہے گی دیکھئے ہمارے نومی کو ذرا باتھ روم لے جائیے۔

"چپ کرو یہ بکواس۔"

"اور جب میں نومی کو باتھ روم میں لے جاؤں گی تو وہ مجھے کہے گا آپ مجھے چوم کیوں رہی ہیں مس۔"

"تم اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے کیا کچھ سوچتی رہتی ہو۔"

وہ بولتی چلی گئی۔۔۔"اور جب میں نومی کی نیکر کے بٹن بند کر کے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کولون سے بھیگے ہوئے ٹیشو سے پونچھوں گی تو وہ پوچھے گا مس آپ رو کیوں رہی ہیں۔۔۔بتائیں ناں کسی نے کچھ کہا ہے؟"

''خدا کے لیے یہ۔۔۔۔ باتیں چھوڑ دو''

''ٹھیک ہے۔۔۔۔ٹھیک ہے مجھے ایئر پوسٹس لگنا چاہیئے یہی میری سزا ہے یہی یہی یہی۔''

میں اپنے مشورے پر عجیب طرح سے شرمندہ ہو گیا

دراصل آفتاب سے بچھڑ کر سیمی کشش ثقل سے آزاد ہو گئی تھی۔۔۔۔لیکن کشش ثقل سے آزاد ہونے اور آزاد رہنے کے بعد جو بے سمتی پیدا ہوتی ہے اس سلسلے میں اسے کوئی ٹریننگ نہ دی گئی تھی فلا بازوں کو فضائی سفر میں جہاں اور بہت سی تربیت دی جاتی ہے وہاں دو طرح کی ٹریننگ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جب وہ فضا سے نکل کر خلاء میں جاتے ہیں اس وقت جسم کا اندرونی پریشر تو رہتا ہے لیکن اس کا کاؤنٹر بیلنس کرنے کے لیے بیرونی دباؤ نہیں رہتا ایسے میں تمام شریانوں کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اندر اور باہر کے پریشر برابر رکھنے کے لیے خاص قسم کے Space Suit بنائے جاتے ہیں اور ان کے استعمال کا طریقہ سکھایا جایا ہے دوسرا مسئلہ کشش ثقل سے آزاد ہو کر بے سمت وقت گزارنے کی ٹریننگ ہوتی ہے اس کی ٹریننگ کے لیے خلاء بازوں کو ایک Capsule میں بند کر کے چھوٹی چھوٹی ڈھبریاں کئے روٹی کھانے خلائی جہاز میں آنے جانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے

سیمی کے اندر پریشر بہت بڑھا ہوا تھا

سیمی کشش ثقل سے آزاد ہو چکی تھی۔

لیکن بے سمت زندگی گزارنے کی ابھی تک اسے کوئی ٹریننگ نہیں ملی تھی۔

وہ گویا ان دنوں مورفیا تلے سانس لے رہی تھی۔جہاں بیٹھ جاتی پہروں بیٹھی رہتی کہیں جب اس کی نظر جم جاتی تو پھر چینی گڑیا کی طرح اسی طرف دیکھے جاتی ایسے میں آفتاب کے نام کے علاوہ اور کوئی ٹیکہ کارگر نہ ہوتا۔اس خلائی دورے سے کئی کیفیتیں وابستہ ہوتیں۔خود ترسی، بیزاری، تنہائی پسندی، مردم گزیدہ محرومی۔۔۔

غرضیکہ آفتاب کی کشش باقی نہ رہی تو کئی سمتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن ہر سمت کے آگے ہمیشہ خلا ہوتا۔ خاموشی ہوتی۔۔۔ اندر کا پریشر بڑھتا چلا جاتا۔

ہم دونوں گھنٹوں پہروں، دنوں آفتاب کی باتیں کرتے رہتے اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں رہتا۔ میں تسلی آمیز محبت کے ساتھ اسے چومتا رہتا۔ وہ کبھی مدافعت نہ کرتی۔ بلکہ کبھی کبھی شکر گزاری کے ساتھ مجھے دیکھ لیتی۔ لیکن جونہی آفتاب کی باتیں ختم ہو جاتیں وہ یکدم اندر کی لفٹ بند کر کے کہیں اوپر چلی جاتی۔

ان دنوں وہ خود ترسی سے حسد کی طرف مائل تھی۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ سیمی کے ساتھ جو بھی وقت گزرا وہ ایک طرح سے بہت عجیب تھا بیرونی وقت کے مطابق کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوئے۔ لیکن اندر جو ایک ریگستانی کا سفر جاری تھا۔ اس میں ہم پڑاؤ پڑاؤ ٹھہرتے پتہ نہیں کہاں آنکلے تھے۔ شاید یہ جگہ پاکستان تھی ہی نہیں۔ بلکہ شمالی امریکہ کے جنوب میں کہیں رایو گرینڈ کے اردگرد کا پڑاؤ تھا جہاں پر ریڈ انڈین کے شامین قبیلہ کی روحیں اپنے اکتارے پر دریا کی روح کو بلا رہی تھیں۔۔۔۔ سیمی باہر نکل بے حس تھی لیکن جذباتی سیڑھیوں پر اس کا سفر بہت تھکا دینے والا تھا۔ اسی سفر میں اس کا ساتھ دینے کی وجہ سے میرا بدن چور چور رہتا۔ وہ اپنی محبت میں کئی ریگستان چھان چکی تھی۔

اب وہ حسد کی تپتی ہوئی سفید ریت پر بھاگ رہی تھی۔ آفتاب سوا نیزے پر تھا پیاس سے اس کے ہونٹ خشک تھے۔ فاصلے سے جیسم کے تودے جمی ہوئی برف کی طرح نظر آتے۔ لیکن قریب پہنچنے پر سب کچھ سفید ریت ڈھل جاتا تھا۔

ہر طرف جلا دینے والی پھونک دینے والی راکھ کر دینے والی حسد کی سفید ریت پھیلی تھی اور اس ریت پر سیمی سسی کی طرح ننگے پیر ننگے سر بھاگ رہی تھی بے سمت

ان دنوں سیمی مجھ سے ملتے ہوئے کتراتی تھی۔۔۔۔ وہ کسی فیصلے پر خ ﷺ دہی پہنچنے کی کوشش میں مبتلا تھی۔

جس وقت میں ریگل کے چوک میں بس پر سے اترا تو مجھے معلوم تھا کہ سیمی مجھے آج وائی ڈبلیو سی اے میں نہیں ملے گی۔؛ اس کے باوجود میں آہستہ آہستہ اس کے ہوسٹل کی طرف چلنے لگا۔ دھوپ میں اب حدت نہ رہی تھی اور سینٹ انتھونی سکول سے ملحق گرجا آج سورج کی کرنوں میں دھلا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک فادر سیاہ چغے میں ملبوس گرجے کے مرکزی پھاٹک کو کھول کر اندر چلا گیا گرجے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور میں سوچتا رہ گیا کہ اندر جانے والا کون تھا۔۔۔؟ دیسی عیسائی۔۔۔ امریکی فادر۔۔۔ یا ڈچ برادر۔۔۔؟ لوگ اپنے دیس کو چھوڑ کر کیوں پردیس میں جا بیٹھتے ہیں۔۔۔؟ پردیس میں کیا چیز انہیں باندھے رکھتی ہے۔۔۔؟ عقیدہ؟۔۔۔ محبت؟۔۔۔ عمارت۔۔۔ یا انا؟

اس مختصر سڑک کے اختتام پر پٹرول پمپ کے پاس میں بائیں مڑ گیا۔ لیکن پٹرول پمپ سے شارٹ کٹ کرنے سے پہلے میں نے پلازا سینما کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس وقت میں چاہتا تو سیدھا جناح باغ جناح جا سکتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا شاید سیمی ابھی وائی ڈبلیو سی اے میں موجود ہو پلازہ سینما میں ابھی ساڑھے تین بجے کا شو ٹوٹا تھا۔ فری میسن کی بلڈنگ سے لے کر پٹرل پمپ والے چوراہے تک کاریں۔ رکشا سائیکلیں پیدل سب بڑی افراتفری کے ساتھ جلدی گزر جانے کی آرزو میں ٹریفک کے لیے اڑچنیں پیدا کر رہے تھے۔

میں نے ساری بھیڑ کی طرف نگاہ دوڑائی اور جی میں سوچا۔۔۔ اس ساری خلقت کو علم نہیں کہ وائی ڈبلیو سی اے میں ایک دبلی پتلی لڑکی۔۔۔ ایک ماڈرن لڑکی اپنے آپ پر تیل چھڑک کر مرنے کے لیے تیار کھڑی ہے ہم شہر والے ایک دوسرے سے کتنے بے خبر تھے۔ پٹرول پمپ کے سامنے بڑے سائن بورڈ پر ایک پنجابی فلم کا اشتہار لگا تھا۔ ہیروین کی آنکھیں حیران کن حد تک سیمی جیسی تھیں۔ آفتاب کا نام سنتے ہی جیسی کیفیت سیمی کی ہوتی ویسی ہی سائن بورڈ والی لڑکی کی

آنکھوں سے عیاں تھی میں نے ہاتھ ہلا کر فلم والی کو خدا حافظ کہا اور وائی ڈبلیو سی اے چلا گیا۔

یہ ہوسٹل بھی چمگاڈروں کی آماجگاہ تھی۔

اس ہوسٹل سے لے کر فاطمہ جناح تک آزاد عورتیں اور لڑکیوں کا ٹریننگ کیمپ تھا گھروں سے بیزار، روزگار کی تلاش میں پریشان، ڈاکٹر بننے اور مستقبل سنوارنے کی آرزو میں بے قرار، عاشقوں سے رنجیدہ، شوہروں کی تلاش پر مصر، گھر رہتی تھیں رات کے پچھلے پہر جب کبھی میں یہاں سے گزراہوں مجھے فاطمہ جناح کالج سے لے کر وائی ڈبلیو سی اے کے ہوسٹل تک اور حضرت یعقوب زنجانی کے مزار تک آہوں کا ایک مرغولہ اس رقبے پر معلق نظر آیا خاموشی ہوتی تو ہلکی ہلکی سرگوشیاں اور آہیں بھی سنائی دیتی ہیں جیسے ایک ساتھ کئی چپو ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ہولے سے اتریں۔

ڈاکٹری سیکھنے والیاں چوک کے اس پار رہتی ہیں ٹائیپ کی کلاسوں میں حاضر باش رہنے والیوں سے کئی بار میرا ٹاکرا ہوا وائی ڈبلیو سی اے میں پلازہ سینما کے شو کے ساتھ ساتھ یہاں بھی کلاس ٹوٹا کرتی تھی۔۔۔ سب خوش لگتی تھیں۔۔۔ سب کی سب خوش فہمیوں میں مبتلا تھیں۔۔۔ شام کے باوجود اکثریت کے چہرے پر سیاہ چشمے ہوتے جو سائیکلوں پر تھیں وہ اپنے آپ کو زیادہ ماڈرن سمجھ رہی تھیں۔ جو پیدل تھیں وہ اپنے آپ کو زیادہ باحیا سمجھنے پر مجبور تھیں۔۔۔ لیکن سب کے چہرے پر کسی نہ کسی طرح کی Disillussionment ہلکی سی گرد۔۔۔ ازالہ سحر کی عدم میلان طبعیت۔۔۔ کی۔۔۔ ہلکی سی میک اپ کی تہہ۔۔۔

یہ تمام عورتیں لڑکیاں کسی نہ کسی طرح مردوں کے نارمل نیوکلس سے کٹی ہوئی تھیں ہوسکتا ہے ان میں سے بیشتر عورتوں کو مردوں کا قرب زیادہ ملتا ہو، لیکن معاشرے کے رسمی طریقے کے مطابق وہ Carrier گرلز تھیں۔ ایسی مینڈکیاں جن کو ہلکا ہلکا زکام ہو چکا تھا وہ اعلانیہ سگریٹ پیتی تھیں کماؤ سپوت کی طرح گھروں میں پیسے بھیجتی

تھیں ان کے بھائی چچا ماموں نہ جانے کون تھے۔۔۔ کہاں تھے اور اگر تھے تو کس حد تک ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہو سکتے تھے؟۔۔۔ یہ سب تو چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح پھڑک رہی تھیں۔۔۔ تڑپ رہی تھیں اور اپنے اصلی رسمی نیوکلس کی تلاش میں تھیں۔

سیمی بھی ان ہی چہروں میں سے ایک تھی۔۔۔ اس کے ٹھہرے پر بھی ہلکی سی گرد رہتی تھی میک اپ کی۔۔۔ ازالی سحر کی۔۔۔ عدم میلان طبعیت کی۔۔۔ فریب آرزو کی۔۔۔۔

میں نے پورچ میں کھڑے ہو کر دوسرا سگریٹ پیا۔ اندر پیام بھجوایا اور گو مجھے معلوم تھا کہ سیمی اندر نہیں ہے پھر بھی میں منتظر رہا۔ اور جب تصدیق ہوگئی کہ وہ صبح کی کہیں گئی ہوئی ہے تو میں ٹائپ سیکھنے والی لڑکیوں میں راستی بناتا جناح باغ کی طرف چل دیا۔

مین پھاٹک میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک نگاہ ہمایوں رسالے کے مسکن پر ڈالی۔۔۔ بڑے بڑے درختوں سے گھرا ہوا گھر۔۔۔ یہاں سے کبھی ہمایوں رسالہ نکلتا تھا۔

ہمایوں رسالہ۔۔۔ اودھ پنچ؟۔۔۔ ادبی دنیا۔۔۔ یہ سب کہاں تھے۔ ان کے خالق کہاں تھے؟ ہر عہد میں کچھ ایسے لوگ ضرور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جو اپنے عہد کے لوگوں کو بڑے فلک پیما لگتے ہیں مگر رفتہ رفتہ وقت انہیں یوں ڈھانپ لیتا ہے جیسے اونچی پرانی قبروں میں اونچی اونچی گھاس آگے آئے اور کتنے گر جائیں قبریں باقی رہیں لیکن دیئے جلانے والے کسی اور قبرستان میں جا کر رت جگا کریں۔ کچھ بڑے لوگ تو اپنا نام وقت کی لہروں پر ثبت کر جاتے ہیں کچھ سیمی کی طرح کوئی نشان چھوڑ کر نہیں جس سکتے۔

کسی کا عشق سیمی سے کیسے بہتر تھا؟

اگر سیمی مر گئی میں نے پہلی بار سوچا تو کیا میرے علاوہ کوئی جان سکے گا کہ اسے کیا بیماری تھی ۔۔۔۔؟ میرے پاس تو نہ کوئی ہمایوں تھا نہ اودھ پنچ نہ ادبی دنیا۔ پھر میں تو اس کے لیے اپنے عہد والوں تک بھی کوئی داستان چھوڑ کر نہ جاسکوں گا اپنے عہد میں بھی اس کے عشق کی داستان فلک پیا نہ ہو سکے گی ۔۔۔۔ یہ بھی کیسا المیہ تھا؟

باغ بہت رونق تھی ۔منٹگمری ہال پر شام کی آخری روشنی پڑ رہی تھی ۔ بار بار کہیں سے پاپڑ بیچنے والے کی آواز باغ کی خاموشی پر گرتی اور برف کی طرح چکنا چور کر دیتی تھی ۔لذت کا باغوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے ۔ جب گھروں کی گھٹن بہت بڑھ جاتی ہے جب مرد کسی عورت سے بند کمرے میں مل نہیں سکتا یا ملنا چاہتا تو پھر وہ باغوں کا رخ کرتا ہے باغوں میں انتظار، وصل، بجوگ اور نیوگ کے بونے جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھے ملتے ہیں درخت پودے گھاس پھول سب ان عصرتیوں کی کھیلوں میں بار بر کے شریک رہتے ہیں اسی لیے باغوں کی خوشبو میں ایک سحر ہوتا ہے یہاں کئی کہانیاں ایک ساتھ بولتی ہیں جیسے ستاروں کے اوپر والے تار مضراب سے چھیڑو تو تربیں آپ ہی آپ بول اٹھتی ہیں۔

میں نے سارے میں تلاش کیا لیکن سیمی کہیں بھی نہیں تھی ۔۔۔۔ میں نے تیسرا سگریٹ سلگایا اور کافور کے درخت تلے بیٹھ گیا ۔لوگ شاید اپنے گم شدہ وجود، اپنی سائیکی آزادی اور جبلی آرزوؤں کی تلاش میں گھوم رہے تھے ۔ کیونکہ آج خلاف معمول سڑکوں پر بہت ہجوم تھا لوگ کس خوشی سے باغوں کا رخ کرتے ہیں اور کتنی جلدی کیسی مایوسی کے ساتھ لوٹ جاتے ہیں شاید مصنوعی باغوں میں باڑھوں سے، فواروں میں، بنچوں پر، کیاریوں سے کیفے کی میز کرسیوں کے اوپر نیچے باغ میں پھیلی پکی سڑکوں سے مہذب شہری زندگی کا بلاوا اتا رہتا ہے ہمارے اندر کا ریڈیو اس آواز کو ہوا سے پکڑتا رہتا ہے ایسے میں سیر کرنے والے دوستوں میں گھٹتے ہیں ۔فطرت سے رشتہ بحال کرنے والے بادل، درخت پھول ہریادل، پرندو سب اسے جنگلوں

کی طرف کھینچتے ہیں اور مصنوعی فوارے، سڑکیں، کیفے، موزیک، کی پتھریلی بنچیں، اسے تہذیب کلچر اور شہر کی طرف موڑتی ہیں اسی کشمکش میں کئی بار اندر سے انسان بدکے ہوئے گھوڑے کی طرف الف ہو جاتا ہے لیکن چھوٹ نہیں سکتا۔

باغوں کی سائیکی بہت اداس ہوتی ہے رکے ہوئے آنسو بند خیالات، جمع ہوئی آہیں۔۔۔قدرتی اداسی پولن کی طرح جھڑتی ہے اسی لیے کسی عہد کسی قوم کسی شہر کی سائیکی کو سمجھنے کے لیے اس کے باغوں میں بیٹھنا بہر ضرور ہے۔

جس وقت رات گئے سیمی آئی تو مجھے پہچانے بغیر میرے پاس سے گزر گئی۔۔۔ میں نے سگریٹ کی خالی ڈبیا درخت تلے پھینکی اور اس کے تعاقب میں چلنے لگا۔ حالانکہ میں اس سے صرف دو قدم پیچھے تھا۔ لیکن میں نے اسے آواز نہ دی۔ بابا ترت مراد کے مزار کے پاس جا کر وہ اچانک رک گئی اس نے جوتیاں اتاریں۔ سر پر ایک پھول دار رومال باندھا اور مزار کی دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ بڑی دیر تک وہ وہاں ایک ٹرسٹ کی طرح کھڑی قوالی سنتی رہی۔ پھر سر سے پھول دار ریشمی والا چشمہ اتار کر اور لکڑی کی ہیل والی جوتیاں پہن لیں میں نے اسے بلانا چاہا لیکن کوئی شے مجھے بھی مانع رکھ رہی تھی۔

وہ بجری کو اپنی کڈھب جوتیوں سے کوٹتی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ پھر اس نے رک کر دیہاتی لوگوں کی طرح ہاتھ سے ناک صاف کیا تو میں نے آگے بڑھ کر اسے رومال پیش کر دیا۔

''تم کب آئے قیوم؟۔''

''میں تمہارے ساتھ تھا۔''

''کب سے۔''

''کافی دیر سے''

''پھر بھی؟۔۔۔تم مجھے نظر کیوں نہیں آئے''

''کیونکہ نظر آنے اور نظر نہ آنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی۔''

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ لب خشک تھے اور میک اپ کی ہلکی تہہ کے باوجود وہ تمام تر بے رونق تھی۔

''تم کو معلوم ہے مجھے لگتا ہے آج کل میں زلزلہ آئے گا لاہور میں۔''

''کیوں؟''

''بس لگتا ہے بڑی دیر ہو گئی زلزلہ آئے۔''

''زلزلے کی یہ کوئی خاص وجہ نہیں۔''

وہ کافور کے درخت کے پاس پہنچ کر عادتاً گراؤنڈ میں اتر گئی۔

''کیا ہی اچھا ہو اگر اس بار زلزلے میں گورنمنٹ کالج کا ٹاور گر جائے۔''

''کیوں کیوں۔۔۔۔کیوں۔''

''ہائے کچھ تو گر جائے اس سال کرسمس سے پہلے پہلے۔''

''کرسمس کی کیا شرط ہے سیمی۔''

''پچھلے کرسمس کو میں آخری بار آفتاب سے ملی تھی۔۔۔۔قائداعظم کی سالگرہ والے دن اس سال بھی کچھ ہونا چاہئیے بخدا۔۔۔۔اور کچھ نہیں تو گورنمنٹ کالج کا ٹاور ہی گر جائے۔''

''یا بخاری آڈیٹوریم۔۔۔۔میں آگ لگ جائے۔''

''ہاں کچھ تو ہو۔۔۔۔کچھ تو ہو پرانی یادوں کی یاد تازہ کرنے کو۔''

بڑی دیر تک ہم سو مرتبہ دہرائی ہوئی باتیں از سر نو یاد کرتے رہے آفتاب کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ لیکن آج اس پر حسد غالب تھا۔ اس کا لب و لہجہ زہریلا اور باتیں کڑوی تھیں۔ حسد کی گیس پیلے رنگ کی ایسی مسموم گیس ہے جس میں کاربن مونو آکسائیڈ کی تمام خوبیاں موجود ہیں جہاں یہ موجود ہو انسانی پھیپھڑے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پچھلی ملاقات سے اب تک اس گیس کے اثر تلے وہ بہت بدل گئی

تھی۔ ماتھے پر سوچوں کی وجہ سے ایک نس ابھری ہوئی تھی۔ لہجے میں قطعیت اور لب ٹیڑھے تھے ہاتھوں میں ہلکا ہلکا پسینہ تھا جیسے وہ نوکری کا انٹرویو دینے آئی بیٹھی ہو۔

''یہ مجھے ہوا کیا ہے۔۔۔ میں تو کبھی حسد سے آشنا نہ تھی۔۔۔ بتاؤ قیوم کیا ہوا ہے؟ اب مجھے آفتاب کا خیال کیوں نہیں آتا۔۔۔۔ میں سارا دن زیبا کے متعلق کیوں سوچتی رہتی ہوں۔۔۔ ایک بات بتاؤں''

''کہو۔''

''زیبا حاملہ ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا۔''

''بس مجھے پتہ چل جاتا ہے۔۔۔ پہلے ہی۔۔۔ مجھے ہوتا ہے ناں پتہ۔۔۔ ۔وہ آج کل سونف کھاتی ہے سارا دن۔۔۔ ہتھیلی پر لیے پھرتی ہے سونف۔''

''چپ کرو۔''

''مجھے نظر آتی ہے زیبا۔۔۔ میں اسے دیکھ سکتی ہوں پانچ مہینے کی Pregrancy کے ساتھ۔''

''لیکن تم نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

''دیکھا ہے دیکھا۔۔۔۔ ہے میں تو اسے فوراً پہچان لوں لاکھوں میں۔''

وہ چپ چاپ ہاتھ مروڑنے لگی۔

سامنے جھاڑی میں سے ایک نوگزا آدمی نکلا۔ اس نے بدھ مت کے بھکشوں جیسا لباس پہن رکھا تھا ہاتھ میں اونچا بانس تھا۔ اس بانس پر ایک سبز رنگ کی مشعل روشن تھی۔ وہ دائرے میں چلتا رہا اور پھر مشعل کو نگل کر جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔۔۔ تھوڑی دیر مشعل سمیت جھاڑی چکر لگاتی رہیاور پھر جھاڑی مشعل نوگزا سب کچھ غائب ہو گیا۔

''یہ سب کیا ہے؟''

''جو سامنے ہو رہا ہے۔''

''نہیں جو میرے دل میں پھوٹ رہا ہے لاوے کی طرح۔''

''حسد میں یہ خوبی ہے سیمی کہ انسان اس میں کھو کر محبوب کے تصور کو کھو بیٹھتا ہے۔ پھر رقیب کے خیالات غالب رہتے ہیں یہ خیالات اس قدر غصیلے زہر آلود اور ہم انگیز ہوتے ہیں کہ محبت کی نازک سوچیں اس گیس بھری فضا میں سانس نہیں لے سکتیں۔ ایسے میں انسان محبت کرتا ہے لیکن بازگشت سے۔۔۔ اصل آواز سے نہیں۔۔۔ اصلی محبوب تو کہیں اندر ہی اندر گم ہو جاتا ہے حسد کا محبت سے کیا تعلق؟''

وہ احسان مندی سے بولی۔۔۔ ''تم بڑے ذہین ہو قیوم۔۔۔ سوشیالوجی کی کلاس میں بھی سب تمہاری تعریف کرتے تھے۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن پتہ نہیں تمہاری ان باتوں سے میری تسلی کیوں نہیں ہوتی۔''

اس کے ماتھے پر چڑھی ہوئی نس پر میں نے انگلی پھیری۔

''یہ بتاؤ اب میں کروں تو کیا کروں''

''اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔ تمہیں کیا پتہ قیوم۔۔۔ تم میری کتنی بڑی کمزوری بن گئی ہو اگر میں تمہیں نہ ملوں۔۔۔ اگر میں کسی سے آفتاب کی باتیں نہ کر سکوں تو اس کی یادوں کے پریشر تلے میں پھٹ جاؤں میں۔۔۔ سارے شہر میں اس کی باتیں کس سے کروں قیوم۔۔۔ بتاؤ ناں؟''

میں نے کمینگی کے ساتھ کہا۔۔۔ ''تم مجھے صرف اس لیے ملتی ہو۔۔۔ سیمی کہ تم مجھ سے اس کی باتیں کر سکو۔''

چور سپاہی کے کھیل میں وہ اچانک پکڑی گئی۔

''اور بھی وجہ ہے۔۔۔ وجہ ہے ایک اور۔۔۔ پر پر۔۔۔''

''اور کیا وجہ ہے سیمی۔۔۔'' میں نے امید سے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ اس

وقت وہ اعتراف کر لے گی کہ رفتہ رفتہ وہ میری محبت میں مبتلا ہو گئی ہے اور اب وہ آفتاب کا نام بھی لینا نہیں چاہتی لیکن اس کی بات سن کر میرے اندر پہیہ جام سٹرائیک ہونے لگی۔۔۔۔

''اگر تم نہ ہوتے قیوم۔۔۔۔اگر تمہاری ہمدردی محبت نہ ہوتی تو میں کبھی کی خود کشی کر لیتی۔تمہاری محبت نے مجھے یہ قدم اٹھانے نہیں دیا جب مجھے پترا یقین ہو جاتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں۔۔۔۔تو یہ تمہاری ہمدردی ہے تمہاری محبت جو مجھ میں خود اعتمادی بحال کرتی ہے۔تم سمجھ نہیں سکتے قیوم میری انا کس حد تک مجروح ہو چکی ہے مجھے اپنی شکل، عقل، عادات، گھرانے اپنے مکمل وجود سے نفرت ہے۔ مجھ میں اگر کچھ بھی اچھا ہوتا تو کیا آفتاب مجھے چھوڑ کر جاتا؟۔۔۔۔جا سکتا۔۔۔۔؟ بتاؤ نا قیوم بولو۔۔۔۔کبھی وہ مجھے چھوڑ سکتا؟''

گفتگو کا کرونا میٹر پھر آفتاب کی ٹک ٹک بجانے لگا۔

''میں شاید احساس کمتری کا شکار ہوں ان دنوں۔۔۔۔میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہوں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔پھر بتاؤ ناں۔۔۔۔تم میرے محسن نہیں تو اور کیا ہو۔۔۔۔تم نے تمہاری محبت نے۔۔۔۔مجھے روک رکھا ہے اس دنیا میں۔''

فقتھ ائیر کی سیمی سے یہ لڑکی کتنی مختلف تھی۔گفتگو میں۔۔۔۔لباس میں کردار میں۔

''صرف محسن؟''میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''اور اور۔۔۔۔کیا؟''لاتعلقی سے اس نے منہ پھیر لیا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ اگر اوپرے دل سے بھی انکا روجود مان لیتی تو بھی میرے لیے بہت کافی ہوتا۔

''قیوم کیا وہ بھی ایسی باتیں کرتا ہو گا زیبا سے؟''

میں اس نام سے اچھی طرح آشنا تھا۔بارش سے پہلے چلنے والا جھکڑ۔۔۔۔جبلی

کے کھمبے، چھتنارے درخت بوسیدہ دیواریں گرانے والی ہائی وولٹیج کی بجلی۔

''کیسی باتیں سیمی؟''

''ویسی باتیں بیڈروم ٹون میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔۔۔کرنے نہ کرنے والی سب باتیں۔۔۔''

''کیا تم بے وفا ہو سیمی؟''

''نہیں قیامت تک نہیں۔۔۔مجھے آفتاب سے محبت ہے اور قیامت تک رہے گی لیکن وہ بے وفا ہے۔''

میں نے کہنا چاہا کہ اچھی وفا ہے کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس کا سمجھ رہی ہو۔لیکن کوئی چیز میرے اندر بتا رہی تھی کہ وہ سچی ہے اور درست کہہ رہی ہے۔

''شادی کا خوشی سے اور محبت کا اختیار سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔حقوق و فرائض کا وارفتگی سے کیا ناطہ؟''

اس وقت میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نئے بوٹ پہن کر سیدھا ساندھا کلاں سے چلا آرہا ہوں۔میرے انگوٹھے کے قریب گھٹے پڑ گئے ہیں۔جن میں اس وقت بہت درد ہو رہا ہے۔لیکن وہ کب سنتی۔کب سمجھتی؟

''کچھ کہو ناں۔۔۔کوئی فیصلہ کن بات جس سے یہ حسد کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے قیوم بولو۔۔۔تو سہی۔۔۔اپنے جوتوں کو پھر Admire کر لینا۔''

میں نے لمبی سانس لی اور اس کی تشفی لے کیے کہا۔''ہر شخص کی یہی مجبوری ہوتی ہے سیمی۔وہ ساری عمر ایک ہی سزا نہیں بھگت سکتا ایک ہی خوشی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔پھانسی کے تختے سے اتر کر بجلی کر کرسی پر بیٹھنا۔۔۔بجلی کی کرسی سے اٹھ کر صلیب چڑھنا، تہہ آب ہونا اور نہ مرنا۔پانی کی گہرائیوں سے نکل کر سر کو ہسارے سے چھلانگ لگا جانا۔سیمی جان ہم سب ایک کرب سے نکل کر کسی دوسری

تکلیف کے حوالے ہو جانا چاہتے ہیں۔ ایک خوشی سے منہ موڑ کر کسی اور خوشی میں ڈوبنا چاہتے ہیں۔ یہ انسان کے لیے اتنا ہی نیچرل ہے جیسے وہ ایک ٹانگ پر ہمیشہ کے لیے کھڑا نہ رہ سکے۔ آفتاب بھی تمہارے ناآسودہ لاحاصل عشق کے کرب سے نکلنا چاہتا تھا۔ شاید اس تکلیف سے نکل کر وہ پہلے سے بھی زیادہ مصیبت میں ہو لیکن انسانی دل ایک ہی مصیبت ایک ہی غم ایک ہی بوجھ ساری عمر نہیں اٹھا سکتا۔ کرب بھی رنگ بدلتا ہی رہے تو قابل برداشت رہتا ہے۔"

"تمہارا بہت بڑا دل ہے قیوم ---- ہپوپوٹمس جتنا ---- میں تم سے محبت نہیں بھی کرتی پھر بھی تم مجھے تسلیاں دیتے رہتے ہو ---- تھینک یو ---- تھینک یو ---- تھینکس۔"

اس وقت میں سیمی کا کف اوپر کر رہا تھا

معاً میرے دل میں خیال آیا کہ قلب کا راستہ جسم سے ہو کر نہیں گزرتا۔ قلب تک پہنچنے کے لیے صرف ٹیلی پیتھی، وجدان، ہپنوٹزم میزمرزم کی ضرورت ہے۔ جسم روحانی عمل کو زمین میں ارتھ کر دیتا ہے میں نے بڑی تقدس سے سیمی کے کف بند کیے اور دل میں عہد کیا کہ اب میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔

انسانی روح کے لیے سب سے زیادہ مقطر اور طیب محبت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب سے بنی قابیل بنی ہابیل پر غالب آئے اصلی اور صادق محبت کا چشمہ قریب قریب سوکھ گیا اب جا بجا ہوس تھی ---- جنسی تجربات تھے ---- معکوس رابطے، نافراہمی اور ناآسودگی کی محبت تھی لوگ ایک دوسرے کو لتا جیض کی طرح استعمال کرتے اور چھوڑ جاتے۔ محبت میں کجی اور کم فہمی کا رواج عام ہو گیا۔

محلوں میں ان کی ناآسودگی کہانیاں پھرنے لگیں۔ اخباروں میں بے امن قصے بیان ہونے لگے۔ جب سے بنی قابیل غالب آئے تھے سچی اور پاک محبت کی بارش

کے لیے کوئی دعا نہ مانگتا۔ سب ہی جنسی محرومی، قلبی تھکن اور روح کے کلاء کی وجہ سے دیوانے ہو رہے تھے ہر وہ شخص جس کی روح میں حرام مال پہنچ رہا ہو، چہرے بشرے سے راجہ گدھ بن جاتا ہے۔۔۔۔ اس کی آنکھیں دھنسی ہو یہ چہرہ سبزی مائل پیلا، بال بکھرے ہوئے اور ہڈیاں نمایاں ہوتی ہیں روح کا حرام کھانے والا ہزاروں میں پہنچانا جاتا ہے ہزاروں میں لاکھوں میں پھر عجیب تھا کہ میرا ہمشکل سانڈھا کلاں میں دوسرا کوئی نہ تھا۔

میں اپنے محلّہ کا اپنے کالج کا سب سے بڑا راجہ گدھ تھا!

سیمی کی نا آسودہ محبت اب اپنے اثرات دکھانے لگی تھی۔۔۔۔ گو اسے ملے مجھے کئی دن ہو چکے تھے لیکن میں ابھی تک اس کے مورفیا تلے پھرتا تھا۔ چاند راتوں رات کے پچھلے پہر مجھے Visious دکھائی دینے لگے **Ballueination** کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی مجھے اپنا سر گھومتا نظر آتا۔۔۔۔ گلاس کے پانی میں مجھے چھوٹے چھوٹے مائیکروسوپ سے نہ نظر آنے والے جرثومہ صاف صاف نظر اتے۔۔۔۔۔ پھر بجلی کی تار پر آنے والی چھپکلی ڈائنا سوا س جیسی بڑی اور مہیب دکھائی دیتی۔ آسمان پر بادلوں کے رنگ آپس میں جڑ کر بڑی بڑی ملبئہ ناز شاندار عورتوں کی تصویریں بنکر لٹک جاتے اور اخبار کی اصلی سرخیوں کے اندر اور الفاظ اور ان الفاظ کے اندر اور تصویریں پر مخذ نظر آتیں۔ ان دنوں میں تلاوت الوجود میں مبتلا تھا بچپن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات اور ان واقعات سے منسلک تمام لوگوں کی ورق گردانی میں دن کا زیادہ حصہ گزرتا ہے میں بظاہر شیو کرنا کرتا کپڑے بدلتا، بھائی مختار کی موٹر سائیکل مانگ کر ریڈیو سٹیشن جاتا وہاں اپنی درخواست کی پیروی کرتا۔۔۔۔ لیکن میرے اندر کا توازن بالکل بگڑ چکا تھا میں بیرونی حالات و واقعات میں زندہ نہیں تھا۔ میرے اندر شرح در شرح ایک ہی کتاب لکھی جا رہی تھی۔۔۔۔ اور جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ اتنا ہی بے ربط تھا جیسے بندروں کا ایک جتھہ ٹائپ رائیٹروں پر کتاب لکھنے

کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔۔

یہ راجہ گدھ کی زندگی ہے۔

بیرونی کوائف سے کٹی ہوئی۔۔۔۔ اندرونی ہیجان میں الٹی صراحی کی طرح معلق۔۔۔۔ ایسی صراحی جس سے قل قل کر آواز تو آتی رہے لیکن ایک بوند پانی بھی کبھی نہ گر سکے۔

شاید ہمارا سارا گھرانہ ہی بن باسیوں کا تھا

ہم پرانے گدھ جاتی کے وہ راجپوتی لوگ تھے جنہوں نے راجھستھان میں پناہ لی تھی اور جو کھیتی باڑی کو منفعت بخش کام سمجھ کر اب پنجاب کی سرزمین میں آباد ہو گئے ہم راجپوتی لوگ اب غیرت اور ان کی تمام کہانیاں بھول چکے تھے وہ تلواریں خدا جانے کہاں تھیں جنہیں میدان کا راز بلاتا رہتا تھا اب محبت غیرت سچائی ساری غیر مرئی باتوں پر کٹ مرنے کی روایات ختم ہو گئی تھیں صرف تھوڑا تھوڑا دیوانہ پن رہ گیا تھا۔ اسی لیے کچھ کچھ وارداتیں اب بھی ہو جاتیں۔۔۔۔ ہماری ناکیں عقاب جیسی اور مونچھوں کے بال گرگٹ کے پٹھوں کی طرح تنے ہوتے تلوار کی سچی زبان ہمیں بھول چکی تھی لیکن اس کے باوجود لمبی چوڑی بحث، کٹ حجتی اور بے ہودگی میں ہم نے پناہ لی تھی بس خواب ہمیں پریشان کرتے تھے۔ ہر دیوانے کی طرح خوابوں میں ہمیں زیادہ حقیقت نظر آتی ماڈرن آدمی پر تہذیب اور تعلیم کا شہری زندگی کا جو بھی بوجھ ہے وہ ہمارے ہم قوم لوگوں پر بھی پڑا رہا تھا ہماری اندر کی جبلت ہمیں مارنے مرنے پر اکساتی تھی۔ کھلی ہوا چوڑے میدان کی طرف کھینچتی تھی اور معاشرہ ہمیں تال میل سمجھوتے پر اکساتا تھا۔ اسی لیے ہم بھی کئی صدیوں سے چوراہے پر کھڑے تھے ایک ایسی اندھی بتی کے نیچے جس کی بتیاں فیوز ہو چکی تھیں۔ لیکن ہم اشارے کے منتظر تھے ہمیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ چاروں راستوں میں سے کون سا بہتر ہے، ہم کس راستے پر چل کر نجات ملے گی؟۔

ایک راہ گاؤں کو جاتی تھی ۔ ۔ ۔ جہاں دن لمبے ہوتے ہیں نیند سکون سے آتی ہے لیکن غریبی میں تفریح کے بغیر قناعت کی ڈھال نہ ہوتے ہوئے یہ سفر بہت لمبا اور تھکا دینے والا ہوتا ہے جہاں آدمی ہر روز کے اطمینان سے گھبرا جاتا ہے ۔ ۔ ۔

دوسرا رشتہ شہر کو جاتا ہے چھوٹے شہر کی سڑکیں بڑے شہروں کو بڑے شہروں کے ہوائی جہاز اور بڑے چہروں کو اور وہاں سے جانے والے راستے کئی اور ملکوں میں نکلتے ہیں نئی کلچر، نئی تعلیمات، نئے لباس نئی زبانیں نئی چہرے نئی آگاہی ۔ ۔ ۔ اس راستے کے ہر سنگ میل پر نہ صرف اپنے اعتقادات مذہب کلچر اور سوچ کا پٹرول ہی جلتا ہے بلکہ ہر موڑ ہر سیاح بے اطمینانی کی سوغاتیں سوہان روح یادوں کے بیگیج ٹکٹ اپنے پرس میں اکھٹے کرتا جاتا ہے ہر جگہ اسے اپنی ذات، مذہب ملک اور قوم کا ٹریولر چیک بھنوانا پڑتا ہے اور دوسرے ملک کی نعدالبدل کرنسی حاصل کرنا ہوتی ہے

تیسری پگڈنڈی جنگل کو نکلتی ہے

یہاں ساری طرف اونچی اونچی گھاس ہے جس میں انسان کی اپنی جلی آرزوئیں پھن اٹھائے کھڑی رہتی ہیں ہر آرزو دلآویز بھی ہوتی ہے اور سر پر کلہاڑی مار کر ختم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے آرزوؤں کا یہ جنگل بڑا طلسماتی ہے اس میں اپنے مرنے اور دوسرے کو مارنے کا کھٹکا ساتھ ساتھ رہتا ہے تہذیب کی زنجیروں میں جکڑے انسان کو یہاں پہنچ کر بھی ہارکیری کرنے کے سوائے اور کچھ نظر نہیں اتا۔ کیونکہ یہ راستہ بھی منزل نا آشنا ہے صرف اسی گرینڈ ٹرنک میں اور کئی راستے آکر ملتے ہیں سڑک اور چوڑی ہو جاتی ہے لیکن ہمیشہ جنگل میں ہی چلتی ہے اس راستے میں اتنے پل آبشاریں نشیب اونچائیاں آتی ہیں کہ جہلت کی تلوار ہاتھ میں رہ جاتی ہے اور آہنی زرہ کے بوجھ تلے آدمی مر جاتا ہے

چوتھا راستہ غاروں کی طرف جا نکلتا تھا اور کسی کو معلوم نہیں کہ یہ غاریں کہاں جا نکلتیں ہیں۔ سب ان بروحوں جنوں اور آسیبی رنگوں سے ڈرتے ہیں جن میں ڈبو

ڈوب کر انسان ہر پڑاؤ پر رنگ بدلتا جاتا ہے ۔۔۔۔ یہ مافوق الفطرت راستہ گو مشکل نظر آتا ہے لیکن غاروں کے اندر کبھی کبھی پناہ بھی ملتی ہے اور ٹھنڈک بھی

ہم راجپوت تھے اور آج تک اسی چوراہے پر کھڑے تھے کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ہم سب کے اندر خواب اور حقیقت گڈمڈ ہو گئی تھی۔

بھابھی صولت کا چہرہ؟

بھائی مختار کی شکل؟

اماں ۔۔۔؟ ابا ۔۔۔ کیا ہم سب انسانوں میں سے تھے؟

کیا ہماری شکلیں گدھوں سے مشابہہ نہ تھیں

ہم لوگ ضلع شیخوپورہ کے چندرا گاؤں میں رہتے تھے۔ جس طرح چندرے آدمی کا ساتھ بالآخر چھوڑنا پڑتا ہے اسی طرح بالآخر ہم سے بھی یہ گاؤں چھوٹ گیا پتہ نہیں چندراں چندرماں سے بگڑا ہوا لفظ تھا کیونکہ جب بھی ہم گاؤں سے نکلے اس کی یاد چاندی کی طرح دمکنے لگتی۔

چندراں کو جانے والی کچی سڑک جس کے اردگرد ڈیلے کی خودرو خاردار جھاڑیاں تھیں بہت لمبی تھی۔ گاؤں میں غریب غربا کے استعمال کی چیزیں بیچنے والی دوکانیں، آٹا پیسنے والی خراس تال میں ڈوبی بھینسیں، مٹی اڑانے والے یکے، چارہ کترنے والی مشینیں دو تنور اور بہت سی یادیں تھیں جو فاصلے کی وجہ سے خوبصورت ہو گئی تھیں بی اے کے بعد ان ساری یادوں کو تازہ کرنے میں دوبارہ چندرا گیا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ سارا گاؤں سیم اور تھور کی وجہ سے اس حد تک برباد ہو چکا ہو گا پورے چار سال گاؤں سے باہر رہنے کی وجہ سے میں ان خبروں کی عینی شہادت نہ رکھتا تھا جو کبھی کبھار ابا کے خطوں میں درج ہوتی تھیں ماں کے مرنے کے بعد ہم دونوں بھائی چندراں نہیں گئے۔ پہلے بھائی مختار نے ایک رسالے میں سب ایڈیٹری کی اور پھر جب وہ سیکرٹریٹ میں ملازم ہوئے تو اپنے خاندان سمیت وہ

سانده کلاں میں آگئے۔

گاؤں میں ماں جو نہیں تھی!

گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے میں ہمیشہ ماموں کے پاس قصور چلا جاتا۔کبھی مجھے چندراں کا خیال نہیں آیا۔

جس وقت بیگ اٹھائے گاؤں پہنچا میں نے دیکھا

اردگرد بڑے بڑے سور کے ڈھیر تھے کلر کے تختوں میں پرانے مرے ہوئے جانوروں کے ڈھانچے تھے کہیں کہیں زمین میں دلدل تھی کھارے پانی کے جوہڑ تھے۔جن کے کنارے سبز گاچنی رنگی مٹی میں پیاسے جانوروں کے کھروں کے نشان گہرے ہوکر خشک ہو چکے تھے یہ جانور پانی کی تلاش میں آئے تو ضرور لیکن پیاسے لوٹ گئے۔

سارا گاؤں بے آباد پڑا تھا کسی کسی آنگن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔لیکن گلیاں سونی تھیں بہت سے کچے پکے گھروں کے دروازے جانے والے مکینوں کی یاد میں کھلے پڑے تھے اب ان گھروں میں چرانے کو بھی کچھ باقی نہ رہا تھا اول تو جانور کم تھے اور جو باقی تھے ان کی ہڈیاں کولہے نکلے ہوئے تھے۔بیلوں کی آنکھوں میں اداسی تھی اور بھینسیں ہراس کی وجہ سے آنکھیں نہ ملاتی تھیں بچے دہلیزوں پر چپ چاپ بیٹھے وقت گزارنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ان کی اانکھیں اور گھٹنے بہت نمایاں ہو چکے تھے۔

یہ وہ چندراں نہیں تھا جس سے چار سال پہلے میں رخصت ہوا تھا

تب تو ہرے ہرے کھیتوں میں تانگہ جاتا ہوا نظر بھی نہ آتا تھا۔تب تو ہماری حویلی میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی قیام پاکستان کے بعد اس گاؤں میں کئی رنگ کے پکھیرو آباد ہو گئے تھے بڑے لونگ اور ستواں ناک والی راجپوتنیاں، گول گول دہنوں والی کشمیرنیں چوڑے طباق والی مٹی رنگی جاٹ عورتیں، چکنی جلد پر نارنگی کے چھلکے ملنے والی مغل زادیاں، خوشامد سے دوسہری ہو جانے والی میراثنیں، پل میں

صحن کا رنگ بدل دینے والی کِکّے زینیں ناپ تول کی تکڑی کے باٹ جیسی زندگی بسر کرتی شیخانیاں، جلدی ڈھل جانے والی زرد زرد آرائیں استریاں کھلی بیسن سے نہائی دھوئی کجریاں چوڑے چھنکانے اور طعنے دینے والی مسلنیں۔۔۔۔ماں زندہ تھی تو چندراں کا گاؤں اور پھر ہماری حویلی کچھ اور ہی چیز تھی۔

سارے درخت ہرے بھرے تھے سب کھیت لہلہاتے تھے۔ہر کنوئیں میں میٹھا پانی تھا ہر کسان کے گھر میں دانے تھے اب سارے میں کلر ہی کلر تھا موت ہی موت تھی۔اور اماں کہیں بھی نہیں تھی۔

جب میری ماں زندہ تھی تو حویلی کے آنگین میں ہر سمے میلے کی سی کیفیت رہتی دو آرہی ہیں دو جارہی ہیں میری ماں ان عورتوں میں نظر نہ آتی۔پھر بھی اس کی وجہ سے میلہ لگا رہتا۔وہ جہاں بیٹھی وہی جگہ آباد ہوگئی اور کچھ نہیں تو اس کی چارپائی تلے چیونٹیوں ہی راستہ بنالیتیں۔ماں عام طور پر حویلی میں کسی جگہ بھی نہ ہوتی تھی پر اس کے کیے ہوئے کام ہر جگہ اس کی گواہی دیتے کہیں چارہ کٹا ہوا ملتا کہیں نارنگیوں کے چھلکے سوکھنے کے لیے پڑے ہوتے۔سوتی کپڑوں کی رنگین کترنیں مکئی کے خالی تکلے گنوں کے چھلکے۔۔۔بادام کی زاہ کھلی۔۔۔ماں تھی تو آنگین آباد تھا۔گاؤں زندہ تھا۔

اب ہماری حویلی کے تمام دروازے کھڑکیاں کھلی تھیں۔۔۔میں نے ابا کو آواز دی۔۔۔"ابا"۔۔۔۔اندروالے کمرے سے ایک کبڑا بوڑھا کچھ پہچانتا کچھ بھلاتا میری طرف بڑھنے لگا۔

اس بڈھے گدھ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں انسو آ گئے

آنگین کے سارے فرش کی کی اینٹیں کلر چاٹ گئی تھی اور اب جب ان پر پاؤں پڑتا تو پھک سے سفید ذرات اوپر کو اٹھتے تھے ٹوٹی ہوئی ربڑ کی ہوئی چپل میں جو شخص مجھے بھولتا اور پہچانتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا جس کے سر کے تمام بال سفید تھے۔اور

جبڑے کی ہڈیاں کسی ہوئی تھیں۔ یہ شخص میرا باپ تھا۔

چار سال سے میں نے کبھی اس کا پتہ نہیں لیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زمین کلر زدہ ہو جانے پر اب وہ کیسے گزر بسر کرتا ہے۔

آنکھوں کا چشمہ ناک پر جماتے ہوئے وہ بڑھتا آ رہا تھا۔۔۔ ''کون ہے کون ہے بھئی بولتے کیوں نہیں؟۔''

میں سوٹ کیس ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ جو حویلی کے کئی طاق کھلے تھے کئی دروازے ہوا میں جھول رہے تھے۔۔۔ ہوا میں ایسا نمک تھا جو پسینے والے بدن سے پچک کر خارج میں بدل جاتا ہے۔

''کون ہے بھئی۔'' ابا نے پاس آ کر کہا۔

پھر اور قریب آ کر اس نے بازو پھیلائے۔ لمحہ بھر کو بازو پھیلے رہے پھر شرمندہ ہو کر اس اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا اور بولا۔۔۔ ''آؤ قیوم آؤ کھڑے کیوں ہو۔''

ہم دونوں چپ چاپ اس تخت پوش پت بیٹھ گئے جس پر بیٹھ کر کبھی اماں سارے گاؤں میں حکم چلایا کرتی تھی

''ابا۔۔۔ بھائی مختار نے کہا ہے۔''

''کس نے۔؟۔''

وہ اونچا سننے لگا تھا

''بھائی مختار نے کہا ہے۔۔۔ کہ اب تو چندرا چھوڑ دے میں تجھے لینے آیا ہوں۔''

''آ میرے ساتھ۔۔۔ آ۔۔۔ ذرا۔۔۔''

میں ابا کے ساتھ چلنے لگا وہ مجھے ساری حویلی میں لیے پھرا۔۔۔ گھر کی حالت ساختہ تھی، کہیں رنگین پائے کا پلنگ آخری دموں پر تھا، کہیں جستی ٹرنک کلر میں ڈوبے

تھے۔۔۔ساری جگی آسیب زدہ تھی وہ گھوم پھر کر میرے ساتھ باہر آگیا اور پھر تخت پوش پر بیٹھ کر بولا۔۔۔''دیکھتا نہیں تیری ماں کی کتنی نشانیاں ہیں یہاں۔۔۔ کس کس کو چھوڑ کر جاؤں؟''

میں چپ ہو گیا۔

''ابا بھائی مختار ساندھا کلاں میں رہتے ہیں۔''

''رہے جم جم جی صدقے۔''

''بھابھی صولت نے بھی ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔۔ہے۔۔۔تو میرے ساتھ تو چل ابا۔۔۔میری پڑھائی کے بھی دو سال باقی رہ گئے ہیں۔''

وہ کھانسنے لگا مدافعت کے طور پر۔۔۔شرمندگی کے احساس تلے وہ اس وقت مجھے اپنا باپ نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا جانور لگ رہا تھا۔۔۔معصوم جانور جس نے سونے کے فریم کی عینک پہن رکھی تھی۔

''تو نہیں سمجھتا ناں۔۔۔یہاں وہ اور میں باتیں کرتے رہتے ہیں سارا دن وہاں شاید شہر میں وہ میرے ساتھ جانا پسند نہ کرے۔''

میں نے غور سے ابا کی طرف دیکھا۔

جب ماں زندہ تھی تو ہم نے ان دونوں کو کبھی باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن جب ماں مر گئی تو پھر ابا اس کے شیشے لگے بڑے پلنگ پر لیٹ کر پہروں منہ میں باتیں کرتا نظر آتا۔اماں کے ہوتے ہوئے ابا ہمیشہ کھیتوں پر رہتا تھا اندر صحن میں رنگ رنگ کی عورتوں کا میلہ دیکھ کر گھر لوٹنے پر بھی وہ حویلی کے باہر ہی مونڈھا منگوا لیتا۔لیکن اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ امریکہ کا پریذیڈنٹ ہو۔اس کے حقے کی نے مونڈھے کی بٹھاوٹ اور نشست وہاں سے صاف نظر آتی جہاں صحن کے اندر ماں کا تخت بچھا ہوتا۔دونوں میں شاید کوئی پیغام جاری رہتے ہوں اس کا ہمیں علم نہ تھا۔

ماں کے مرنے کے بعد حویلی دم چھوڑ گئی۔۔۔ میلہ ٹوٹ گیا۔۔۔ گاؤں کے اردگرد تو بہت پہلے سے سیم نالہ بہتا تھا اور زمین شور زدہ ہو رہی تھی لیکن اب ابا بھی پڑا رہا آہستہ آہستہ ہماری زمینوں پر بھی کلر رینگنے لگا ابا کی آواز میں خوف پیدا ہو گیا۔ اس کے بازوؤں پر جھریاں نظر آنے لگیں۔ اب ابا جھکتا تو کھڑے ہونے سے پہلے کمر پر ہاتھ رکھ لیتا۔ اس کی آنکھوں میں اب تیل والے خشک چراغ جیسی کیفیت تھی۔ جیسے کبھی جلتا تھا لیکن اب صرف گیلا رہتا ہو۔ دسویں جماعت میں نے قصور میں ماموں کے پاس رہ کر پاس کی۔ اس وقت تک مختار بھائی لاہور میں ملازم ہو گئے تھے ان کی بیوہ اور بڑا بیٹا سانده کلاں میں کرائے کا مکان لے کر رہنے لگے تھے میں نے باقی تعلیم ہوسٹل میں رہ کر مکمل کی۔ لیکن ساری چھٹیاں میں ماموں کے پاس قصور میں گزاراتا تھا۔ مجھے کبھی چندر راجانے کا خیال نہیں آیا۔۔۔ میں اماں کے بغیر چندرا کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابا سے ملنے کو جی چاہتا۔ لیکن ہم دونوں بھائی ہمیشہ سے باہ سے دور دور رہے میرے ذہن میں ابا ساندل کا سانڈ تھا جس کا جسم لس لس کرتا ہے، جو کھیتوں میں کھڑا چرتا ہے بے ضرر لگتا ہے لیکن کوئی کسان اسے کھیت سے نکالنے کی جرائت نہیں کرتا۔ پاس جانے پر آمادہ بھی نہیں ہوتا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے گاؤں کو کلر نگل رہا ہے۔ لیکن میں کلر کھائے گاؤں کو کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایک کلر ایسا بھی ہوتا ہے جو ساندل بار کے سانڈ کو بھی کھا جاتا ہے۔

''دیکھو قیوم۔۔۔! یہ میرا گھر ہے۔۔۔ میرا۔۔۔ اگر میں اسے چھوڑ گیا تو گاؤں والے کیا کہیں گے۔''

میں پلٹ کر اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ کسان نہیں تھا۔ ساندل بات کا سانڈ نہیں تھا۔ وہ صرف راجا گدھ جو ایک مری ہوئی عورت کے لاحاصل تصور میں اپنی زندگی کی ڈوری لٹکائے بیٹھا تھا

میرا باپ دیوانہ ہو چکا تھا۔۔۔اس کی آنکھوں میں کلر نے چھڑکاؤ کر رکھا تھا۔

''ابا یہاں اکیلا مت رہ ناں۔۔۔وہاں ہم دونوں ہیں تیری خدمت کریں گے۔۔۔چل ناں۔''

وہ ہنسنے لگا۔ایک تنہا بڈھے کی مجروح ہنسی۔

''اور اس کی قبر کو کلر کے حوالے کر دوں؟۔۔۔یہاں تو روز قبر دیکھنے نہ جاؤں تو چوتھے دن قبر کا منہ پھٹ جاتا ہے۔''

''ابا۔۔۔یہاں بڑی مشکل ہے وہاں۔''

ابا نے حویلی پر نظر دوڑائی اور بولا۔۔۔''یہاں وہاں کچھ نہیں بیٹے۔۔۔مجھے جسم کا ارام نہیں چاہیئے۔۔۔یہاں میری روح خوش ہے وہ اسی گھر میں آئی تھی۔ یہیں سے اس کا جنازہ نکلا۔۔۔اوئے احمق مجھے مرد ہو کر اتنی توفیق نہیں کہ میں اس کے مرنے کے بعد اس کے گھر خیال رکھوں؟۔۔۔اس نے تو ساری عمر میرے گھر کی اینٹ اینٹ سے پیار کیا۔''

میں ساری دوپہر ابا کے پاس چپ بیٹھا رہا دھوپ ڈھلنے کے وقت میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور سٹیشن کی طرف چلنے لگا۔

آخری بار اس جگی کھڑے ہو کر میں نے اندر نظر ڈالی جہاں جوانی میں ابا کا مونڈھا ہوتا تھا

سارا صحن خالی تھا

تین طرف بنے ہوئے کمروں کے کچھ دروازے کھلے کچھ بند تھے۔لیکن سب کا پلستر کلر کی ہوا چاٹ گئی تھی۔۔۔جہاں ماں کا تخت پوش اینٹوں کے پایوں پر پڑا تھا اس کے نیچے دو دو انچ شور کھڑا تھا۔۔۔سارے آنگن میں نوکیلی جھاڑیاں اگ آئی تھیں نہ کہیں اناج تھا نہ پانی۔۔۔نارنگیوں کے کٹے ہوئے چاند، سوکھے ہوئے گنوں کا انبار، چارپائیاں گھڑونجی۔۔۔چاری کاٹنے والی مشین اماں کی پہاڑی

بکریاں۔۔۔ندیدی بلیاں۔۔۔چھوٹے چھوٹے لڑکے۔۔۔مینڈھیاں کروانے والی تیل میں سنے ماتھے نکالنے لڑکیاں۔

چولہا۔۔۔دھواں۔۔۔اماں کے پیپے۔۔۔اناج تولنے والا ترازو۔۔۔توشکیں اور ان میں نگندے ڈالنے والی عورتیں

وہ سارا کاروبار۔۔۔وہ ساری زندگی کہاں گئی؟۔کیا کلر صرف ماں کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

جب میں گلی میں کافی دور نکل گیا تو میں نے پلٹ کر ایک بار پھر حویلی کی طرف نظر کی۔

ابا اوپر ممٹی پر کھڑا تھا۔۔اس کے دونوں بازو آگے کو بڑھے ہوئے تھے۔

راجہ گدھ۔۔۔عمارت کی آخری اونچائی پر مالیخولیا کی لپیٹ میں کھڑا تھا۔

میں نے دل میں سوچا جب بھی روح لاحاصل محبت کرتی ہے یہ دیوانے اپن سے کیوں ہمکنار ہو جاتی ہے؟

کیا روح ہمیشہ لاحاصل راستوں پر جانا پسند کرتی ہے۔

کیا اس کے لیے دیوانگی کے علاوہ اور کوئی پناہ نہیں۔۔۔۔؟کوئی پناہ نہیں؟

سٹیشن کے سامنے یکے پر سے سامان اتارتے ہوئے غریب کوچوان نے شرمساری سے کہا۔۔۔"قیوم بھائی آپ بہت دیر بعد گاؤں آئے ہیں۔"

میں نے اسے پہچاننے کے لیے غور سے دیکھا۔

"میں عزیز گاتن کا چاچا ہوں فضل کریم۔"

"عزیز گاتن؟"

"ہاں عزیز گاتن۔"

میں نے فضل کریم کو چھٹی ڈالی وہ میرے گرمجوشی سے واضح طور پر متاثر ہو گیا۔

غالباً پینٹ سوٹ والے سے اس کا یہ پہلا معانقہ تھا۔

''عزیز گاتن کا کچھ پتہ چلا؟''

''کہاں جی۔۔۔وہ تو پتہ نہیں کہاں غایب ہو گیا اچانک؟''

فضل کریم مجھے سلام کر کے بڑے مودب طریقے سے واپس چلا گیا۔ میں پلیٹ فارم پر اکیلا مسافر تھا۔ جب تک گاڑی نہیں آئی میں اپنے اکلوتے سوٹ کیس پر ہاتھ رکھے سوچتا رہا۔

عزیز گاتن، پھجا، ہملی شا، سب کہاں گئے؟۔۔۔گاؤں میں پہنچ کر میں نے اس میں سے کسی کو بھی تو یاد نہیں کیا؟

ہم نے کئی سال اکھٹے مِیاٹا پوکھیلا تھا۔۔۔کوئلے سے دیواروں پر لکیریں کھینچی تھیں۔ گاؤں کی ہر چھوٹی بڑی پگڈنڈی اور بڑے چھوٹے درخت پر ساتھ رہے تھے۔

یہ وقت کیا کرتا رہتا ہے

یہ وقت۔۔۔آخر چاہتا کیا ہے؟

عزیز گاتن؟۔۔۔فضل کریم کا بھتیجا۔۔عزیز گاتن؟

وہ جھیور تھا۔ گاؤں کے بڑے پیپل تلے اس کی ماں تندور تپایا کرتی تھی۔ سردیوں کے موسم میں سہ پہر کے وقت روٹیاں لگانے سے بہت پہلے جب وہ منچھیوں کا بالن جلا کر تندور کو ابتدائی سینک دیتی تو گاؤں کی لڑکیاں لڑکے اس سے دانے بھنوانے آیا کرتے، میں بھی دو چار بھٹوں کے دانے اتار کر چھابے میں ڈالتا اور ماسی الفت کے تندور پر پہنچ جاتا۔

عزیز گاتن سے میری بچپن کی دوستی تھی۔ وہ ناٹے قد کا چوڑا چکلا لڑکا تھا اس کے سر پر ہمیشہ استرا پھرا ہوتا۔ جو کنی دونی اس کی ماں اسے خرچنے کے لیے وہ اپنے کان کے اندر والے کٹاؤ میں پھنسا کر رکھتا۔ اس کی قمیض کو کبھی بٹن نصیب نہ

ہوئے۔اسی لیے سیاہ گانی والا تعویذ ذرا سا جھکنے پر آگے کو جھولنے لگتا۔وہ ایک پاؤں کا پنجہ اندر کو ڈال کر چلتا تھا۔اسی لیے رات کے وقت اس کی چال میں تھوڑا سا چھلیدا پن پیدا ہو جاتا۔

عزیزے گاتن کا اوپر والا ہونٹ پیدائشی کٹا ہوا تھا۔۔۔اسی لیے وہ ہمیشہ ہنستا دکھائی دیتا۔لیکن میں تو عزیز گاتن کو بچپن سے جانتا ہوں وہ چھوٹی عمر سے غلیظ باتیں سننے کا عادی ہو گیا تھا۔پرانے بھٹے کے پاس جہاں مائی توبہ توبہ کی جھونپڑی تھی۔۔۔۔وہاں مجھے اور ہملی کو لے جا کر وہ ایسی ایسی گالیاں سکھاتا کہ ان کے معنی نہ سمجھتے ہوئے بھی ہم دونوں کے کان جلنے لگتے۔

شاید عزیز گاتن ہنستا نہیں تھا بچپن سے اسے اپنی ماں کے متعلق باتیں سننی پڑی تھیں۔جب کبھی اس کی ماں کے متعلق گفتگو ہوتی۔لوگ اچانک ہی بہت بے پروا ہنسوڑ، ننگے اور جنسی ہو جاتے کسی کو خیال بھی نہ رہتا کہ عزیز گاتن سن رہا ہے وہ چونکیل جانور کی طرح ادھر ادھر دیکھتا رہتا۔ایسے میں اس کے کان میں پھنسی ہوئی اکنی چونی بہت چمکنے لگتی۔۔۔۔پہلے وہ نظروں سے بھاگ جانے کی راہ تلاش کرتا لیکن راہ نہ پا کر کھڑا رہتا۔۔۔یوں لگتا جیسے وہ ہنس رہا ہے سب کے ساتھ۔۔۔اپنی ماں پر۔۔۔۔ماسی الفت کی ننگی حرکتوں پر۔

شاید اس کی پیدائشی بے بسی تھی جو ہنستی رہتی تھی۔شاید اوپر والا کٹا ہوا ہونٹ اسے مصنوعی ہنسی ہنسنے میں مدد دیتا تھا۔!

ماسی الفت موہنجداڑو کے زمانے کی پتلی تھی۔اس کا رنگ بھٹی میں پکی ہوئی سرخ اینٹ جیسا تھا ہاتھ روٹیاں گھڑنے میں جتنے تیز تھے اتنے ہی چٹائی پر دھرے ہوئے اس کے بھاری کولے سست تھے۔وہ ہمیشہ چھینٹ کی شلوار اور ململ کا سیاہ کرتا پہنتی تھی شاید نتھوں کا اسے کبھی خیال نہیں آیا کیونکہ جب کبھی وہ رفیدے پر روٹی ڈال کر تنور کے اندر جھکتی تو گلے سے رسنے والا پسینہ اندر جڑے ہوئے پیڑوں پر گرتا

نظر آتا۔ میں نویں جماعت میں تھا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ ماسی الفت بڑی شے ہے وہ سر پر بھاری کھیس ڈالے روٹیاں نکالنے والی سیخ پھرتی سے تندوری میں ڈالتی۔ ایسے میں اس کے ست کولہے کئی زاویئے بناتے جب کبھی وہ مجھے چوری چوری اپنی طرف دیکھتا پا لیتی تو سادگی سے ہنس دیتی۔ ”لے لو۔۔۔۔ اب تو حویلی والوں کا قیوم بھی جوان ہو گیا۔“

ماسی الفت کی بہت بکری تھی۔۔۔۔ اپنی بھی اور روٹیوں کی بھی اس کے گاہک روٹیوں کی قیمت علیحدہ چکاتے تھے اور اس کے لیے الگ نذرانے لاتے تھے لیکن سنا ہے وہ سارا مال جوڑتی رہتی تھی عزیز گاتن کے لیے۔

لیکن یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب چندراں کے باہر سیم نالہ دور سے نکلا کرتا تھا اور گاؤں کی صرف باہر والی زمینیں سیم سے متاثر ہوئی تھے۔ چندرا سے کچھ دور شور، دلدل اور پھٹے ہوئے کھیت تھے۔ لیکن گاؤں کے ساری طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ لیکن گاؤں کے ساری طرف لہلاتے کھیت تھے۔ جھڑ بیریوں کو بیر لگتے، نیم کی نمکولیوں سے آنگن بھر جاتے تھے اور سیاہ تنے والے کیکروں پر پیلے پیلے پھول اگتے ابھی چندرا میں برسیم کے کھیت اتنے گھنے تھے کہ عزیز گاتن گنا چوستا اس میں جاتا دھوتی کھولتا اور دوبارہ باندھ لیتا کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے۔؟

آج اگر عزیز گاتن چندرا میں ہوتا تو کیا میں اسے سیمی کی محبت کے متعلق کچھ بتا سکتا؟ حالانکہ جب تک میں گاؤں میں رہا۔ ہماری آپس میں کوئی بھید نہ تھا۔ وہ سجراں، سیوں، باکی، جنتے کی محبت کو تو سمجھ سکتا تھا۔۔۔ لیکن سیمی کی محبت اسے اب سمجھ نہ آتی شاید میرے حالات سن کر وہ کہتا۔۔۔ ”اچھا جب وہ تمہارے ساتھ سو لیتی ہے تو باقی کیا تکلیف ہے اور کیا چاہیے تمہیں۔“

اگر میں اسے گاؤں میں مل بھی لیتا تو اس کو اپنی محبت کے متعلق کچھ سمجھا نہ سکتا ایسی

محبت جو جبلی تقاضوں کی آسودگی کے باوجود آسودہ رہتی ہے جس میں ہر وصل میں ہجر کا مزا ہوت ہے جس میں ہاتھ ضرور پڑ جاتا ہے لیکن ایسے ہی جیسے بس میں آدمی ہینڈل کو پکڑ کر سوار ہو جائے اور اندر نہ گھس سکے۔

دیوانگی کی سرحدوں کو چھونے والی محبت کا کچا چٹھہ میں عزیز گاتن کو کیسے سمجھا سکتا۔۔۔

لیکن چاچا فضل کریم کا عزیز گاتن تھا کہاں

ماسی الفت کی انکھ کا تارا جانے کہاں چھپ گیا تھا؟ گاؤں سے اچانک غائب ہو جانے کی بھی عجیب داستان تھی۔

اس روز عزیز گاتن حویلی میں داخل ہوا تو اس کے کان میں دس پیسے کا سکہ چمک رہا تھا اس نے کھدر کی قمیض پہن رکھی تھی اور قمیض کی جھولی اس طرح اٹھا رکھی تھی کہ چارخانے والی تہمد کے ڈب اور ناف صاف نظر آتی تھی

''اوئے قیوم۔۔۔'' اس نے حویلی میں داخل ہو کر آواز دی

کئی عورتوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا ماسی الفت اور عزیز گاتن سارے گاؤں کے لیے تفریح کا باعث تھے۔ پھر اس نے اماں کے تخت پر جھولی کھول کر کچے پکے پیلو ڈھیر کر دیے ہم دونوں پکے کچے پیلو علیحدہ کرنے میں مصروف تھے کہ چاچا غلام رسول اندر سے نکلا۔

چاچا غلام رسول ابا کا کچھ ہٹاں سار رشتہ دار تھا کیونکہ اما اس سے کانا پردہ کرتی تھی جس وقت چاچا انگن میں آتا۔ اماں کی ساری کلب منتشر ہو جاتی۔ لونگ والی چوڑے والیاں، چھاج پھٹکتی، مسالہ پیستی، آٹا گوندھتی مخلوق میں زلزلہ سا آجاتا، جیسے اچانک فائر سن کر چڑیاں اڑ جاتی تھیں۔ ایسے ہی ترنت عورتیں چلنے لگتیں۔ لڑکیاں سروں پر آنچل کر لیتیں اور جوان عورتوں کو اپنی چادریں یاد آجاتیں

چاچا غلام اشتہاری مجرم جیسا اشتہاری عاشق تھا شروع شروع میں پان سات

معاشقے چندرا میں بھی دھڑلے کے ہوئے لیکن دوکان کی مشہوری سے بہت پہلے بات پھیل گئی کہ سارا سودا ناکارہ ہے۔ آنگن میں پہنچ کر عموماً چاچا غلام اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا کان کی میل نکالتا۔ کسی چھوٹے بچے کو شیشہ پکڑا کر مونچھوں کے بال تراشتا۔ جو بھی باورچی خانے میں موجود ہوتی اس سے باسی روٹی اور مکھن مانگ کر کھاتا اور پھر لال زری کی جوتی میں سے لٹھے کی شلوار جیسی شڑاق شڑاق آواز نکالتا، وہ کبھی آنگن میں یہاں جاتا کبھی وہاں۔۔۔۔ چاچا بڑا حکمتی آدمی تھا اسے ہر لڑکی ہر عورت کی پرسنل ہسٹری معلوم تھی۔ کون سیدانی کس میراثی کے ساتھ کتنی دیر پھنسی رہی۔ کونسی شیخانی کا پانچواں بچہ حرامی تھا کس مغلانی نے اپنے مزارع کے بیٹے سے دوستی لگا رکھی ہے کون سی آرائیں گھر سے اودھل گئی تھی۔۔۔۔ ایسے قصے اسے بڑی چٹ پٹی تفصیلوں کے ساتھ یاد تھے۔ ایسی کہانیوں کی وجہ سے جوان لڑکے اس کے پاس بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ وہ جوانوں کو محبت کرنے کے طریقے ایسے سکھاتا جیسے پہلوان اپنے پٹھوں کو داؤ پیچ ازبر کراتے ہیں

ابا نے ہمیں چاچا کی صحبت میں بیٹھنے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ باتیں کیا کرتا ہم کسی نہ کسی بہانے وہیں منڈلایا کرتے۔۔۔۔ باتیں کرتے کرتے وہ یکدم گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔ دراصل جونہی کوئی لڑکی اس کی باتیں سن کر ہنستی ہوئی حویلی سے رخصت ہوتی۔۔۔۔ چاچا غلام کو بھی کوئی بہت ضروری کام یاد آجاتا۔

ابا کو چاچا غلام پسند نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کئی سال ہمارے گھر رہا چاچا غلام کوئی کام نہیں کرتا تھا، لیکن بیگار لینا خوب جانتا تھا۔ ہم نے اسے کبھی ابا کے ساتھ کھیتوں پر جاتے نہیں دیکھا۔ وہ گھر کے کسی کام میں بھی دلچسپی نہ لیتا، لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے ابا اس سے بدکتا تھا۔

پتہ نہیں ابا نے چاچا غلام سے کوئی بڑی رقم پکڑی ہوئی تھی

پتہ نہیں ابا کا کوئی گہرا راز چا چا غلام کے پاس تھا

یا شاید وہ دونوں کسی جرم میں شریک رہے تھے؟

ہم چھوٹے تھے ہمیں اصلی وجہ معلوم نہ تھی۔لیکن ہم دیکھتے کہ چا چا کی تھالی میں ہمیشہ بوٹیاں زیادہ ہوتیں۔اسے ملائی مکھن اور پراٹھوں کے علاوہ مکھن میں تلے ہوئے انڈے بھی ناشتے پر ملتے۔اس کی چارپائی پر کڑھے ہوئے تکیے کے غلاف رہتے جب بھی وہ کوئی فرمائش کر دیتا تو پھر اماں اور ابا اسے ضرور پوری کرتے۔ابا چا چا غلام کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس کا خیال بہت رکھتا تھا۔

عزیز گاتن اور میں صحب میں اماں کے تخت پوش پر پیلو علیحدہ کر رہے تھے کہ ٹانسے کی دھوتی اور لیس لگا کرتا پہنے چا چا غلام اندر سے نکلا۔چند منٹوں میں آنگن خالی ہو گیا۔صرف باورچی خانے میں دو عورتیں ہماری طرف پشت کیے بیٹھی آٹا گوندھتی رہیں۔۔۔۔

عزیز گاتن اس روز بہت خوش تھا

''دنیا داراں دے گھر دیندا بیٹے ولی الہی۔ ولیاں دے گھر پیدا کردا میرے وانگ گناہی۔۔۔'' زور زور سے عزیز یوسف زلیخاں گا رہا تھا کہ پیچھے سے آ کر چا چا غلام نے اس کی گدی میں دھول ماری۔عزیز گاتن کی اانکھیں یکدم خوف سے کھلی ہو گئیں۔۔۔اماں تو بہ تو بہ سے بھی زیادہ ہم چا چا غلام سے ڈرتے تھے۔

''اوئے تیری ماں کو کچھ عقل ہے کہ نہیں؟۔۔۔پلید کہیں کی۔''

عزیز گاتن مسکرانے لگا

جب بھی عزیز گاتن سنجیدہ ہو جاتا، ایسے لگتا کہ مسکرا رہا ہے کیونکہ اس کے اوپر والے ہونٹ میں پیدائشی شگاف تھا اور منہ سختی سے بند کرنے کی صورت میں وہ مسکراتا ہوا نظر آتا۔

عزیز گاتن اپنی ماں کے متعلق بہت سے باتیں سننے کا عادی تھا ماسی کو بیوہ ہوئے

چھ سال ہوئے تھے۔وہ بالکل آزاد تھی اور اسے اپنی آزادی بڑی پیاری تھی۔عزیز
گاتن تو باتیں سن کر مسکرانے لگتا۔لیکن میرے ہاتھوں میں پسینہ آجاتا۔

''اوئے بول تیری ماں ہے ناں اجڈ گنوار ناپاک''

گاتن چپ چاپ سنتا رہا۔

''سن رہا ہے میری بات بل پھٹیا؟''

''جی۔''

پتہ نہیں کیوں میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

''حرامی! اپنی فیشن کی ماری ہوئی ماں کو کہنا، پہلے جسم کی صفائی سیکھے۔۔۔۔بتانا اسے جسم کے بال ناپاک ہوتے ہیں اسے میرا یقین نہ آئے تو جا کر ملاجی سے پوچھ لے مجس میں۔۔۔ویسے تو اسے بڑے مسئلے آتے ہیں جسم کے بالوں کا مسئلہ نہیں اتا کوڈوکو۔۔۔؟''

''اچھا جی کہہ دوں گا۔''

عزیز نے ہاتھ میں چنے ہوئے پیلو تخت پوش پر رکھ دیے۔اس سے پہلے کئی بار میں نے اسے لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا تھا لوگ اس کے منہ پر اس کی ماں کو گالیاں دیتے، لیکن وہ کبھی چپ نہ ہوا تھا۔

پہلی بار بل پھٹیا کے چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔

چاچا غلام نے مٹھی بھر کے پکے پکے پیلو اٹھائے اور باورچی خانے کے ڈھارے کی جانب مڑ گیا۔گاتن نے کچھ نہ کہا گلے کے تعویذ کو قمیض کے اندر کیا اور باہر چلا گیا۔میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ خود ہی لوٹ آئے گا لیکن اس روز کے بعد اسے کسی نے گاؤں میں نہیں دیکھا۔۔۔کچھ دن ماسی الفت نے اس کی تلاش کی پھر ایک دن اس کی ماں نے گلہ اپنے گاہکوں کو دھنوس دے دے کر جمع کیا تھا تندور کے دہانے پر مار کر توڑا اور بڑ کے درخت تلے سارے روپے اٹھنیاں چونیاں

دس پیسے نوٹ یوں پھینکے جیسے عزیز گاتن کی برات پر سے سوٹ کر رہی ہو۔وہ پیسے پھینکتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی ۔۔۔''اٹھالو کتو۔۔۔اٹھالو۔۔۔میں نے عزیز گاتن پر وارے اٹھالو،،،،،''

اس شام میں پرانے بھٹے پر ہمبلی کے ساتھ غلیل لے کر شکار کے لیے گیا ہوا تھا جب شام پڑنے لگی اور ہم نے گھر لوٹنے کا ارادہ کیا تو میں نے دیکھا کہ چندرا کی طرف سے ایک بڑا سا گدھ بھاگتا ہوا آیا اور سیم نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اس گدھ نے خاکی رنگ کے کھیس کی بکل مار رکھی تھی اور پیروں میں کچھ نہ تھا۔

پھر راجہ گدھ سیم نالے کے ساتھ گرتا پڑتا چلنے لگا۔کبھی کبھی اس کے دونوں بازو آپی آپ آسمان کی طرف اٹھ جاتے اور پھر بغیر ٹھوکر کھائے گر جاتا۔۔۔کچھ فاصلے تک میری نگاہوں نے اس راجہ گدھ کا تعقب کیا اس کے بعد ماسی الفت ہمیشہ کے لیے افق میں کھوگئی۔

اچانک ماسی الفت اور عزیز گاتن کے غایب ہونے پر اور تو کچھ نہ ہوا،صرف چندرا گاؤں کے باہر پھیلنے والا کلر گاؤں کے اندر بڑھنے لگا ہر آندگی کے ساتھ ہر بارش کے ساتھ۔۔۔ہر موسم میں اس رفتار تیز تر ہونے لگی۔اونچے اونچے درخت ٹند منڈ ہوئے۔۔۔کھیتوں میں لہلہاتے سبزے کی جگہ دلدل،شور اور نمکین پانی کے جوہڑ بلنے لگے۔کنوئیں کھاری ہو گئے۔ہتھی والے نلکوں کی نالوں پر قلمی شورا چڑھ گیا۔گھروں کی دیواروں سے کلر جھڑنے لگا۔۔۔فرش پھول گئے۔چاگاٹیں ڈھیلی ہوگئیں۔زنجیروں پر تنگ جھڑنے لگا۔اور آدمیوں کے چہرے پرانے سکے جیسے گھسے ہوئے نظر آنے لگے۔

اب رفتہ رفتہ لوگ گاؤں چھوڑ کر جانے لگے۔۔۔گھروں کے چولہے سرد پڑ گئے اور راستوں کی پھولی ہوئی مٹی پر جانور،چھکڑے،ریڈھے تانگے سامان سے لد لد کر جانے لگے۔اب پیلو کا بور جھڑ جاتا۔کیکر کے درختوں میں زرد پھول نہ آگتے۔

جب میں ماموں کے پاس قصور گیا ہوں۔اس سے کچھ پہلے سارے گاؤں میں
کلر نے دھاوا بول دیا تھا۔

ٹرین آئی میں سوار ہو گیا چندرا کے پاس سے پرانے بھٹے کے عقب میں مائی توبہ
توبہ کی جھگی سے لے کر اندر تک کلر کا سیلاب تھا۔ساری زمین انڈے کی سفیدی جیسی
پھینٹی ہوئی تھی جس وقت چندرا کی حد ختم ہوئی میں نے دیکھا دو اونچے درختوں پر کئی
گدھ بیٹھے تھے،نیچے سیم نالے کے پاس ایک بھینس کا ڈھانچہ پڑا تھا۔

شام اتر رہی تھی۔ہوا میں میں نمک تھا

پتہ نہیں مجھے کیوں لگا جیسے ایک درخت سے تیزی کے ساتھ ایک گدھ اترا اور
ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔اس گدھ کو غور سے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں
تھی۔لیکن وہ گا رہا تھا۔بھاگ رہا تھا۔ٹرین کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر بہر اونچے
اونچے

صبح گیارہ بجے میری آنکھ کھلی تو ابھی تک میں چندراں میں تھا۔

دانت صاف کرتے ہوئے مجھے خیال آنے لگا کہ کسی نوکری پر لگنے سے پہلے
مجھے ایک بات پھر چندراں جانا چاہیئے شاید اماں کی قبر کسی نے پکی کروا دی ہو۔شاید
کلر کی وجہ سے قبر پھٹ گئی ہو اور اماں کا ڈھانچہ چاندنی راتوں میں ڈراؤنا لگتا ہو۔
پتہ نہیں بھائی مختار چندرا جانے پر کبھی رضامند کیوں نہ ہوتے تھے۔۔۔میں ابھی
دل میں یہ پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ کسی نے غسل خانے پر دستک دی عام طور پر اوپر
آنے کا رواج کم تھا

"قیوم"۔۔۔۔بھابھی صولت نے آواز آئی۔

میں نے دروزہ کھول کر باہر جھانکا

"کہیں جا رہے ہو؟"۔

''جی ریڈیو سٹیشن جاؤں گا۔''

''اچھا؟۔۔۔۔'' وہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ مجھے وہاں کیا کام ہے لیکن میری ان کی بے تکلفی نہ تھی۔

''جی۔۔۔ وہاں مجھے آج ایک سکرپٹ دینا ہے۔''

''سکرپٹ؟''

ریڈیو سٹیشن میں ان دنوں میرا ایک دوست پروڈیوسر لگا ہوا تھا۔۔۔ وہ بچوں کا پروگرام پرڈیوس کرتا تھا۔ وہ مجھ سے عموماً معلوماتی سکرپٹ لکھوالیتا۔

''ایک کہانی لکھی ہے بھابھی ٹیپو سلطان پر۔''

''اچھا۔۔۔ یہ میری ڈرائی کلینز کی چٹ ہے چار دوپٹے رنگنے کے لیے دیئے ہوئے ہیں با نو بازار میں وہ لے آؤ گے نا؟''

''لے آؤں گا۔۔۔ جی۔''

انہوں نے دس روپے کا نوٹ ڈرائی کلینز کی رسید کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔

''نوکری کا کچھ پتہ چلا؟''

''ابھی انٹرویو کے لیے طلب نہیں کیا۔''

''اچھا۔۔۔'' دوپٹے کھول کر دیکھ لینا کہیں ڈب وغیرہ نہ ہوں۔''

بھابھی صولت جس لاتعلقی سے آئی تھی ویسے ہی چلی گئیں۔ ان کا میرا بھابھی دیور کا رشتہ نہ تھا۔ چور سپاہی کی طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے بھاگتے تھے۔

جونہی سیمی سے اچانک کنارہ کشی ہوئی تھی۔ میں کبھی کبھی ریڈیو سٹیشن سعید کے پاس جا بیٹھتا۔ اس کے کمرے میں بڑی رونق ہوتی۔ افسر، ڈرامہ آرٹسٹ، مراثی، طوائفیں اناؤنسر آتے جاتے رہتے۔ چھوٹے موٹے اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ سعید مجھ سے کبھی کبھی کوئی فیچر کوئی اناؤنسمنٹ کوئی کہانی لکھوا لیتا۔۔۔ بھابھی یا بھائی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے یہ بہتر طریقہ تھا۔ کیونکہ فی

الحال میں ذہنی خواری سے ملتا۔ منت سماجت بھی کرنی پڑتی، لیکن میری آزادی میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔

بھابھی کے دس روپے اور چٹ اٹھا کر میں پیدل کرشن نگر تک پہنچا۔ وہاں سے میں نے سکرٹریٹ تک بس لی۔ چونکہ یہ بس مال پر نہ جاتی تھی اس لیے یہاں سے میں ریڈیو سٹیشن پیدل پہنچنے کا عزم کر کے مال پر چلنے لگا۔ بڑی دیر بعد مجھے پیدل چلنے میں عجیب قسم کی راحت محسوس ہوئی۔ چلنے کی مکینکل انرجی نے خیالات کی چھان پھٹک میں واضح طور پر مدد دی بڑے دنوں بعد مجھے اپنا وجود ایک نارمل صحت مند شہری کا لگا اس وقت میرا سایہ میرے بھائی مختار کے خود اعتماد سائے سے مشابہہ تھا۔ سیمی کا عشق ضرور اپنی جگہ تھا لیکن ذمہ دار شہری کی طرح ان جذباتی مسائل کو سلجھانا میرے بس کی بات تھی۔ اس وقت مجھے کئی پلان سوجھے جس وقت میں جی پی او کے سامنے سے گزر رہا تھا تو چوک جی کے سامنے انتظار کرتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مقابلے کے امتحان میں داخلہ لینا ہوگا۔ اس وقت یہ امتحان مجھے بہت آسان نظر آیا۔ اپنے وہ دو پروفیسر یاد آ گئے جو بالکل نالائق تھے اور اس امتحان کو پاس کرنے کی وجہ سے آج کل اسلام آباد کے فیڈرل سکرٹریٹ میں بہت بڑے سفید کالر عہدوں پر متعین تھے ریگل کے چوک تک پہنچتے پہنچتے میں بہت جاہ طلب ہو چکا تھا میری سوچ یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ میں سویڈن ہالینڈ یا سپین میں اپنے آپ کو ایمبیسی میں فسٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز دیکھ سکتا تھا۔ میری ڈاک پاکستان ایمبیسی کے تھیلے میں آ جا رہی تھی اور میں جینوا پیرس فرینک فرٹ سٹاک ہوم سے پکچر پوسٹ کارڈ خرید خرید کر وطن بھیجنے میں مشغول تھا جس وقت میں واپڈا کی بلڈنگ کے پہلے سے نکل کر فلیٹی ہوٹل والی سڑک پر نکلا کار میں بیٹھی ہر خوبصورت لڑکی مجھے اپنی بیوی نظر آئی اور بڑی کار پر اپنی ہونے کا شبہ ہونے لگا۔

ریڈیو سٹیشن سے پہلے چوک میں پہنچتے پہنچتے میں اپنے آپ کو جسمانی، ذہنی،

جذباتی طور پر صحت مند سمجھ رہا تھا اس وقت مجھے شبہ بھی نہ تھا کہ راجہ گدھ کی جاتی سے کوئی بھی زیادی وقفے تک صحت مند نہیں رہ سکتا۔ پاگل پن اس پر Quantums میں بڑھتا رہتا ہے جب بھی وہ اپنے نیوکلس کے قریب ہوتا ہے اسے شبہ بھی نہیں گزرتا کہ غیر صحت مند عناصر اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں ذرا سا وہ نیوکلس سے ہٹتا ہے اور وہی سراسیمگی وہی دیوانگی ہی دشت نوردی صحرا پیائی جو اس کے اندرونی سفر کا حصہ ہے اس پر غالب آجاتی ہے

ریڈیو سٹیشن پہنچ کر حسب معمول میں سعید کے دفتر میں چلا گیا۔ وہ کچھ فلمی گیتوں کی ڈسکیں اٹھائے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کرسی پر سیمی بیٹھی تھی۔۔۔ سیمی کے ساتھ والی کرسی پر حید رتھا اور ان کے ساتھ پروفیسر سہیل چائے پینے میں مشغول تھے

''آؤ سر جی آؤ۔۔۔ آؤ آؤ۔۔۔ سعید نے پرتپاک لہجے میں کہا۔''

میں ہلکے سے اشارے سے سیمی کو سلام کیا

''آج تمہری کہانی یہ پڑھیں گی۔۔۔ سکرپٹ لکھ لائے ہو۔۔۔ پہلے مباحثہ ہوگا، پروفسر سہیل اور حیدر صاحب کے درمیان پھر۔۔۔''

''ہاں۔''

''انہیں دے دو۔۔۔ ذرا ایک نظر اس پر ڈال لیں۔''

میں نے کہانی سیمی کے سپرد کر دی۔ اس نے اپنے چہرے سے گلابی چشمہ اتارا۔ پھر کرسی کی پشت سے لٹکے ہوئے تھیلے میں سے پڑھنے کی عینک نکالی اور کہانی پڑھنے لگی۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ دبلی ہو گئی تھی۔۔۔ اس کی اانکھوں تلے گھرے سیاہ حلقے تھے اور ہونٹوں کا رنگ کاسنی نظر آتا تھا۔ ہاتھوں کی نسیں بہت ابھری ہوئی تھیں اور کہانی کا سکرپٹ پکڑتے وقت اس کا ہاتھ تھوڑا سا لرز تا تھا۔

پتہ نہیں میری خوچ اعتمادی ساری کی ساری کہاں گئی۔

''میں ذرا سٹوڈیو کا چکر لگا آؤں۔۔۔۔'' سعید یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔۔۔۔اور پروفیسر سہیل لاتعلقی سے چائے پیتے رہے انہوں نے مجھ سے کوئی بات ہی نہ کی،

جس وقت میں گھر پہنچا تو وہ پہلے سے میرے کمرے میں موجود تھی۔اس نے بال دھو رکھے تھے اور پانی کی ننھی بوندیں اس کالی شال پر چمک رہی تھیں۔

'یہ وقت ہے گھر آنے کا۔'

میں نے ہنس کر کہا......'یہ وقت ہے سر دھونے کا اور وہ بھی سردیوں میں۔'

وہ ایک ہی جملے سے سیدھی ہو گئی۔

کہاں رہے ہو سارا دن؟'

'پہلے ریڈیو سٹیشن گیا تھا۔وہاں سے پروفیسر سہیل کے پاس چلا گیا۔'

'یہ مرجانا سہیل کون ہے اب؟'

'ہے ایک پڑھا لکھا آدمی......بے حد......پاکستان میں اس جیسا دوسرا کوئی نہیں۔'

'پڑھا لکھا ہی ہے نرا کہ آدمی بھی ہے؟'

میں اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول ہو گیا اور وہ چپ چاپ مونگ پھلیاں کھانے میں جت گئی۔اچانک مجھے الماری میں ایک موم بتی نظر آ گئی۔ میں نے اس کاسنی رنگ کی موم بتی کو روشن کیا۔اس کے سامنے کاسی رن کا گڈی کاغذ کتابوں کی مدد سے کھڑا کیا اور بجلی کا بٹن بند کر دیا۔

'ہائے یہ کیا اندھیرا کر دیا قیومی؟'

'دیکھو یہ کاسنی روشنی کتنی پیاری ہے عابدہ۔ اسی روشنی میں چائے پئیں گے۔'

اب وہ اپنے اور وحید کے بے مزہ واقعات بیان کرنے لگی۔

ایک روز وحید نے کیا کیا' ایک بیڈ اور لیمپ خرید کر لایا۔ کسی فلم میں دیکھا تھا اس نے کہ ہیرو بیڈ لیمپ جلا کر پڑھتا ہے۔ گھر آ کر اس نے ساری شام بیڈ لیمپ

فٹ کرنے میں لگ دی۔ تین سوئچ بدلے۔ دو بلب فیوز کیے۔ جب بیڈ لیمپ فٹ ہو گئی تو اس کی روشنی میں بیٹھ کر حساب کتاب دیکھنے لگا...... بد بخت کا چھوٹا سا چہرہ ہے اوپر سے...... رکھی ہوئی ہیں لمبی لمبی راجپوتی مونچھیں...... توبہ بیڈ لیمپ کے سامنے تو پورا اپورا لدھڑ لگتا تھا بیٹھا ہوا۔"

آج میں سیمی کے متعلق باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن میں نے صرف مدافعت کے طور پر کہا...... جب آفتاب لندن چلا گیا جابدہ تو سیمی پر حسد کا دورہ پڑ گیا۔ وہ سارا سارا دن ایسے خیالوں سے اپنے آپ کو لہولہان کرتی رہتی تھی جو آفتاب اور زیبا سے متعلق ہوتے...... آدمی کتنا اذیت پسند ہے۔"

جب آفتاب نے شادی ہی کر لی تھی تو پھر سیمی کو تم سے شادی کر لینی چاہیے تھی۔ میں خلاف ہوں ایسی باتون کے۔"

''وہ شادی نہیں محبت کی آرزومند تھی۔"

''ہائے شادی کا محبت سے کیا تعلق...... کسی نکاح نامے پر کبھی تم نے دیکھا ہے محبت کا خانہ معجّل اور غیر معجّل کا تو ہوا ناں خانہ۔"

'' اگر شادی لائسنس بنتا تو تین قسم کے نکاح نامے ہوتے۔ سفید نکاح نامے ان لوگوں کے لیے جو دن رات ایک دوسرے کے قرب کی آرزو رکھتے ہیں۔ گلابی کارڈ دنیاوی وجوہات والوں کے لیے مثلاً تنہائی سے بچنے کے لیے ماں باپ کی ناک بچانے کے لیے...... وغیرہ وغیرہ اور سبز کارڈ صرف ان کو دیا جاتا جو افزائش نسل کے لیے لائسنس چاہتے ہیں۔ صرف سبز کارڈ مستقل ہوتا' باقی سب کارڈ سال دو سال کے بعد renew کرانے پڑتے"۔

''لائسنس سب سفید رنگ کا بنواتے اور بچے سب کے ہو جاتے پھر...... فٹے منہ ایسی سوچ پر۔" وہ کھکھلا کر ہنس دی۔

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ کاسنی گڈی کاغذ موم بتی کر طرف جھک کر ہلکا سا جھلس گیا

تھا۔لیکن کمرے کی روشنی اس وقت بڑی دل فریب تھی ۔میرا دماغ خود بخود سہیل کی باتوں سے گونجنے لگا۔

''بھائی صاحب محبت نہیں ملتی کہیں بھی چاہیے سفید کارڈ بنواؤ چاہیے گلابی ...... دنیا میں تو گزارہ ہی کرنا پڑتا ہے اور گزارے کے لیے شادی اچھی ہے۔'' اس نے مجھے مشورہ دیا۔

میں نے چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لی اور قریباً اپنے آپ سے بولا۔

''تمھیں کیا پتہ عابدہ...... شکر کرو شکر،تم سوچتی نہیں ہو۔وجوہات تلاش نہیں کرتی ہو۔ معنی کی جستجو ...... نہیں کرتی ہو ورنہ تمھیں بھی سورج کے ارد گرد کئی غلاف نظر آنے تھے۔''

''اب کیا سوچ رہے ہو...... موم بتی بجھادوں کہیں آگ نہ لگ جائے۔''

''لگ جانے دو آگ۔''

ایسے جملوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا وہ کند چھری سے حلال ہونے والی نہ تھی۔

''میں نے تو محبت کے متعلق کبھی زیادہ نہیں سوچا۔'' عابدہ بولی۔

''اور میں اس کے علاوہ اور کسی چیز کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔''

''پھر کیا سوچا ہے تم نے آج تک؟''

''یہی کہ دولت اور محبت کی ایک سی سرشت ہے۔ دولت کبھی ان جانے میں چھپر پھاڑ کر ملتی ہے۔ کبھی وراثت کا روپ دھار کر ایسے ڈھب سے ملتی ہے کہ چھوٹی انگلی تک ہلانی نہیں ہوتی اور آدمی مالا مال ہو جاتا ہے۔ پھر اکلوتے لاڈلے کی طرح دولت کو اجاڑنے برباد کرنے میں مزہ ملتا ہے۔کبھی پائی پائی جوڑتے رہنے پر بھی پورا روپیہ نہیں ہوتا۔ کبھی محبت اور دولت ملتی رہتی ہے لیکن سیری کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ چادر پوری نہیں ہوتی تن پر......کبھی محبت رشوت کے روپے کی طرح ڈھکی چھپی ملتی ہے لوگوں کو پتہ چل جائے تو بڑی تھڑی ہوتی ہے۔ کبھی

کاسے میں پڑنے والی اکنی دونی کی خاطر ساری عمر تیرا بھلا ہو کہنا پڑتا ہے۔ تجھے کیا پتہ عابدہ محبت اور دولت نے انسانی دل پر کیا کیا حکمرانی کی ہے۔ چاہتے تو سیلاب کی طرح بستی اجڑ جائے' ان کے ہاتھوں چاہتے تو بوند بھرہ برسے اور ریگستان کے اوپر سے گرجتی چمکتی چلی جائے...... ان سگی بہنوں سے تو جس قدر رابطہ کم ہو آرام ہے۔''

کاسنی کاغذ جھلس کر کالا ہو چکا ہے۔ عابدہ اٹھی اور سانس کی لمبی پھونک سے اس نے موم بتی بجھا دی۔ از سر نو بجلی کا بلب جلنے لگا۔

''قیوم تمہیں کسی دماغی ڈاکٹر سے ملنا چاہیے۔''

''کیوں؟''

'' مجھے یوں لگتا ہے تمہارے سر کو گرمی ہو گئی...... ہے۔''

''تمہارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔''

''میری اماں ایک پھکی بنایا کرتی تھیں۔ بادام کی گریاں چار مغز' سونٹ۔ چھوٹی الائچی مصری......''

''تم کچھ نہیں بنا سکتیں۔؟''

''میں کیا کر سکتی ہوں...... مجھے وہ نسخہ ہی نہیں آتا۔''

''میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ تم شکتی ہو...... تم مجھ زبل کو طاقت دے سکتی ہو۔''

''کیسے؟''

اس وقت تک مجھے علم نہ تھا کہ میں سہیل کی باتوں کو عابدہ سے دوہراؤں گا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ عابدہ اور مجھ میں کوئی رابطہ ممکن بھی ہے؟

''مرد اور عورت کے درمیان آٹھ قسم کا لگاؤ ہوتا ہے اور ہر لگاؤ سے انسان کو ایک خاص قسم کی شکتی ملتی ہے۔''

وہ حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔

''پہلا تعلق خیال کا ہے...... جب کسی کا خیال دماغ میں بس جاتا ہے اور نکالے نہیں نکلتا تو اسے سمرنا نام کہتے ہیں۔ جب اس تعلق کا ذکر کسی سے کریں تو یہ دوسری سٹیج ہے۔ جنس لطیف کی صحبت میں رہنا تیسرا تعلق ہے۔ عورتوں کے ساتھ ہنسی دل لگی چوتھا...... عورت سے دلی گفتگو کرنا پانچویں سٹیج ہے۔ اس کے بعد جسمانی تعلق کی آرزو چھٹی حالت ہے۔ اس آرزو کو ارادے سے پختہ کرنا ساتواں تعلق ہے اور آخری اور مکمل سیڑھی وہ ہے۔ جب شوجی اور شکتی ملتیک ہیں اور ایسی روح کو جنم دیتے ہیں جو نہ مرد ہوتی ہے نہ عورت۔''

''ہائے ہائے کہیں باتیں کرنا بھی گناہ ہی نہ ہو......'' وہ کرسی سے اٹھی۔ چھلکے مونگ پھلی کا لفافہ ایک چھناکے سے فرش پر گرا' میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی چادر پکڑی اور بولا...... ''بیٹھ جاؤ''...... آرام سے مرد اور عورت جب سچے دل سے پریم بھگتی کرتے ہیں۔ تو پھر وہ گناہ نہیں کرتے بلکہ اپنی کنڈالنی کو آزاد کراتے ہیں۔''

''وہ بدبخت کیا چیز ہے؟''

عابدہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

''انسان کے جسم کا ایک حصہ نظر آتا ہے اور دوسرا حصہ نگاہوں سے اوجھل ہے ہمارے غدودی نظام کے ساتھ ساتھ طاقت کا ایک اور وجود بھی چلتا ہے' یہ وہ سر چشمہ طاقت ہے جو آدمی کی orative evergy کہلاتا ہے۔''

''یہ ساری باتیں تم کتابوں سے سیکھتے ہو؟''

'' کچھ کتابوں سے کچھ تبادلہ خیالات سے۔''

''بند کر دو ان دونوں کو۔''

''کیوں۔؟''

''لادین ہو جاؤ گے دیوانے ہو جاؤ گے سچی۔''

وہ میرے سامنے لب سکیڑ کر بیٹھی تھی ایسے لگتا تھا جیسے وہ ابھی رونے لگے گی' ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے پھر وہ بولی...... یہ کنڈالنی چنڈالنی کون ہے؟''

'' واقعی یہ کنڈالنی ہی چنڈالنی ہے...... یہ وہ سانپ ہے جو ہمارے مقعد اور عضو تناسل کے درمیان استراحت کرتا ہے۔''

''ہائے میں مری۔''

'وہی کنڈالنی کی قوت آہستہ آہستہ اوپر کو سر اٹھانے لگتی ہے پھر ایک چکر تک پہنچتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی جاتی ہے۔ حتی کہ ہمارے سر تک پھن اٹھا کر جا پہنچتی ہے اس کو کنڈالنی کے سفر میں انسانی کی بقا یا فنا ہے...... وہ کس سطح تک پہنچتا ہے اور کیوں پہنچتا ہے۔ یہ سب ارتقا کنڈالنی کی وجہ سے ہے۔''

''یہ...... چکر کیا ہے؟...... تمہیں آج کیا ہو گیا ہے......''وہ محجوب سی ہو کر میرے پاس بیٹھ گئی۔

''پہلا چکر مقعد اور آلات تناسل کے درمیان ہے۔ اسے مولادھارا کہتے ہیں۔ اس کی چار سرخ پتیاں ہیں۔ اس کے درمیان میں ایک مربع زمین کی علامت ہے۔ اس مربع کے اندر ایک تکون ہے جس میں تمام psyclie energy بند ہے جسے کنڈالنی کہتے ہیں۔ اس کنڈالنی نے سانپ کی مانند ریڑھ کی بنیاد پر چکر بنا رکھا اور اس کنول جیسے چکر میں چمکتی ہے' بتیوں کی طرح روشن ہے جو شخص اس جگہ پر دھیان لگاتا ہے وہ آرزو' حسد' غصہ پر قابو پا سکتا ہے۔''

تجھے تو کچھ ہو گیا ہے قیومی خدا قسم۔''

'' اور کچھ نہیں تو بات ہی سن لو عابدہ۔'' میں نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ دراصل مجھے سہیل نے اس قدر پمپ کر دیا تھا کہ میں ساری گیس کسی اور ذی روح پر نکالنا چاہتا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا عابدہ میری باتیں سننے کی عادی نہیں۔ اگر وہ سن بھی لے' تو ان کا ادراک اس سے ممکن نہیں پھر بھی بولتا گیا۔

''سوادھس تھانہ دوسرا چکر ہے۔ اس کی چھ سرخ پنکھڑیاں ہیں۔درمیان میں ایک سفید ہلال ہے اور پانی کے عنصر کی علامت ہے۔ یہ آلات تناسل کی جڑ میں ہوتا ہے اگر یہاں دھیان لگایا جائے تو انسان ostral worlds میں بسنے والوں سے رابطہ قائم کرسکتا ہے۔''

اب عابدہ مکمل طور پر مجھ سے علیحدہ ہوچکی تھی۔

''آج صبح میں ہسپتال گئی تھی' ڈاکٹرنی کہنے لگی۔ تم میں کوئی نقص نہیں۔ تم اپنے میاں کو لاؤ...... بتاؤ قیوم وحید مانے گا اس بات پر؟''

ہمیشہ کی طرح ہم دونوں الگ الگ پٹڑی پر چلنے لگے۔

''ناف کے پیچھے ایک سرخ نارنجی تکونی ہے۔ صاحب نظر لوگوں کو اس مقام کا رنگ گھنیرے بادلوں جیسا نظر آتا ہے۔اس کے وسط میں نارنجی سرخ رنگ کا تکون ہے جس کے تینوں طرف سواستکا کا نشان ہے۔ یہ جگہ آگ کے عنصر سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس جگہ کو منی پورا کہتے ہیں اور اس solar plaxus پر توجہ رکھنے سے انسان پر دوسرے لوگوں کی شعوری اور غیر گھتیاں آپی آپ کھلتی جاتی ہیں۔اسی مقام پر دھیان لگانے والے جلتی آگ پر چلنے کی شکتی رکھتے ہیں۔''

''تم میری بات کیوں نہیں سنتے؟''

'' تم بھی تو میری بات سنو ناں......'' میں نے ضد سے کہا۔

''تم کو تو کچھ کردیا ہے اس چنڈالنی سیمی نے۔''

''تم کو بھی کچھ ہوچکا ہے لیکن میں نہیں جانتا کرنے والا کون ہے؟۔''

''سنو قیومی!۔''

'سنو عابدہ! ...... میں جستجو کی بات کر رہا ہوں اپنی جستجو ...... اپنی بقا کی ...... انسان کو تلاش ہے......اپنی......اپنے خدا کی۔''

'بقا تو صرف بچے میں ہے قیومی......جن کے بچے نہیں وہ مر جاتے ہیں جن کے

لیے بچے ہوتے جاتے ہیں وہ زنجیر میں پروئے جاتے ہیں ان کا نام رہتا ہے نسل رہتی ہے۔''

'تم صرف جسم کے بقا کی سوچتی ہو۔''

'' جسم نہ ہوا تو روح کس مکان میں رہے گی ...... ہمارا تو بوٹا ہی نہ لگا...... لاکھ دفعہ کہا میں نے وحید سے کہ تم علاج کروالوں ...... پر مانے بھی وہ خبیث۔''

'سنو عابدہ...... جب کنڈلنی چوتھے چکر میں پہنچتی ہے تو اسے اناہاتا کہتے ہیں۔ یہ دل کا کنول ہے۔ اس کا رنگ گہرا سرخ ہے۔ اس میں عارفانہ بارہ ستے ہیں۔ اس کنوں کے وسط میں دو تکون ہیں۔ اس میں ہماری ذات چراغ کے شعلے کی طرح رہتی ہے یہ شعلہ آبشاروں جیسی ہے یہاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھلاہٹ چاندی کی زنجیریں' سرکی ہوئی بانسری گھنٹیاں...... بڑے بڑے ٹمک اور مرونگ بجتے ہیں۔ کائنات کی صدا یہاں سے آسکتی ہے۔ ہوا کے عنصر پر اس کا مدار ہے۔ اگر آدمی یہاں دھیان لگائے تو اس میں کئی روپ دھارنے کی شکتی پیدا ہو جاتی ہے۔اور وہ کائناتی محبت پانے والا بن جاتا ہے۔ اسی راستے پر وہ نروان بھی حاصل کر سکتا ہے۔''

''اور میں تم کو کیا بتا رہی ہوں۔؟ ڈاکٹرنی کہہ رہی تھی۔ دو تین معمولی ٹیسٹ ہیں۔کوئی تکلیف بھی نہیں ہو گی ...... لیکن وحید کو رضامند کون کرے گا...... میں بھابھی صولت سے کہوں؟...... بتاؤ ناں؟''

مجھے وحید اور وحید سے جنم لینے والی اولاد میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

'' ریڑھ کی ہڈی کے راستے ہم پانچویں چکر پر پہنچتے ہیں۔ اسے وشودھا کہتے ہیں۔یہ طاہر' طیب پاک مقام ہے۔ یہاں سے ازلی علم حاصل ہوتا ہے۔یہ گلے میں جہاں ریڑھ کی ہڈی دماغ سے ملتی ہے۔واقع ہے۔ اس چکر کی روشنی پورے چاند جیسی ہے جو بھی thyrird glands پر توجہ دے وہ جوگیوں میں شہزادہ بن کر

رہے گا اور عقل و دانش میں مقدس علم کا پاسبان ہو گا۔"

"اگر بالفرض وحید نہ مانے ...... تو یہ بتاؤ مجھے طلاق لے لینا چاہیے ناں؟ اس کی وجہ سے میں بچے کے بغیر کیوں رہوں؟"

"عین دونوں ابروؤں کے وسط میں جہاں کائناتی مشاہدے کیلئے تیسری آنکھ ہے۔ یہاں چھٹا چکر ہے۔ سردیوں کے چاند جیسی روشنی سے منور یہاں دو بڑے بڑے پنکھ ہیں۔ جو سچائی کا مظہر ہیں۔ یہاں پر دھیان کرنے والے کو اس کے سچے گرو کی آواز آنے لگتی ہے۔"

جب پران جسم چھوڑتے ہیں تو اس جگہ دھیان لگانے والے کی روح پچھلے تمام جنم کے کرموں سے آزاد ہو کر خالق سے جا ملتی ہے' یہ وہی جگہ ہے جہاں pitutay gland ہے۔"

"تم کو ...... سوائے اپنے کسی کی پروا ہے ...... قیومی؟"

"نہیں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو میں یہ تمہاری بکواس سن رہی ہوں؟"

"نہیں۔"

"پھر نعوذ باللہ کیوں ایسی بکواس کر رہے ہو۔"

"شاید ...... کہیں سکون ہو ...... تلاش سے ...... جستجو سے ...... شاید کہیں ان سوالوں کا جواب ملے جو میرے دل میں رات کے وقت آتش بازی کی طرح چھوٹتے ہیں۔"

"آیۃ الکرسی پڑھ کر سویا کرو ہر رات"

"آخری چکر ...... کنول کا ایسا پھول ہے جس کی ایک ہزار پتیاں ہیں۔ یہاں شکتی اور شوا کا میل ہوتا ہے ...... اجتماع ضدین ہوتا ہے۔ چاند سورج کا ملاپ' بجلی اور مقناطیس کا سنجوگ ...... یہ سر کا قطبی حصہ ہے ...... اور نچلے چھ کے چھ چکر اس کے تابع

ہیں..... ایک رنگت شروع شروع میں زرد ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہیرے جواہرات کی طرح چمکنے لگتی ہے جو شخص کنڈالنی کے اس مقام پر قابض ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دو موہے دشمن پر قابو پا لیتا ہے۔"

"دشمن کون؟"

"وقت اور موت!..... یہ دنوں پھر ایسے تنترک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

اس وقت عابدہ پلنگ سے دوبارہ اٹھی۔ اس کی جھولی سے مونگ پھلیوں کے چھلکے خزاں کے پتوں کی طرح ایک بار پھر گرے..... اونچی قمیض تلے کاسنی شلوار کا پورا گھیر گنبد پر چڑھے غلاف کی طرح نظر آیا۔

"تم واقعی پاگل ہو گئے..... خدا قسم کیا بک رہے ہو۔"

"تم شکتی ہو..... شکتی عابدہ!..... تمہارے ملاپ سے مجھے اپنی روح کا نروان ..... میرا خدا مل سکتا ہے..... میری لامتناہی تلاش ختم ہو سکتی ہے، تمہاری آرزو کی تکمیل ہو سکتی ہے..... تم ماں بن سکتی ہو..... ماں۔" میں نے اسے لالچ دیا۔

پھر منت کے انداز میں مقدس گنبد پر ہاتھ رکھا..... پتہ نہیں عابدہ کیوں خاموش بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھوں میں بڑی حیرانی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا..... تم چاہتے ہو میرے بچہ ہو قیوم..... سچ؟..... سچ؟..... بتاؤ تمہیں ترس آ رہا ہے ناں مجھ پر۔"

....

شکتی اور شوا کا میل میری کنڈالنی کو اپنے سفر پر روانہ کر سکا۔ میری کنڈالنی حسب عادت ناف سے کہیں نیچے بیٹھی رہی پھنکارتی رہی۔ ریڑھ کے سفر پر ماڑو کے پہاڑ پر چڑھنے سے اس نے انکار کر دیا۔ لیکن بیکار جستجو کا ایک دروازہ کھول کر میں نے پہلے سے ٹنڈ منڈ درخت کو سردیوں کی یخ ہواؤں کے سپرد کر دیا۔ دیوانگی کی ایک اور سمت مجھ پر کھل گئی۔

اس سے پہلے عابدہ اپنے شوہر کی گفتگو کرتی رہتی تھی مجھے بیمی کے واقعات کے اعادے کا جنون تھا۔ میں وقت اور موت کو گفتگو میں بند کر کے گھڑی پیچھے کی طرف چلانا چاہتا تھا۔ہم دونوں کا نقطہ اتصال کوئی نہ تھا شاید ہم دونوں ایک دوسرے سے ہمدردی چاہتیت تھے۔ لیکن اس روز کے بعد ہماری گفتگو ہمیشہ شارٹ سرکٹ ہو جاتی۔ اب ہم میں ہمدردی تو کیا ایک دوسرے سے نگاہیں چار کر کے خدا حافظ کہنے کی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی۔

سہیل کی باتوں سے قطع نظر اپنی بے چینی اور لایعنی جستجو کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی، جس نے مجھے عابدہ سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور کیا۔مرد کے جنسی سیلز کے اندر جو تنوع موجود ہے اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کھجل ہوتا ہے۔ اس کے صنفی تخم کے اندر x اور Y کا جو تضاد موجود ہے۔ اس کی وجہ سے جنس کے معاملے میں وہ عورت کی طرح یک طرفہ اور شانت نہیں رہ سکتا۔اس کے جنسی سیل سے چونکہ لڑکے اور لڑکی کا متفرق تعین ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے جنسی فعل میں بھی کبھی یک رخا نہیں بن سکتا۔ہمیشہ دوشاخے کی طرح کٹ جاتا ہے۔

جنس کے راستے پر عورت کبھی خوار نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ محبت حاصل کرنے کے لیے آتی ہے اور بچہ حاصل کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ مرد اپنے آپ سے آزاد ہونے کے لیے عورت سے ہمکنار ہوتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دو حصوں میں بٹ جاتا ہے X یا Y...... بیٹا یا بیٹی...... ذات یا خدا...... فنا یا بقا...... اپنی بقا کی کوشش میں کئی بار وہ اپنی فنا سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔اسی جنسی جرثومہ کے تنوع کے باعث کبھی کبھی لاتعلق حالات میں بھی وہ تعلق پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے...... کیونکہ اس کے صنفی تخم کے اندر...... مرد اور عورت دونوں موجود ہوتے ہیں۔اسی لیے کبھی تو وہ جغرافیائی قرب کے باعث عورت سے رابطہ قائم کیے بغیر رہ نہیں سکتا...... کبھی وہ موسموں کی رومانیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ کبھی وافر وقت کا بہتر مصرف نہ پا کر کسی نہ کسی کے

قدموں میں جا گرتا ہے...... کبھی اس کے جرثومہ کا مرد اسے عورت کی طرف کھینچتا ہے کبھی اسی جرثومہ کا مرد اسے عورت کی طرف کھینچتا ہے کبھی اسی جرثومہ کی عورت اپنی ہم جنس کی تلاش میں نکلتی ہے۔ کیونکہ اس کے صنفی تخم کے اندر سائیکی کے دو مختلف روپ رہتے ہیں۔

مرد کا روپ...... عورت کا روپ...... یہی تنوع ہمیشہ کی جستجو کا باعث بنتا ہے......

اسی جستجو نے مجھے عابدہ پر...... شبخون مارنے کے لیے اکسایا۔

پہلے عابدہ کچھ اور تھی اس واقعے کے بعد اس نے مونگ پھلیاں کھانی چھوڑ دیں اور اٹک اٹک کر باتیں کرنے لگی۔ شاید وہ اس نئے رابطے کو گناہ سمجھتی تھی۔ لیکن ہم کرگس جاتی کے لوگوں پر مردہ تعلقات احساس جرم پیدا نہیں کر سکتے۔ عابدہ جو شکتی روپ تھی۔ اس کے ملاپ سے مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ جسم روح کو دغا دینے کے لیے کئی بھیس بدلتا ہے۔ وقتی طور پر کبھی کبھی جسم کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن روح کو ہمیشہ کے لیے جل دینا ممکن نہیں۔ روح کو محبت صرف اس وقت ہوتی ہے جب دو انسانوں کی سائیکی ایک دوسرے کی تلاش میں نکلتی ہے۔ ایسی صورت میں نہ وصل میں بوریت ہوتی ہے نہ ہجر میں اشتیاق بڑھتا ہے۔ سائیکی کی محبت بھوک کی جنسی کشش کی جبلت سے مشابہ نہیں ہوتی کہ سیر ہونے پر مونگ پھلی کے چھلکوں کی طرح محبوب بھی بیکار ہو جائے۔ وہ تو بھاری گھنیرے بادلوں کو اڑانے والی ہوا ہوتی ہے۔ جو جسم کا بوجھ ساری عمر اٹھائے لیے پھرتی ہے۔ جسم اور بادل کثیف ہوتے ہیں۔ محبت اور ہوا نظر نہیں آتیں۔ لیکن ان کا لطیف بہاؤ سمت بدلتا اور رفتار مقرر کرتا ہے۔ ہر قسم کی شدت تندی، طاقت کو ان میں جنم دیتا ہے۔

محبت اور ہوا غضب ناک ہو کر چاہے کیسی بھی تندی کیوں نہ اختیار کر لیں۔ لیکن جسم اور بادل کی طرح کثیف نہیں ہو سکتے۔

عابدہ اور میں ایک دوسرے کی طرف اس لیے بڑھے تھے کہ شاید ہم دونوں اپنی

فنا سے ڈرتے تھے۔ میں سیمی میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ عابدہ بچے کے بغیر اپنا سلسلہ منقطع ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں خوفزدہ تھے۔ اپنی اپنی فنا سے......

لیکن جسم میں پناہ ڈھونڈنے والے اکثر اوقات تلاش کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ موت سے محبت کرتے ہیں کہ زندگی سے......

اسی لیے ہم دونوں دو طاقتے دروازے کی مانند رہے۔ کنڈی لگی رہی تو ایک...... ورنہ دونوں پٹ علیحدہ علیحدہ رہے۔ آندھیوں میں بج اٹھنے والے...... دیواروں سے چمٹے ہوئے۔

....

اب عابدہ ناغے ڈال کر اوپر آنے لگی۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوتی تو اس کے پورنماشی چہرے پر آنکھوں کی کھڑکیاں بند ہوتیں۔ ہونٹ لپ سٹک کے باوجود پرانے پردوں کی طرح بے رنگ نظر آتے وہ کبھی سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جاتی۔ کبھی دیوار کے ساتھ بایاں کندھا لگا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرتی۔

بچپن سے جو میخیں اس کے کلچر، مذہب ماحولیات نے اس کے ذہن میں ٹھونکی تھیں۔ بالآخر اس کے ذہن کے تختے کا حصہ ہو چکی تھیں۔ اگر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن ہم دونوں تو اپنی اپنی تلاش کے باعث ہمسفر ہوئے تھے۔ اس لیے اب فقط احساس گناہ اور خود شکستگی باقی تھی۔

میں بھی عجیب قسم کے بوجھ تلے دبنے لگا تھا۔

لیکن خدا جانے وہ کیا کائناتی عمل ہے جو کبھی بڑے بڑے بوجھ بہت چھوٹے سے لیور سے اٹھا لیتا ہے۔ جیسے بھاری تھری ٹنر ٹرک چھوٹے سے جیک پر اٹھ جاتا ہے اور پنکچر سٹپنی بدلنے کی آسانی مہیا آتی ہے۔ جب کبھی **Ancient mariner**

کی نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی کہ احساس گناہ تلے دبے ہوئے بحری قزاق کو اس وقت تو رہائی نہ ہوئی جب اس نے موت اور زندگی جیسے مافوق الفطرت کردار دیکھے' لیکن چھوٹے چھوٹے دریائی سانپ دیکھ کر وہ الوہی طاقتوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

شاید زندگی کے تمام اہم واقعات قد میں ہمیشہ چھوٹے ہوتے ہیں...... ماں کا مرنا سیمی کی موت' چندر را گاؤں کا چھوٹنا' یہ بڑے سانحے تھے۔ جیسے شہر بمباری کے بعد تباہ ہوتے ہیں۔ لیکن جنگ دیدہ شہر بڑی شان کے ساتھ سرعت سے جلد ہی تعمیر ہو جاتے ہیں ہر ٹیکسلا' دلی' لاہور' ہیروشیما بڑی جلدی مرمت ہو جاتا ہے لیکن چھوٹے واقعات گھن کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر قد آور درختوں کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ لہلہاتے کھیوں میں کلر کی طرح بڑھتے ہیں۔ جو شہر دریاؤں کے پاس آباد ہوں اور دریا ہولے ہولے کروٹیں لیتے رہیں۔ ایسے شہر ہولے ہولے ہی برباد ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی آباد نہیں ہوتے...... ان کے اردگرد بے آب وگیاہ ریت پھیل جاتی ہے۔

ماں کا مرنا بڑا واقعہ تھا...... لیکن اس کے اردگرد پھیلے ہوئے چھوٹے واقعات بڑے اہم تھے۔

ماں کا مرنا ایسے زلزلے سے مشابہ تھا جس کے ساتھ اونچی عمارتیں ماتھا جوڑ کر پھٹ جاتی ہیں۔ سڑکوں میں چھتنارے...... درخت دھنس جاتے ہیں۔ لاوا اژدہے کی طرح لاوارث پھرتا ہے...... لیکن زلزلہ لمحوں کی بات ہوتی ہے...... ماں کا مرنا ایسے ہی تھا۔ ہزاروں واٹ کی بجلی گری اور بھسم کر گئی...... لیکن ماں کے مرنے سے کچھ سال ادھر کے کئی چھوٹے چھوٹے واقعات اس کے مرنے کے ساتھ ہی اہم ہو گئے۔ جیسے ٹائیفائڈ مرض کے بعد برسوں سر پر بال نہ اگیں۔ بغیر تلے کی جوتی میں چلنے کی وجہ سے کیکر اور ببوں کے کانٹے پیروں میں چبھ جائیں اور کئی شامیں کئی

راتیں اپنے جسم کو سوئی سے پچھوتے نکلیں۔

میرے باپ کا گھرانہ بڑا شان والا تھا۔ چند راتیں ہماری حویلی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ نک طوطے ابا کا سارا خاندان فیوڈل تھا۔ اسی لیے ماں کا میکہ گمنام رہا۔ ہم ماں کے کسی رشتہ دار کو نہ جانتے تھے۔ وہ حویلی میں اپنی کلب کی اور خاندان کے اندر ابا کی رعایت سے بڑی چودھرائن تھی۔

لیکن جب ماں بیمار پڑی اور گھر سے بھیڑ کم ہونے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ قصور جا کر اپنے مائیکہ گھر میں مرنا چاہتی تھی۔ باپ کو ماں کی اس آرزو پر منطقی طور پر کوئی اعتراض نہیں تھا' لیکن ساری بات غیرت کی تھی۔ ہمارے گھر کی کوئی بھی بڑی سیانی اپنے میکہ گھر میں فوت نہیں ہوئی تھی......

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ماں کو عصر کے وقت ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ وہ آنگن کے بڑے پیپل تلے نواڑی پلنگ کو گھسیٹتی رہتی، جدھر جدھر سورج چلتا ادھر ہی کو اس کا پلنگ کھسکتا جاتا، حتیٰ کہ سورج غروب کے وقت اس کی چارپائی عین ان سیڑھیوں سے جا لگتی جو حویلی کی دوسری منزل کو جاتی تھیں۔

سردیوں سے ہوتا ہوتا بخار گرمیوں میں بھی رہنے لگا۔ اب ماں چھاؤں کی تلاش میں چارپائی کھسکانے لگی۔ جس وقت سورج پھیکا پڑ کے اندھا ہو جاتا، وہ پیپل کے تنے تلے عین گھڑونجیوں کے پاس چارپائی کھسکا کر پڑی رہتی۔ اب بھی آنگن میں شام کے وقت میلہ سا لگا رہتا تھا، ماں کی طبیعت کا پوچھنے دو آتیں تو چار اٹھ کر چلی جاتیں، لیکن اب ماں کی کھنک دار آواز نہ آتی...... قیومی مختار...... بیٹا سروئی پی لو...... پھر مغرب کا وقت ہو جائے گا۔ میری نماز کھنچ جائے گی کاکا۔''

اب کوئی نہ کوئی ہمیں سروئی کے گلاس پکڑا دیتا، پھر خالی گلاس گھڑونچی پر پڑے رہتے، رین بسیرے والی چڑیاں گھنیرے درخت میں اس قدر شور مچاتیں کہ جی ڈرنے لگتا لیکن ماں آنکھیں موندے چپ چپ پڑی رہتی۔ اب اسے نماز کے قضا

ہونے کا بھی کوئی فکر نہ تھا۔

چڑیوں کا بلبلانا ایک چھوٹا سا واقعہ بن گیا تھا۔ ان کی تصویر کے اوپر مغرب کی اذان سوپر امپوز ہو جاتی۔ گرمیوں میں دن کا یہ پہلا ٹھنڈا پہر ہوتا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرا جی چاہتا کہ دوپہر چڑھی رہے...... دوپہر کے وقت ہی یہ ڈر نہیں ہوتا تھا، کہ ماں کہیں جا سکتی ہے...... لیکن مغرب کے وقت پتہ نہیں کیوں کئی قسم کے خوف مجھے گھیر لیتے، مجھے لگتا کہ شاید اسے جھٹپٹے میں ماں چھپ چھپا کر غائب نہ ہو جائے۔

ماں کے مرنے سے کچھ دن پہلے ایک اور بڑا معمولی واقعہ پیش آیا۔

اس روز ماں کو اس کی سہیلی اصغری اور میراثن برکتے نے غسل کرا کے پھیکے سبز رنگ کا سوٹ پہنایا تھا۔ نومبر کی دھوپ ابھی آنگن میں تھی، وہ دونوں ماں کو سہارا دے کر باہر لا رہی تھیں اور میں اوپر جانے والی سیڑھیوں پر گنا گود میں لیے بیٹھا تھا۔ چلتے چلتے میں ماں کی آنکھیں تھیں۔ اس کے ہونٹ یوں جڑے تھے جیسے درد کو باہر نکل کر واویلا مچانے سے روک رہے ہوں۔

اس سے پہلے ماں کے کانوں میں کئی بالیاں تھیں لیکن آج اس کے تمام کان خالی تھے۔ یہ میرے لیے ایک اور چھوٹا سا واقعہ تھا۔ میں بغیر بالیوں والی ماں کا عادی نہیں تھا۔ نومبر کی دھوپ میں پلنگ پر بیٹھی میری ماں کا رنگ سوجی کی مانند پھیکا نظر آ رہا تھا۔ پھر ککے زین اصغری نے ماں کی چٹیا کھینچ کر بنائی، اس کے بال اتنی سختی سے مٹھی میں لیے کہ ماں کی بادامی آنکھیں چینی نظر آنے لگیں۔ کچھ دیر تک وہ دونوں مٹھی چاپی کرتی رہیں اور جب عصر کی اذان ہوگئی تو ماں کی ملتانی کھیس اوڑھا کر چلی گئیں۔

اس وقت میں ڈرتے ڈرتے ماں کے پاس گیا۔ چڑیوں کے آنے سے پہلے مجھے چڑیوں کے بلبلانے سے خوف آتا تھا۔

"تیری بالیاں کہاں ہیں ماں؟"

ماں نے بڑی مشکل سے پلکیں اٹھائیں دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی

تھیں۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں قیوم...... قیومی۔''

ماں نے آنکھیں بند کرلیں اور آنسو اس کے کانوں کی طرف بہنے لگے۔

''پتہ نہیں تو کب جوان ہوگا......... کتنی دیر لگادی تو نے جوان ہونے میں۔''

''ہم دونوں جوان ہیں...... دیکھ تو سہی'' ...... میں نے گاؤں میں سن رکھا تھا کہ ماؤں کو بیٹوں کی شادی کا بہت شوق ہوتا ہے۔

''تو ہماری شادی کرنا چاہتی ہے تو کردے۔''

وہ مسکرادی۔

ایک اور چھوٹا سا واقعہ۔

اس روز کی مسکراہٹ کے بعد پھر میں نے ماں کو مسکراتے نہیں دیکھا۔

''کتنے ہی سال سسرال میں رہو، کتنے ہی بچے جنو...... کیسے کیسے کاج سنوارو، کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ سسرال میں تو شوہر بھی اپنا نہیں ہوتا۔ دوسروں کا گلہ کیسا؟ چونکہ اس وقت میں صرف ساتویں میں پڑھتا تھا اور پوری طرح شادی کے قابل نہیں ہوا تھا، اس لیے میں رونے لگا۔ میں ماں کی باتیں نہیں سمجھ رہا تھا۔ صرف ماں کی آواز میں اس کے دکھ تلے ماں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جب تو جوان ہوجائے گا تو اپنے مامے کے پاس جانا...... منظور الٰہی قصوری۔ کے پاس۔

پہلی بار میں نے اپنے ماموں کا نام سنا۔

''تو مختار بھائی کو بھیج دے قصور...... وہ تو بی اے میں پڑھتے ہیں جوان ہیں، ہاں جوان ہے لیکن وہ اپنی دادی کی گود میں پلا ہے۔ جہاں کہیں وادی کا بیر ہے وہاں مختار نہیں جاسکتا۔''

تو مجھے ماے منظور کا پتہ بتا دے میں چلا جاؤں گا۔ کل سویرے ہی۔"

"لاریوں کے اڈے سے بلھے شاہ کے مزار کا پوچھ لینا۔ باہر والی گول سڑک پر بلھے شاہ کے مزار کے سامنے بازار کو ایک راستہ جاتا ہے...... بازار کی طرف مت مڑ جانا۔ بس گول سڑک پر رہنا۔ ایک بڑا سا احاطہ نظر آئے گا۔ بڑے پھاٹک سے کوئی سو گز کے فاصلے پر۔ یہ احاطہ میرے بھائی کا ہے، جس روز میں گھر سے نکلتی تھی اس روز اس پھاٹک پر مراثی سہرے لگا کر گئے تھے۔ میری بھابی کے لڑکا ہوا تھا، اس روز پتہ نہیں اب تو وہ جوان ہو گیا ہوگا۔

"تو...... کیوں نکلی تھی ماں...... دیہات میں ہم بڑے کے لوگ نکل جانے کو اچھی طرح سمجھتے تھے"۔

بڑے قحط کا سال تھا۔ بارش کا قطرہ نہ برسا تھا اور بھادوں کا مہینہ تھا جا لگا تھا، درختوں پر مٹی جمی تھی۔ سڑکیں راکھ جیسی ہو گئی تھیں۔ میں چوبارے میں رہتی تھی، بھابی کے ساتھ اور سارا دن بلھے شاہ کے مزار کی طرف منہ کر کے اس کے بچوں کو کھلایا کرتی تھی...... تین بچے تھے میری بھابھی کے...... سب کو میں نے گودی کھلایا تھا۔

ماے منظور کو بلا لاؤں ماں۔"

"ناں ناں اس کا نام بھی مت لینا حویلی میں۔ تیرا باپ ناراض ہو جائے گا۔"

اس سے پہلے کبھی ماں کے منہ سے میں نے ماے منظور الٰہی کا نام بھی نہ سنا تھا۔

"اس روز سارے قصور پر مٹی کا بادل چڑھا تھا۔ قوال بلھے شاہ کے مزار پر چوکی بھر رہے تھے۔ میں تیسری منزل پر کھڑی کبوتروں کو باجرہ ڈال رہی تھی، پتہ نہیں قوالوں کی آواز میں کچھ تھا کہ آسمان چڑھی ہوئی مٹی میں کوٹھے سے اتری۔ بڑے پھاٹک سے نکلی اور مزار پر چلی گئی۔"

میں چپ چاپ ماں کے پاس کھیس کے اندر گھس کر لیٹ گیا۔ ماں کے جسم سے نما نما سینک نکل رہا تھا۔

قوالوں سے آگے چھوٹے برآمدے میں ستون کے ساتھ سر لگائے تیرا باپ بیٹھا تھا تیرا باپ بڑے سماں کہتا رہا کہ اس روز بلھے شاہ کے مزار پر اس کی دو دعائیں ایک ساتھ پوری ہوئیں۔"

''کون سی دو دعائیں؟''

''اس روز میں مزار سے گھر واپس نہیں گئی...... میری کون سی ماں تھی گھر پر جس سے میں اجازت لینے جاتی...... جب ہم چندرا میں داخل ہوئے تو بڑی تکویں بارش ہو رہی تھی۔ تیرے ابے نے تب مجھے بتایا کہ وہ بلھے شاہ کے مزار پر بارش کے لیے دعا کرنے گیا تھا۔

تو...... اپنے گھر واپس کیوں نہیں گئی ماں بول...... بتا۔"

میں نے دونوں ہاتھوں میں ماں کا چہرہ لے کر پوچھا۔

دیکھ کسی سے یہ بات کرنا نہیں اچھا تیرا ابا ناراض ہو جائے گا...... وہاں میرا اپنا کوئی نہیں تھا ناں...... نہ ماں نہ باپ...... پر یہاں اتنے سال سسرال رہنے کے بعد پتہ چلا...... وہاں منظور الٰہی تو تھا ناں۔

اس کے بعد میں نے ماں کو بہت بلانا چاہا، لیکن وہ میری طرف پیٹھ کر کے ہولے ہولے روتی رہی۔ ماں کے مرنے سے بھی زیادہ اس چھوٹی سی شام نے مجھے اپنے اندر گھول لیا تھا، ماں کے مرنے کے بعد جب بھی میں لیٹتا مجھے یوں لگتا جیسے اب بھی وہ میری طرف پیٹھ کیے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی ہے۔

جس روز ماں کا چالیسواں تھا، اس سے ایک رات پہلے میں نے چندرا کو چپکے سے خدا حافظ کہا، آسمان پر دور دور تک مٹی چڑھی تھی، ایک بھی ستارہ نظر نہ آتا تھا اور بلا کی گرمی تھی۔

جس وقت میں قصور کی گول سڑک پر پہنچا تو اس روز بھی بلھے شاہ کے مزار پر قوال چوکی بھر رہے تھے...... آڑھتی منظور الٰہی کا گھر تلاش کرنے میں مجھے ذرا بھی تکلیف

نہ ہوئی احاطے میں داخل ہوا تو ماں کی شکل کا ایک بوڑھا اندر سے وضو کا پانی کہنیوں سے پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ اس نے لمحہ بھر کو مجھے دیکھا۔ ٹھٹھکا اور میرے گلے لگ گیا۔

''کیا حال ہے رابعہ کا؟''

''ماں تو مر گئی۔''

مامے نے میری طرف دیکھا پھر آسمان کی جانب نگاہ دوڑائی ...... اس وقت چڑھی آندھی میں کبوتر چکر لگا رہے تھے۔ ماں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کب؟''

بلھے شاہ کے مزار پر قوالوں نے پورے زور سے سر لگائے۔'' ریا میرے اوگن چیت نہ دھریں۔

پتہ نہیں وہ مامے منظور الٰہی کے وضو کا چھینٹا تھا کہ اس کے اچٹے ہوئے آنسو تھے کہ بارش کا پہلا قطرہ ...... میرے ماتھے پر ٹھنڈی برف کی کنی گری۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

اس روز پھر بارش شہر کو غرق کرنے کی سوچ میں تھی۔

مامے منظور الٰہی کی ملاقات کتنا چھوٹا سا واقعہ تھا...... لیکن اس نے مجھے پاؤں میں زنجیریں پہنا دیں اور بی اے کرنے کے بعد تک میں چندرا نہ جا سکا۔

....

عابدہ بہت دنوں کے بعد میرے کمرے میں نظر آئی۔

مجھے کاسنی رنگ کے ہر شیڈ سے نفرت ہے اور وہ سر سے پاؤں تک بیگنی' کاسنی 'کلیجی مائل لگ رہی تھی۔ شاید وہ دیر سے یہاں بیٹھی تھی کیونکہ چارپائی کے نیچے مونگ پھلیوں کے چھلکوں کا ڈھیر تھا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں کھڑے ہو کر تھوک سڑک پر پھینکی۔

''قیوم! بری عادت ہے ہر وقت تھوکنے کی۔''

میں چپ رہا۔

''میری مامی تھیں ایک ان کو طہارت کی بری عادت تھی۔ پوری پوری بالٹی پانی سے کرتی تھیں۔''

ہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ بھی۔''

''آج بہت دنوں کے بعد عابدہ نے اپنے شوہر کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔''

''خدا کی قسم قیوم جیسی خدمت میں نے وحید کی کری ہے ناں ویسی کوئی ماں جنی نہیں کر سکتی...... لیکن اس کو پرواہ نہیں کہ میری گود خالی ہے۔ کہتا ہے بچہ خواہ مخواہ دردسر ہوتا ہے...... کیوں بچہ کوئی دردسر ہوتا ہے؟''

میں...... صرف اس کی زکامی آواز سن رہا تھا۔ متن پر میرے کان نہیں تھے۔

''ذرا بچے کی بات زور دے کر کہہ دوں تو فٹ رونے لگے گا کہے گا تمہیں کیا کوئی جئے یا مرے تمہیں تو بچہ چاہیے بچہ۔''

میں نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہا...... ''ہاں یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے...... تمہیں صرف بچہ چاہیے اس دنیا میں۔''

''کیا ٹھیک کہتا ہے قیومی؟۔''

''یہی کہ اگر تمہارا اس سے کوئی رشتہ ہوتا تو تم اس کی تکلیف محسوس کرتیں۔''

پلاسٹک کی انگوٹھیوں والا ہاتھ گھما کر وہ بولی...... '' میں اس کی بیوی ہوں نکاحی ہوں اس سے...... اس سے بڑا رشتہ کیا ہوتا ہے۔''

یہی کہ اگر تمہارا اس سے کوئی رشتہ ہوتا تو تم اس کی تکلیف محسوس کرتیں۔''

''بیوی اور پی اے سے کسی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ کوئی اچھا پی اے ہوتا ہے کوئی نالائق...... کسی کو شارٹ ہینڈ آتی ہے کسی کو سپیڈ زیادہ ہوتی ہے کوئی چھٹی اچھی

ڈرافٹ کرتا ہے کوئی ن وٹس لینے میں تیز ہوتا ہے۔ ہر آفیسر پی اے کے ساتھ بندھا ہوتا ہے ہر شوہر ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ بی بی عابدہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوتی ہے دوسری بری۔ اچھی بیوی کھانا پکاتی ہے برتن مانجھتی ہے وقت پڑنے پر پاؤں دباتی ہے۔ چپ رہتی ہے لیکن اسکے ساتھ کبھی اس بیوی سے زیادہ ناطہ نہیں ہوتا جو گھر کے خرچے سے زیور بناتی ہے فلمیں دیکھتی ہے سسرال والوں سے لڑتی ہے۔ نوکر ملازم خدمت گار کے ساتھ تعلق پیدا ہو سکتا ہے لیکن پی اے کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہوتا بیوی بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔

یہ یہ یہ تم کیا بک رہے ہو آج...... دنیا میں ہر رشتہ سگا بھی ہو سکتا ہے اور سوتیلا بھی...... سگی ماں سوتیلی ماں...... سگا بھائی سوتیلا بھائی...... لیکن بیوی ہمیشہ سگی ہوتی ہے کبھی تم نے سنا یہ میری چوتھی سوتیلی بیوی ہے۔

میں نے محض اس کو چڑانے کے لیے کہا...... سگا سوتیلا ہمیشہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرانی ہو...... جہاں رشتہ ہی موجود نہ ہو وہاں سگا سوتیلا کیا معنی؟۔

وہ اپنی پٹڑی پر بولتی چلی گئی...... اولاد ایک سگی دوسری سوتیلی...... چاچے تائے کچھ سگے کچھ سوتیلے...... بیوی پہلی سگی دوسری سگی تیسری چوتھی...... سب سگی بیویاں۔

میں آج کچھ ضرورت سے زیادہ برہم تھا۔ میں اس سے جھگڑنا چاہتا تھا۔ آج مجھے وہ شکتی سروپ نہیں لگ رہی تھی۔ میں اس ک وجود میں اتر کر تنترا کے سہارے خدا تک پہنچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس راستے نے بھی مجھے تسکین دینے کے بجائے الٹا الجھا دیا تھا۔ میں اسے اذیت دے کر دکھ پہنچا کر حلال کر کے سکون سے سگریٹ پینا چاہتا تھا۔

جان من عابدہ بیگم بیوی فقط Catalyst ہوتی ہے۔ سارے اصلی نقلی رشتے بناتی ہے...... پہلی بیوی کی اولاد ہو تو سب سگے بیٹے بیٹیاں...... دوسری کے تمام سوتیلے نہ

پہلی کے ساتھ کوئی رشتہ نہ دوسری کے ساتھ۔

وہ رضائی گھسیٹے جا رہی تھی اور اب میں اکڑوں تکیے پر بیٹھا تھا۔

ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے قیوم...... تم ایسی باتیں سوچتے ہو جو مذہب اور شریعت نے حرام کر رکھی ہیں سچی۔

مثلاً۔

رشتہ داری، اللہ رسول کے احکامات ہیں ان کے متعلق...... بیوی بچوں کے حق بندھے ہیں مذہب میں...... جو یہ سارے جھوٹے ہوتے تو شریعت ان کی پابندی کراتی...... اتر کر نیچے بھائی بھابھی سے ملا کرو۔ بچے ہیں ماشاء اللہ ان سے کھیلا کرو۔ ان پر بھی پیار نہیں آتا؟''

نہیں۔''

''توبہ...... ایسے کوئی کہتا ہے...... کہیں بھابھی صولت کے سامنے نہ بکواس کر دینا''۔

''وہ جانتی ہے۔''

ساری بات یہ ہے کہ اس بدبخت سیمی نے تمہارے دماغ میں فتور بھر دیا ہے۔ عشق کا بخار چڑھا ہے تمہیں...... مجھے جو کہیں مل جائے تو الو کی پٹھی کو سیدھا کر دوں۔ خود تو مر گئی اس بیچارے کو ویسے ہی پاگل کر گئی...... اللہ کی شان۔

''کسی نے میری ریڑھ کی ہڈی پر برف مل دی۔

''خبردار پھر کبھی سیمی کو کچھ نہ کہنا۔''

''کہوں گی کہوں گی...... اس نے تمہیں پاگل کر رکھا ہے...... ہائے کبھی مسلمانوں کے لڑکے یوگا کرتے پھرتے تھے؟...... وہ بھی تنترا یوگا...... نجس ناپاک خیالات اسی نے بسائے تمہارے دل میں اپنے گناہ پر نقاب ڈالنے کو...... تم کسی دماغی امراض کے ڈاکٹر سے ملو قیوم سچ خدا کی قسم! اور توبہ کیا کرو اپنے گناہوں پر۔''

"پھر اس کا نام نہ لینا عابدہ...... میں نے اس کے کندھے پکڑ کر کہا۔

''وہ جو سارا دن تم وحید کی دھجیاں اڑاتے پھرتے ہو وہ ٹھیک ہے۔ آخر میرا مجازی خدا ہے وہ۔''

''ہوگا لیکن میرا مجازی خدا نہیں ہے۔''

ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے اس نے اپنے کندھے میری گرفت سے چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی۔ لیکن میں نے اسے چھوڑا نہیں۔

بڑی دیر بعد میں نے کہا...... ''سچ بولنے کی کوشش کرنی چاہیئے...... لیکن۔''

اس نے مجھے بات مکمل کرنے نہ دی اور بولی...... سچ بولنا کوئی کمال نہیں ہے سچ سننا بڑا کمال ہے۔''

کیا مطلب؟

سچ بولنے کی قوت ہمیشہ سچ سننے والوں سے ملتی ہے۔ تم سچ بول تو لیتے ہو لیکن سچ سن نہیں سکتے...... یہ تمہاری کمزوری ہے سیدھی۔'

''تمہیں غلط اندازہ ہوا ہے...... مجھ میں سچ سننے کی اہلیت ہے۔''

ہے؟...... سرمہ لگی آنکھیں مٹکا کر اس نے پوچھا۔

ہے۔''

''میمی کے خلاف بھی؟......'' اس نے شرارت سے پوچھا۔

''ہاں اس کے خلاف بھی۔''

''کل بولو گے میرے ساتھ...... سچ سننے کے بعد۔''

''ضرور''

اچھا...... اب سنو تم درمیانے قد کے دبلے پتلے مرد نما لڑکے ہو۔ تمہاری مونچھیں تمہارے چہرے پر نہیں سجتیں۔ تمہارے بالوں سے خشکی جھڑتی رہتی ہے جو تمہاری کوٹ کے کالروں پر بری لگتی ہے۔ تمہارے بڑھے ہوئے ناخن گندے ہوتے

ہیں۔تمہارا مزاج ایسا ہے جیسے راکھ جلتے کوئلے پر چڑھی ہو......اوپر سے بجھے ہوئے اندر سے جلا دینے والے...... ہر وقت کتابیں پڑھ پڑھ کر تم نیم پاگل فلسفی ہو گئے ہو۔"

میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ میری سخت گرفت کے نیچے کسمسائی۔

"پتہ نہیں کیوں میں نے تمہارے پاس آ جاتی ہوں قیوم...... مجھے پتہ بھی ہے کہ یہ جائز نہیں...... حرام ہے پتہ نہیں مجھے بچے کی تلاش لاتی ہے کہ اپنی تنہائی...... پتہ نہیں میں تمہیں چپ کرانے آتی ہوں کہ اپنے آپ کو؟"

یکدم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اپنے ہونٹ اس کی گال پر رکھ دیے۔

"ناں قیوم! یہ گناہ ہے...... میں نے توبہ کر لی ہے۔

"کس بات کی۔"

"بس کسی بات کی...... ایسے بچے کا بھی کیا فائدہ۔"

وہ چپ چاپ بستر سے اٹھ گئی۔ چھناکے سے مونگ پھلیوں کا لفافہ فرش پر گر گیا۔

اب عابدہ نے کوٹھے پر آنا بالکل چھوڑ دیا۔میری نوکری نئی تھی۔اس لیے میں نے پوری توجہ سے ریڈیو سٹیشن پر وقت گزارنا شروع کر دیا۔

صبح شیو کرتا تو بار بار بالوں میں برش پھیرتا۔ پتہ نہیں کیوں عابدہ نے میرا جو سچا سراپا بیان کیا تھا۔اس سے مجھے شرم آنے لگی تھی،سردی اب کم ہو گئی تھی۔ میں بھی ماضی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بہت سی کتابیں خرید لایا تھا......"اپنے آپ کو بدل ڈالو۔"

"تم اور تمہارا مستقبل" ...... "بدلنے کے بائیس گر" ......اس نوعیت کی ان گنت امریکی کتابیں ریڈیو سے واپسی پر اب میرے ساتھ ہوتیں۔ میں یوگا سے کھل کر کچھ دنوں ٹی ایم کے چکر میں پڑا رہا۔ Relax کرنے کا یہ ڈھنگ کچھ دنوں مجھ پر سوار رہا۔ پھر میں نے یہ راستہ بھی چھوڑ دیا۔ لمبے سانس، تپسیا، منتر، زن بدھ ازم ......سب بیکار باتیں تھیں...... میں اپنی انا کی پوست میں سمٹا ہوا تھا، مجھے ہر جگہ اپنے آپ ہی سے لڑنا تھا۔ عابدہ سے میرا کوئی ناطہ نہیں تھا۔ لیکن اس نے مجھے اپنی صحبت کی ہڈی پر سیدھایا ہوا تھا۔ میں اس کی محبت میں مبتلا نہیں تھا۔ لیکن اس کی رفاقت سے اس قدر رہل گیا تھا کہ اگر وہ دو چار دن اوراوپر نہ آتی تو از سرِ نو مجھے چاند میں بونے کھیلتے نظر آتے اور آنگن میں دن چھپنے پر سیمی بیٹھی نظر آتی۔

اس روز میں نے پہلا دیہاتی پروگرام پروڈیوس کیا تھا۔ مجھے ہلکی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ نئے کام کی نئے ماحول اور نئے تعلقات کی خوشی ...... مجھ پر خوشی ایسے ہی چڑھی ہوئی تھی۔ جیسے آلو بخارے پر ہلکی سی دھند نما موم چڑھی ہوتی ہے۔ بھائی مختار کا موٹر سائیکل میں نے آنگن میں رکھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ عابدہ کو دیہاتی پروگرام کے متعلق سب کچھ بتاؤں جو کچھ وہ سمجھ سکے وہ بھی اور جو کچھ وہ سمجھ نہ سکے وہ بھی۔

آنگن میں بھابھی صولت، عابدہ اور ایک اجنبی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اجنبی کے چہرے پر تکبر، سر پر ہلکا سا گنج اور جوتے کی پالش میں مڈل کلاس زندگی کا عکس تھا۔ پتہ نہیں یہ اجنبی مجھے کیوں برا لگا۔ مجھے بھابھی نے آواز دی لیکن میں ہمیشہ کی طرح ان سنی کر کے اوپر آ گیا۔

میرے کمرے میں چائے کاڑے اور مونگ پھلیوں کا لفافہ پڑا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر عابدہ کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن گھنٹہ بھر بعد میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور پھر اسے ٹھنڈی ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ نئے پرانے زخم آہستہ آہستہ کھل رہے تھے، کئی سوال؟...... جو کچھ دن سے مجھے ستاتے نہ تھے آج دوبارہ پوری آب و تاب سے

ابھر آئے تھے، بڑی دیر تک میں باہر کوٹھے پر ٹہلتا رہا۔ یکدم مجھے اپنی گدی سے کئی سمتوں میں آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے کئی بار پلٹ کر دیکھا، جیسے میرے سر کے ساتھ کوئی اور سر جوڑے ٹہل رہا تھا۔ پھر کمرے کا روشندان آنکھ کی پتلی کی طرح کھلنے اور بند ہونے لگا...... آسمان کی کمر میں چاند کا خنجر بندھا تھا۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے ابھی ایک نادیدہ ہاتھ کمر بند سے یہ خنجر کھول کر میرے سینے میں پیوست کر دے گا۔ میرے معدے میں یکدم بہت سا تیزاب جمع ہو گیا۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟

انسانی رشتے؟...... نفرتیں محبتیں؟

یہ سب کچھ کیا ہے۔

زندگی کا سفر؟

ہمیں کیا چاہیئے؟...... ایک دوسرے سے؟...... اپنے آپ سے؟

عمر کا فریب، عقل کا فریب، محبت کا فریب...... معاشرہ اور فرد...... فرد اور قانون...... قانون اور قانون فطرت...... ان سب کی حدیں کون سی ہیں؟

ایک آدمی کیا صرف جسمانی طور پر کسی اور کو ہلاک کر سکتا ہے کہ ہلاک کرنے کے لیے جسم کی قید نہیں......؟

سوال بڑے بھنور میں چھوٹے تلاطم بن کر گھوم رہے تھے۔ کئی حقیقتیں، کئی عزائم کئی جھوٹ کئی سوچیں آپس میں مشین کی سلائی جیسی جڑتی جا رہی تھیں۔ مجھے اب سیمی کی تلاش نہیں تھی، اس کا مرنا ہولے ہولے حقیقت بن چکا تھا۔ لیکن اس کی موت نے ان گنت جاگتے سوالوں کو جنم دے دیا۔ جس طرح مشین کے پرزے کھوچلے ہو کر آوازیں دیتے ہیں اور ان میں پہلے سی تیزی نہیں رہتی، ان سوالوں نے بے نام جستجو بے معنی تلاش نے مجھے کھوچلا کر دیا تھا۔ میں اب زنگی کے پیٹرن پر چلتا ہوا اندر سے آوازیں دینے لگا تھا۔ عابدہ ہوتی تو یہ آوزایں مدھم ہو جاتیں۔

لیکن کبھی مکمل طور پر ختم نہ ہوتیں۔ ان ہی نے مجھ پر عجیب قسم کی وارفتگی اور دیوانہ پن طاری کر دیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ میرا وہ نام نہیں ہے جس سے لوگ مجھے پکارتے ہیں۔ اصلی نام یاد کرنے کی کوشش کرتا تو وہ یاد نہ آتا۔ کبھی مجھے لگتا کہ میں جن لوگوں سے ملتا ہوں ان کو میں نے کبھی پہلے بھی دیکھا ہے میں ان کی پرانی ملاقاتوں کو ذہن میں ابھارنے کی سعی کرتا تو بیکار نکلتی۔ کچھ چہرے کالج کے دوست، پروفیسر بھائی مختار رصولت بھابھی ان کے بچے مجھے بالکل اجنبی لگتے۔ مجھے اپنے آپ سے پوچھنا پڑتا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اور میری طرف پر امید مشتاق نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں؟ ...... جب تک عابدہ میرے پاس رہتی تھی ان بے سمت سوچوں سے چھٹکارا ملا رہتا۔ اس کے جاتے ہی ہر طرف سے ریل گاڑیاں چلنا شروع ہو جاتیں اور مجھے لگتا کہ ابھی وہ میری ذہن میں پہنچ کر آپس میں ٹکرائیں گی۔ بڑا دھماکا ہوگا اور میری کھوپڑی پاش پاش ہو جائے گی...... ان ہی سوچوں نے مجھے اپنی نوکری میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

چاند کا خنجر غروب ہو گیا۔ اب کوٹھے پر سڑک کے کھمبے کی پھیکی روشنی تھی۔ عابدہ کے آنے سے بہت پہلے اس کے سلیپروں کی آواز آئی۔ میرے دل کو ہلکی سی ڈھارس ہوئی۔

''یہاں کیا کر رہے ہو اکیلے؟۔''

میں چپ رہا۔

''اندر تمہارے لیے چائے رکھ گئی تھی۔''

''شکریہ...... پڑی ہوئی ہے سات گھنٹے سے۔''

''کیسے بول رہے ہو؟۔''

''جیسے بولا کرتے ہیں۔''

''بڑا دکھا طریقہ ہے تمہارا مہمانوں کے ساتھ...... نہ بیٹھنے کو کہا نہ آنے کی وجہ

دریافت کی۔‘‘

’’بیٹھ جاؤ اندر جا کر۔‘‘

’’اکیلی......؟‘‘

’’عورتیں اکیلی بیٹھی اچھی لگتی ہیں۔ کوئی انہیں ستاتا نہیں۔‘‘

’’پوچھو گے نہیں کہ میں کیوں آئی ہوں۔‘‘

میں نے سگریٹ سلگایا اور شہ نشین پر بیٹھ کر بولا...... ’’ضرور کوئی معقول وجہ ہو گی کیونکہ تم ہمیشہ میرے پاس معقول وجہ سے آئی ہو۔‘‘

’’بڑے کمینے ہو وحید کی طرح۔‘‘

’’ہم مردوں کی ایک ہی ذات ہوتی ہے اللہ کے فضل سے۔‘‘

’’اندر آؤ ایک بات کرنی ہے تم سے۔‘‘

کچھ دیر میں اکیلا بیٹھا رہا۔ نافرمانی پر طبیعت مائل تھی۔ لیکن زیادہ دیر رہ نہ سکی۔ بالآخر میں اٹھ کر اندر چلا گیا۔ عابدہ آج سفید کپڑوں میں بڑی ستھری اور ماڈرن لگ رہی تھی۔ پلاسٹک کے تمام زیور غائب تھے۔ لپ سٹک کا نشان تک نہ تھا۔ ڈھلے بالوں کی چھوٹی...... پاؤڈر لگی گردن سے لپٹ کر کندھے سے سینے پر لٹک رہی تھی۔

’’یہ تمہاری کیا عادت ہے موٹر سائیکل نیچے دھرا اور بغیر سلام دعا اوپر...... دھن جگرا ہے بھابھی صولت کا...... میں تو ایک دن میں نکال دوں گھر سے...... یہ گھر ہے کوئی ہوٹل تو نہیں ناں۔‘‘

’’بھائی مختار میری طبیعت کو سمجھتے ہیں۔‘‘

’’تم وحید کو تو مل لیتے...... اچھی بے نیازی ہے تمہاری۔‘‘

جیسے کسی نے گرم پانی میں مجھے غوطہ دیا۔ اندر باہر تمام زخم کھل گئے۔

’’میرا تو خیال تھا کہ سو برس کتے کی دم سیدھی کرو نہیں ہوتی۔ پر اس کو تو جلدی ہو

ش آ گئی۔"

اس کے چہرے پر ہنسی تھی...... خوشی کا گلال بکھرا تھا۔

"ایسی معافیاں مانگی ہیں بھابھی صولت سے۔ کیا ہاتھ جوڑ کر وعدے کیے ہیں۔ اپنے علاج کا بھی وعدہ کر لیا ہے۔"

میرا دل یکبارگی کانپنے لگا...... اس کی ہنسی میں فتح تھی مسرت تھی۔

"سنو عابدہ...... تمہارا خیال ہے وہ بدل چکا ہے۔ اب وہ تمہیں بہتر طور پر رکھے گا جان من کوئی شخص کسی کی خاطر نہیں بدلتا نہیں بدل سکتا...... ایک بار تم چچا وطنی پہنچ گئیں تو پھر وہی بک بک جھک جھک ہو گئی۔"

وہ کچھ دیر چپ چاپ مونگ پھلیاں چھیلتی رہی۔

"اب میں ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتی ناں بھابھی صولت کے پاس...... بیچاری بہت عزت کرتی ہیں۔ لیکن کوئی کسی کو کب تک رکھ سکتا ہے...... اب عزت سے لے جائے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"تم تو کہتی تھیں کہ اگر ایک لاکھ روپیہ بھی کوئی دے تو میں کبھی وحید کے ساتھ نہ جاؤں۔"

تنک کر وہ بولی...... "یہ میں نے کب کہا تھا۔ میں تو بس اس کی شکائتیں کرتی تھی۔"

"ان ہی شکائتوں پر بھروسہ کر کے میں نے کہیں اندر ہی اندر تم پر اعتماد کر لیا۔ تم ...... تم میری شکتی ہو عابدہ...... تمہارے بغیر میں......"

یکدم میں چپ ہو گیا...... اس بے سود تلاش سے فائدہ۔

"کمال ہے...... میں تو ہر وقت وحید کو ہی یاد کرتی رہی ہوں قیومی...... جیسے تم سیمی کو یاد میں کھوڑے رہے ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سیمی تمہاری بیوی نہیں تھی اس لیے تم صرف اس کی اچھی باتیں یاد کرتے تھے، میں وحید کی بیوی ہوں اس لیے اسے یاد

کرنے کا میرا طریقہ مختلف تھا۔ یاد تو ہم دونوں ہی کرتے تھے ناں؟"

اس کے نزدیک ساری بات کل اتنی تھی۔ اتنی مختصر سادہ اور سچی۔

اس وقت مجھے پتہ چلا کہ یہ سیاہ گوش جیسے مردار سمجھ کر میں کئی مہینوں سے اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ اور اسے مردہ سمجھ کر اس سے اپنی زندگی کا پروٹو پلازم بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ یہ سیاہ گوش مرا ہوا نہیں تھا۔ صرف کچھوئے کی طرح مردے پن کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ مجھے جھپٹتے دیکھ کر اس نے جھرجھری لی اور ترنت جنگل کو روانہ ہو گیا۔

"اچھا تو قیومی اب میں چلوں...... اللہ تمہاری مدد کرے۔ خدا قسم مجھے کبھی کبھی تو تم پر واقعی ترس آجاتا تھا۔"

وہ اٹھ...... کھڑی ہوئی اس کے اٹھنے کے انداز میں قطعیت تھی۔

"تم اس حیوان کے ساتھ نہیں رہ سکتیں...... وہ تمہیں نہیں سمجھتا...... اس کا علاج نہیں ہو سکے گا عابدہ۔"

"یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا۔"

واقعی یہ میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ وحید اسے نہیں سمجھتا اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔

"عابدہ میں ان گنت سوالوں میں گھرا رہتا ہوں...... اتنے سارے سوال...... کہ میرا اپنا وجود ان میں کھو گیا ہے...... تم جب تک ہوتی ہو...... مجھے یقین رہتا ہے کہ میں ہوں ورنہ...... ورنہ......

"تمہارا صرف اتنا قصور ہے قیومی کہ تم رشتہ داروں میں نہیں رہتے پودے کو جڑ چاہیے کھڑا رہنے کو......

"صرف تم میری جڑ بن سکتی ہو...... صرف تم"

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تم پاگل ہو دراصل اس کالج کی کم بخت نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے...... تمہارے دماغ کو گرمی ہو گئی ہے...... کسی دماغی امراض کے

ڈاکٹر سے ملو قیومی خدا کے لیے۔“

”تم اگر یہاں رہو گی تو...... میں ٹھیک ہو جاؤں گا رشتہ داروں سے ملنے لگوں گا...... اگر تم ایسے نہ رہنا چاہو گی تو میں تم سے نکاح کر لوں گا۔“

”ہے نامت ماری گئی تمہاری.......... میں کیوں نکاح پر نکاح کروں گی؟ اس نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

پتہ نہیں کیوں میری آنکھیں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس لیے نہیں کہ مجھے عابدہ سے محبت تھی۔ میں اس سے بچھڑنا نہ چاہتا تھا بلکہ صرف اتنی بات تھی۔ وہ میری زندگی کے منفی پیٹرن میں ایک مثبت سمبل تھی...... یقینی چیز تھی...... باقی سب کچھ غیر یقینی۔

”نیچے چل کر وحید سے نہیں ملو گے؟“

میں نے منہ پرے کر لیا...... میں کسی گنجے کو متھا ٹیکنے نہیں جا سکتا اس وقت۔“

”لیکن آخر ہوا کیا ہے...... میں اس کی بیوی ہوں اب وہ لینے آیا ہے تو کیا میں اس کے ساتھ بھی نہ جاؤں خیر سے۔“

”ضرور جاؤ......“ میں اونچے درخت کی آخری شاخ پر بوڑھے گدھ کی طرح چپ چاپ ہو بیٹھا۔

”عجیب پٹھا دماغ ہے تمہارا...... کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرو جلدی سے جلدی۔“

”اور تمہارا دل بھی عجیب ہے...... اتنا کچھ تمہارے جسم کے ساتھ ہوا۔ اس پر رتی اثر نہیں ہوا؟“

”واقعات پر اپنا بس تھوڑی چلتا ہے گناہ تو آدمی سے ہوتے رہتے ہیں۔ بندہ بشر جو ہوا۔ توبہ کر لے بس...... آیندہ کے لیے...... اللہ معاف کرنے والا ہے۔

۔

”بس ساری اتنی سی بات ہے؟۔“

وہ کھسانی ہو کر بولی......“ اچھا نیچے چل کر وحید سے ملو۔“

''جانے دو عابدہ تم سب ایک سی ہو۔''

آج وہ اندر باہر بہت خوش تھی اسے اس بات پر بھی غصہ نہ آیا۔

''کیسی ہیں ہم سب؟''

''جیسی بھی ہو ایک سی ہو۔''

میں نے چادر چہرے پر کھینچ لی۔ میرا خیال تھا وہ چادر اتارے گی غصہ جھاڑے گی ہمیشہ کی طرح بلائے گی منائے گی لیکن وہ کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر توبہ استغفار پڑھنے کی آواز آئی۔ بعد ازاں کمرہ اس قدر چپ ہو گیا کہ چادر کے اندر مجھے خوف آنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ کرگسوں کو منانے کوئی نہیں آئے گا تو میں نے چادر سے باہر سر نکالا۔ چائے کا سامان ٹرے میں دھرا تھا۔ دونوں پیالیوں میں ٹھنڈی چائے پر کریم کی جھلی چڑھی ہوئی تھی۔ پائینتی مونگ پھلیوں کے چھلکوں کا چھوٹا سا ڈھیر تھا اور ان کے قریب عابدہ کے سفید سلیپر پڑے تھے...... ربڑ کے سفید قینچی سلیپر۔

میں نے اٹھ کر ان سلیپروں کو غور سے دیکھا پرنام کیا اور پھر پلنگ کی چادر سے صاف کر کے الماری کی اوپر والی شلف میں رکھ دیا۔ اس کے پاس ہی میری ماں کی چھوٹی سی تصویر فریم میں جڑی ہوئی پڑی تھی۔ شاید اسی جذبے کے ساتھ راجہ بھرت نے بن باسی مہاراجہ رام چندر کی کھڑاویں راج سنگھاسن پر رکھی ہوں گی...... عابدہ کے چلے جانے کے بعد بہت عرصہ میرے دل پر اس کا راج رہا۔

دوسری صبح جب میں نیچے گیا اور میں نے مختار بھائی سے موٹر سائیکل مانگی تو مجھے پتہ چلا کہ عابدہ اپنے وحید کے ساتھ چیچہ وطنی جا چکی ہے۔

اس کے بعد میرے معدے میں پھر جلن رہنے لگی اور میں Anxiety کا شکار ہو گیا۔ دراصل گیس جلن اور تبخیر کا میرے اندرونی اعضا سے اس قدر گہرا تعلق نہ تھا۔

جس قدر میری ذہنی شکستگی اور گومگوں کا عالم جسمانی ریخت کا باعث بنتا مجھے شہر میں کئی ڈاکٹر بدلنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ وہ مجھے Antiacid دوائیاں دیتے۔ دودھ پینے کی ہدایت کرتے۔ مرچ مسالے والی چیزوں سے پرہیز کرنے کو کہتے اور اصرار کرتے کہ میں اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ کر فکروں سے آزاد ہو جاؤں۔ تمام ڈاکٹروں کے نسخے تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ وہی رہتے تھے۔ ڈاکٹروں سے اکتا جاتا تو حکیموں کی بیٹھکوں پر جانے لگتا۔ تبخیر معدہ جلن اور سوزش کے لیے وہ مجھے پلاسٹک کی ڈبیوں میں معجونیں اور جوارش دیتے۔ عرق کی بوتلیں میرے سرہانے دھری رہتیں۔ حتیٰ کہ ان میں ہلکا ہلکا کاغذی سفوف سا تیرنے لگتا۔ ڈاکٹروں حکیموں کے علاوہ ہومیو پیتھک اور بائیو کیمک دوائیوں کا بھی کمرے میں انبار لگ گیا...... جس وقت عابدہ گھر کو آناً فاناً چھوڑ کر گئی اور میرا منہ کردے لعاب سے بھرا رہنے لگا۔ میں نے کئی در کھٹکھٹائے۔

صحت کی تلاش میں ایک روز میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر فیضی کے پاس چلا گیا جس سے میری پرانی جان پہچان تھی۔

آیئے آیئے.......... انہوں نے دروازہ کھول کر کہا۔

''آیئے السر کا کیا حال ہے؟''

''آپ باقاعدگی سے کالی فاس تھرٹی کھاتے رہتے تو افاقہ ہو جاتا۔''

''کھاتا رہا ہوں جی۔''

بیٹے! ہومیو پیتھک میں بس یہی خرابی ہے یہ تو مائی سین سے بھی زیادہ باقاعدگی سے کھانا پڑتی ہے۔''

ڈاکٹر نے اپنی کاپی نکالی اس میں وہ صفحات نکالے جن میں میرے سسٹم لکھے ہوئے تھے۔

نیند کا کیا حال ہے''

''بہت خراب۔ آہستہ آہستہ میں نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

''جمائیاں۔''

''آنے لگیں تو بہت آتی ہیں۔''

''خواب؟''

''پریشان۔'' میں نے جواب دیا۔

''آنکھ پھڑکتی ہے اور کئی کئی گھنٹے پھڑکتی رہتی ہے؟ اس نے پوچھا

''جی.........درست ہے۔''

''کونسی آنکھ؟.........''سوال ہوا۔

'بائیں؟'

کھجلی؟'

'ران پر.......بائیں'

''اندر کی طرف کہ باہر کی طرف۔''

''اندر.......کی جانب''

وہ آہستہ آہستہ تمام سمٹم نوٹ کرتا رہا اور پھر اٹھ کر دوائیوں کی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس وقت کوثر کلینک میں داخل ہوئی۔

وہ بیاہی ہوئی بیگموں کی طرح باقاعدہ موٹی ان کلچرڈ اور باتونی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں ڈاکٹر کو بھول بھال کر بڑی دیر تک سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ اور ہم جماعتوں کی باتیں کرتے رہے۔ ہر بار میں اس سے سیمی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں زبان اسی لفظ سے گریز کر رہی تھی۔ سیمی کا ذکر کرنے کی آرزو نے مجھے پروفیسر سہیل کی باتیں کرنے پر مجبور کر دیا۔

''ہائے پتہ ہے قیوم مجھے پروفیسر سہیل نے بڑا disappoint کیا۔ وہ میرے ہر بنڈ کے ساتھ یونیورسٹی میں ہیں ناں آج کل۔ یاد ہے ناں ہم سب ان کو کتنا

idolize کیا کرتے ہیں۔"

''میں تو اب بھی انہیں پوجتا ہوں۔"

''چھوڑو...... بڑے تکلیف دہ آدمی ہیں۔اتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔اور اتنا چھوٹا Behave کرتے ہیں۔"

''واقعی؟...... میں نے مجروح ہو کر کہا

''میرے ہزبنڈ کہتے ہیں ذرا نولج نہیں ہے سارا بولتا ہے۔ذرا حافظہ اچھا ہے کتابیں جلدی رٹ جاتی ہیں۔ان کے اقتباس استعمال کرتے رہتے ہیں۔"

میرے سامنے پروفیسر سہیل آ کھڑا ہوا۔مجھے پروفیسر کا بڑا اچھا تجربہ تھا لیکن ہر آدمی غالباً کانوں کا کچا ہوتا ہے کوثر کی بات نے میرے اعتبار میں چھید کر دیئے پیرا فزکس پر مضمون لکھنے والا بھی ہی نکلا۔

''اب بھی younger gerneration اس کے چنگل میں پھنس جاتی ہے لیکن فائدہ؟"

''جو آدمی کے ٹو جتنی اونچی باتیں کرے اور اپنے انیسویں گریڈ کے لیے مرتا کھپتا رہے Strukes کروائے کلاسوں سے واک آوٹ کرے...... وہ بالکل عظیم نہیں ہو سکتا

کیوں؟۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔میں ابھی تک پروفیسر سہیل کی شخصیت سے متاثر تھا۔میں نے کوثر سے یہ بات چھپائی کہ میں وقتاً فوقتاً ان سے ملنے یونیورسٹی جاتا رہتا ہوں۔

''تمہیں ایک secret بتاؤں...... کوثر میری کرسی پر جھک کر بولی۔

''ہاں بتاؤ۔'

''ہماری کلاس کی سیمی تھی ناں۔"

میرا جی لمحے بھر کے لیے بجلی کے کھمبے کی طرح کھڑا ہو گا ی۔

''ہاں تھی۔''

''پتہ ہے یہ پروفیسر سہیل اس کے عشق میں مبتلا تھا۔ بڑا jcalous تھا وہ آفتاب سے۔''

''نو.........!''

''یس.........!''

''نو مائی فٹ۔''

''تم میرے پاس آنا نیو کیمپس میں...... میں سارا قصہ سناؤں گی تمہیں۔''

اس کے بعد کوثر ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے ساتھ مشغول ہوگئی۔ اس کے بیٹے کے دانت نکل رہے تھے اور وہ اس تکلیف دہ مرحلے کے لیے دوا لینے آئی تھی میں نے دو گولیاں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کھائیں باقی پڑیاں رومال میں باندھ کر جیب میں رکھیں اور کوثر سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے باہر چلا گیا۔

اس وقت میرا کوئی ارادہ نہ تھا کہ میں کوثر سے ملوں گا۔ لیکن کہانی کا ایک نیا کونہ یوں باہر نکل آیا جیسے دریا کا پانی اتر جائے اور غرقاب جہاز کا مستول نظر آنے لگے۔

اس تجسس نے ایک شام مجھے پھر نیو کیمپس جانے پر مجبور کر دیا۔

نہر کے کنارے کنارے پوپلیر کے درخت ہوا میں مسلسل ہل رہے تھے۔ سڑکیں خاموش تھیں۔ صرف ہوسٹل کے لڑکے لڑکیاں پٹڑیوں پر نظر آرہے تھے۔ میں لڑکوں کے ہوسٹل کی جانب مڑ گیا۔ کوثر اور اس کا میاں گھر پر موجود نہ تھے۔ ان کا سات ماں کا بچہ ایک اناڑی ملازم کی گود میں رو رہا تھا۔ جس وقت میں واپسی پر نہر کنارے پہنچا تو اچانک مجھے ڈاکٹر سہیل نظر آگئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ملین ڈالر مسکراہٹ کے ساتھ دونوں ہاتھ ہلاتے آئے اور میرے موٹر سائیکل کی دونوں ہتھیاں پکڑ کر کھڑے ہوگئے۔

'کہاں بھئی کہاں؟...... بڑے دنوں کے بعد نظر آئے نوکری مل گئی؟''

''مل گئی سر کبھی کی۔''

''کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہے یہاں۔''

''نہیں جی۔''

پتہ نہیں کیوں میں اسے کوثر کے متعلق بتانا نہیں چاہتا تھا۔

پھر؟...... یہ ہوسٹل سائیڈ سے کیوں آ رہے ہو۔''

''آپ کو تلاش کر رہا تھا۔''

''تو اترو آؤ چلو کیفے ٹیریا میں چلتے ہیں، میں بھی کئی دن سے تمہیں ملنا چاہتا تھا۔

''نہیں سر یہیں ٹھیک ہے نہر کنارے۔'' میں نے اپنا موٹر سائیکل فٹ پاتھ کے پاس کھڑا کر دیا۔

سہیل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم دونوں نہر کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

''آج میرے دل پر بہت بوجھ تھا...... میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا مل جائے جس کے ساتھ میں اپنی تھیوری share کر سکوں you know قوم...... آپ طالب علم بہت مکینکل ہو گئے وہ متجسس نہیں رہے۔ وہ علم دوست نہیں رہے وہ...... اچھا ہوا مجھے تم مل گئے...... میرے دل پر بہت بوجھ تھا آج۔''

میرا دل دھک دھک کرنے لگا...... خیال تھا کہ وہ سیمی کے متعلق کچھ بتائے گا۔''

تم کو یاد ہے کہ ایک بار میں نے تمہیں ایک assignment لکھنے کو دی تھی...... دیوانگی کی وجہ اور میں نے بار بار کہا تھا کہ یہ وجہ چاہے کتنی بھی far fetched کیوں نہ ہوں۔ لیکن نظریہ تمہارا اپنا ہونا چاہیئے۔

'جی مجھے یاد ہے۔'

''میں کئی سال لڑکوں کو یہی Assignment دیتا رہا ہوں لیکن آج تک کسی سٹوڈنٹ نے کوئی نئی بات نہیں کی...... اب میں نے یہ سوال پوچھنا چھوڑ دیا ہ سب کتابوں سے چرا کر لکھ لاتے ہیں۔

مجھے ابھی تک یاد تھا کہ جس روز ہم دیوانگی کی آخری شکل خودکشی کی باتیں کر رہے تھے سیمی نے سفید کرتا اور نیلی جینز پہن رکھی تھی۔

''ابھی ابھی کچھ دن پہلے ساری بات شیشہ ہو گی قیوم...... میں سمجھ گیا ہوں دیوانگی کی اصلی وجہ کیا ہے ہر وقت میں سوچتا رہتا ہوں کہ وہ ذہنی پراگندگی جس کی وجہ سے کوئی شخص خودکشی پر آمادہ ہوتا۔ یہ وجہ بھی اس فعل کی طرح مکمل طور پر مبہوت کرنے والی ہونی چاہیے۔ دراصل دیوانگی ایک خارجی علامت ہے لیکن اس کی وجہ خارجی نہیں ...... اس کی اصلی وجہ میں بتاؤں قیوم...... بتادوں بولو...... راز افشاں کردوں دیوانگی کا۔''

کھلی آنکھوں والا وہ پروفیسر اس لحظہ مجھے خود دیوانہ سا نظر آیا ...... کیا اس کی دیوانگی کی وجہ بھی سیمی تھی۔

''بتائیے سر...... ضرور......''

''میں بات کو سادہ کہہ دوں گا اور زیادہ تفصیلات میں نہیں پڑوں گا تم نے کبھی بائیولوجی پڑھی ہے۔''

''میٹرک میں پڑھی تھی...... سر۔''

''پڑھا کرو بائیولوجی...... کوئی آدمی بوٹونی بائیولوجی اور فزکس کے بغیر اپنے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اس کی قدرت کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسے سمجھ نہیں آسکتی کہ کیسے اس کی تقدیر اس کی حیاتیاتی وراثت ہے۔ تمہاری آنکھوں کا رنگ۔ قد کی لمبائی رنگت ہی gcues کے تابع نہیں تمہارا گوشت ہڈی اور اعصاب پر ہی Genes حاوی نہیں بلکہ ہر خلیے کے نیوکلیس میں کروموسومز کے ربن میں انسان کی تقدیر چھپی ہوتی ہے۔''

اس نے اپنے لب میرے کان کے ساتھ لگا دیے۔

''اور بیٹا جی مغرب کے لوگ مانیں نہ مانیں لیکن ان ہی جینز کے اندر ہماری

دیوانگی کا راز پنہاں ہے۔"

"کیسے سر! کیا آپ ماحول پر qcneties کو ترجیح دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ دونوں چیزیں بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک دوسرے کے بغیر چل نہیں سکتیں۔

ہمیں نے دیوانگی کا راز پالیا ہے قیوم اور وہ ہے تغیر نوع یا mutotion سادہ طور پر سمجھ لو کہ جب کبھی evolution ہوتی ہے کوئی specie بدلتی ہے اس کی وجہ سے geve mutation ہوتی ہے ارتقاء انسانی کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے میں تبدیلی ہو۔ ہرئی پود پچھلی سے مختلف ہو...... یہ تبدیلیاں ابھی مکمل طور پر دریافت نہیں ہوسکیں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ ساری تبدیلی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

qeues پوری طرح تغیر پذیر ہوں تو ارتقا ہوتا ہے ٹوٹ پھوٹ جائے تو دیوانہ پن پیدا ہوتا ہے۔"

"سر آپ کا سارا علم مغرب سے مستعار لیا ہوا ہے۔ غالباً اسی لیے اس میں نیا پن نہیں ہے۔" میں کوثر کی باتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

سہیل نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا...... Bastard کہتے...... تم سچ ہو لیکن جب میری ساری بات سنو گے تو شاید اپنی رائے بدل لو گے جیسے میں اپنے متعلق اپنی رائے بدل چکا ہوں radiation, tranqulizers اور ایسا ہی کئی زہریلی دوائیوں سے quess میں خطرناک mutation ہوجاتی ہے آج کا مغربی سائنس دان اس حقیقت سے بہت خوفزدہ ہے وہ جانتا ہے کہ ان باتوں سے تغیر تو ہوتا ہے لیکن مکمل نہیں ہوتا۔ تغیر پذیر gene لولا لنگڑا ہو جاتا ہے اور آنے والی نسلوں پر بڑے خطرناک نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

مثلاً دو سروں والا بچہ...... چھ انگلیوں والی اولاد...... ماتھے کے درمیان تیسری آنکھ والی مخلوق...... ایسے qene کے نتائج کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ بازو نہ ہوں سرے

ہے......لیکن میں نے ایک اور وجہ بھی دریافت کی ہے......ایک نئی اور انوکھی وجہ جس سے تغیر قذیر ہوتے ہیں اور دیوانگی ہوتی ہے......غور سے سنو میں اپنی تھیوری patent کروانے والا ہوں غور سے سنو......یہ مغرب والے جب یہی نتیجہ اخذ کریں گے تو تم جیسے چرکٹے اسے فوراً اپنا لیں گے۔ لیکن اپنے آدمی کا اعتبار نہیں کریں گے۔ یہی سیاہ آدمی کی پس ماندگی کی وجہ ہے۔''

''آپ تھیوری تو بتائیں سر۔''

''مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں ہے اور میر تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی qenes کو متاثر کرتا ہے رزق حرام سے ایک خاص قسم کی mentation ہوتی جو خطرناک ادویات شراب اور radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے رزق حرام سے جو qenes تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں نسل انسانی سے۔ یہ جب نسل درنسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان qenes کے اندر ایسی ذہین پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کر لو رزق حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔ اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے۔ وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں......کیوں اب بتاؤ یہ بات مغرب کے علم سے مستعار لی ہے کہ مشرق سے؟

میں حیران پریشان ان کا منہ تکنے لگا۔

یاد رکھو ابھی مغرب والے یہاں تک نہیں پہنچے......جب ہم سور کا گوشت نہیں کھاتے تو وہ حیران ہوتے ہیں۔ جب ہم بکرے پر تکبیریں پڑھ کر اسے حلال کرتے ہیں تو وہ تعجب سے دیکھتے ہیں۔ جب ہم عورت سے زنا نہیں کرتے۔ نکاح پڑھ کر اسے اپنے لیے حلال بناتے ہیں تو وہ سمجھ نہیں سکتے......بھائی میرے کیسے سمجھیں حرام حلال کا تصور انسانی نہیں ہے اس لیے......اس میں بھید ہے گہرا بھید

qene mutation کا.....حرام حلال کی حد سب سے پہلے بہشت میں لگائی تھی اللہ نے۔

''آپ کی بات انوکھی تو ضرور ہے پروفیسر صاحب۔لیکن مجھے کچھ ان سائنٹفک لگتی ہے۔

لگے گی لگے گی لگتی رہے گی۔کیونکہ بات کرن والا ایک معمولی مشرقی آدمی ہے۔ تمہارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نیو کیمپس پر چلنے والا..... کہیں جو یہ نظریہ مغربی فلاسفر کے منہ سے سن پاتے تو فوراً قائل ہو جاتے..... مائی ڈیر سٹوڈنٹ..... حرام کیا ہے؟ وہ جس سے منع کیا گیا..... اچھے اور برے کا سوال نہیں ہے،صرف جو چیز منع فرمائی ہے اللہ نے وہ حرام ہے اسی لیے حرام و حلال کا جھگڑا سب سے پہلے جنت میں پیدا ہوا۔جب حضرت آدمؑ نے شجر ممنوعہ سے توڑ کر کھایا۔اچھے برے کا سوال نہیں تھا.....بس وہ جو منع تھا اپنے پر حلال کیا..... اس گندم کے دانے کا رزق حرام جس وقت ان کے جسم میں داخل ہوا.....ایک خطرناک تغیر آیا ان کے جسم میں ان کے genens میں..... اس تغیر سے اللہ نے انھیں ڈرایا تھا۔اس وقت تک حضرت آدم اور اماں حوا کے تمام خلیے صالح تھے۔ان کا نیوکلس محفوظ طریقے سے ٹوٹتا ہے لیکن اب اس نیوکلس میں چھپے ہوئے genes میں تبدیلی آئی genens mutat ہوئے لولے لنگڑے اندھے اور نا امید اور آنے والی نسلوں میں منتقل ہو گئے..... اسی لیے دیوانہ پن کے پہلے آثار ہابیل اور قابیل کے جھگڑے میں واضح ہوئے۔پہلا قتل ہوا حضت! دیوانگی خودکشی کی مشکل میں منتج ہوئی کہ قتل کی شکل میں اس سے کون انکار کر کستا ہے کہ دیوانگی کی شدید شکل انسان کش ہے..... جھگڑا ہابیل قابیل میں نہ ہوا تھا..... یہ ان کی وجہ تھی جو حضرت آدم کے وجود میں شجر ممنوعہ کے کھانے کی وجہ سے ٹوٹے پھوٹے تھے.....پھر چل سو چل ہوا.....ایک سے دوسری پود تک ہم یہی ورثہ دیتے آئے ہیں۔خود رزق حرام کھاتے ہیں اور آنے والی نسلوں کو پاگل پن کی

وراثت genes میں پیک کر کے عطا کرتے ہیں۔ بیٹا نہ سہی پوتا سہی، پوتا نہ سہی چند نسلوں آگے کوئی شریف النفس بچی سہی ...... اس تقدیر سے کوئی بچ نہیں سکتا جو genes میں لکھی جاتی ہے۔

''غالباً آپ بابا آدم کی مذہبی کہانی کو نئے طور پر interpret کر رہے ہیں''۔

''مائی فٹ ...... ڈاکٹر سہیل چلایا ...... مذہبی کہانی کی نئی توجیہہ ایک معمولی کام ہے میں ایک بہت بڑا انکشاف کر رہا ہوں ...... سیدھی سی بات ہے بھائی میاں جو کچھ ہم کھاتے پیتے ہیں اندر جا کر ہمارے لہو کی ساخت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

ہوتا ہے کہ نہیں ...... اندر بلڈ کیمسٹری چلتی ہے کہ نہیں؟''

''جی چلتی ہے۔''

''تو سمجھ لو بخوبی طور پر کہ جو رزق حلال ہم اندر ڈالتے ہیں۔ اس کا بلڈ کمسٹری پر مثبت اثر ہوتا ہے اور جو رزق حرام اندر داخل ہوتا ہے اس کا منفی اثر ہوتا ہے ہمارے لہو پر۔''

یعنی ایک بوری آٹا جو حرام کی کمائی سے آیا اور ایک بوری آٹا جو حلال کی کمائی سے آیا ...... ان کی بلڈ کمسٹری مختلف ہو گی؟ جانے دیجیے سر۔

''ضرور ...... یقیناً ...... انشاء اللہ ...... جو شخص حرام کی بوری سے کھائے گا۔ اس کے لہو کی کیمیائی حالت مختلف ہو گی اور اس لہو میں genes کی توڑ پھوڑ منفی ہو گی۔''

''جائیں سر ...... جانے دیں۔''

''مان جائیں بابا جی مان جائیں مغربی تعلیم کے پرستارو جی مان جائیں۔ اگر کبھی مغرب کے پاس حرام حلال کی تصور ہوتا تو وہ کبھی کے پاگل پن کی اصلی وجہ دریافت کر لیتے۔''

''جناب پروفیسر بقراط صاحب ...... آٹا ایک مادی چیز ہے اس کا جو کچھ بھی کیمیکل اثر ہو گا۔ دونوں حالتوں میں ایک سا ہو گا کیونکہ ان دونوں میں ایک خاص

مقدار تک کاربو ہائیڈریٹ اور پروٹینز وغیرہ ہوں گے۔

پانی مادہ ہے...... ہے کہ نہیں؟ لیکن دم کیے ہوئے پانی کی تاثیر بدل جاتی ہے جس پانی میں سے بجلی گزرتی ہے۔ اس کے ایٹن پھٹ جاتے ہیں کہ نہیں گدھے آدمی جس وقت آٹا رزق حرام سے خریدا جاتا ہے اس میں ایک منفی چارج جمع ہو جاتا ہے۔"

"چھوڑیئے سر بات آپ folvore کی کر رہے ہیں اور بنانا اسے سائنٹفک چاہتے ہیں"۔

"اچھا یہ بتاؤ دادا کا گناہ پوتے تک کیسے پہنچتا ہے...... مفلس کیسے سفر کرتی ہے انسانوں ڈمیں۔

"بیماریاں طے ہے کہ کچھ موروثی ہوتی ہیں۔

"اور دیوانہ پن۔؟"

"دیوانہ پن موروثی ہوسکتا ہے اور ماحولیاتی بھی لیکن موروثی کی وہ وجہ نہیں ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں۔

مانو گے مانو گے بچو! ابھی نہیں...... جس وقت کوئی سفید صاحب تمہارے گلے میں انگوٹھا دے گا تب!...... تب آپ کا باپ بھی مانے گا کہ رزق حرام ہی پاگل پن کی اکلوتی وجہ ہے۔

"میرا باپ بیوروکریٹ نہیں ہے سر...... شاید وہ آپ کی بات مان جائے"۔

سہیل نے میرے کندھے پر زور ڈال کر پوچھا...... کہاں ہے تمہارا باپ وہ میری بات ضرور سمجھے گا...... وہ جانتا ہو گا کہ اللہ علیم ہے...... اگر اس نے گوشت پر تکبیر پڑھنے کا حکم دیا ہے تو...... وجہ ہو گی ضرور کوئی۔ میں اسے بتاؤں گا کہ کیا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اگر تکبیر نہ پڑھی جائے تو...... ظالم سوچ تو سہی کی تکبیر پڑھے سے مرغی کا گوشت بدل جاتا ہے؟...... نہیں۔ ہرگز نہیں صرف حرام گوشت سے

genes پر منفی اثر پڑتا ہے۔ یہ ساری حکمت تھی......اور تم جیسے کو دن کو میں سمجھا رہا ہوں اور تم سمجھتے نہیں۔

اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور بولا/ مذہبی اعتقادات ہیں ہی سائنس بنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سور کا گوشت حرام ہے۔ اس پر سو تکبیریں پڑھ لو، یہ حرام ہی رہے گا، جو کھائے گا وہ اپنی genen mutation کا خود ذمہ دار ہو گا۔

''کیا اسی لیے عورت کو بھی حلال کر کے استعمال کرنے کا حکم ہے'......میں نے طنز سے سوال کیا،''

''زنا سے پیدا ہونے والے بچے کو تو gene mutation کا سو فی صد خطرہ ہوتا ہے زنا سے منع کیوں کیا اسی لیے ورنہ جسمانی تعلق کوئی بدل تھوڑی جاتا ہے شادی کرانے سے......یا نہ کرانے سے......جسمانی تعلق دونوں صورتوں میں وہی رہتا ہے۔

''پلیز آپ عورت کو بکرے کے گوشت سے نہ ملائیں، آج کل ویمن لبریشن چل رہی ہے کسی عورت نے سن لیا تو وہ آپ کو حلال کر دے گی...... بلکہ حرام کر دے گی۔''

وہ نہر کنارے خودرو گھاس پر بیٹھ گیا اور چپ ہو گیا، پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر بہتے پانی میں پھینکا، تھوڑے سے چھینٹے اڑے اور پانی روانی پر قائم ہو گیا اس قوت میرے جی میں آئی کہ میں اس سے سیمی کے متعلق پوچھوں۔وہ کس حد تک سیمی میں گوندھا گیا تھا؟

'یار سوچو تو بکرے کا گوشت مادی رزق کی شکل ہے ......عورت کا گوشت کو بھی کبھی روحانی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن ہے وہ بھی رزق ہی کی شکل......میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رزق چاہے مادی ہو یا روحانی genes کو متاثر ضرور کرتا ہے تم مانو نہ مانو یہ حرام و حلال کا بڑا ظالم چکر ہے......کبھی کبھی رزق حرام سے فرداً فرداً پاگل پن پیدا نہیں ہوتا......بلکہ قوم کی قوم دیوانی ہو جاتی ہے سوڈم اور گمورا کی طرح مائی

ڈیرسن عورت کے معاملے میں تو بہت احتیاط برتنی چاہیئے، اس کے پاس تو مشین موجود ہے..... ایسا بچہ جن دیتی ہے فٹافٹ زنا کے بعد..... اور آنے والی نسلوں میں بیج چھوڑ دیتی ہے دیوانگی کے۔

''اچھا سر میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا''

بھاگو..... بھاگو..... تم صاحبزادے کبھی حاضر نہیں ہو گے۔ ہم جیسے پروفیسروں کے پاس کبھی کوئی حاضر نہیں ہوتا..... تم لوگ ایسی لڑکیوں کے پاس وقت گزارنا چاہو گے جو تمہیں..... اچھا چھوڑو this is your age

''آپ بھی مجھ سے کچھ زیادہ بڑے نہیں ہیں سر اور پھر جب کبھی میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں آپ حوصلہ شکنی کر دیتے ہیں ڈ۔

اس نے اپنی کھوپڑی پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا..... یہاں..... بہت بڈھا ہو گیا ہوں قیوم..... دعا کرنا میری تھیوری کامیاب ہو جائے۔

''ہو گی جی انشاءاللہ ضرور ہو گی''

''اس نے لمبی سانس بھر کر کہا..... میں بڑا ہی چھوٹا آدمی ہوں مجھے پاکستان سے ایسی تعصب انگیز محبت ہے کہ میں کوئی بڑا کام کر نہیں سکتا، میں جب بھی سوچتا ہوں پاکستان کی terms میں سوچتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ یہ پدا سا ملک جغرافیے کے نقشوں میں کسی طرح بڑا ہو جائے۔ جب کبھی ہماری ہاکی ٹیم یا کرکٹ ٹیم کوئی میچ جیت جاتی ہے تو ایک foolish لڑکی کی طرح میرا تالیاں بجانے کو جی چاہتا ہے..... یار میرا جی چاہتا ہے کہ میری تھیوری کامیاب ہو۔ مغرب کے لوگ قائل ہوں کہ ایک پاکستانی مسلمان نے اتنا بڑا کام کیا۔

''انشاءاللہ سہیل صاحب ایسے ہی ہو گا۔''

Its very sily of me لیکن میں نے پاکستان سے زیادہ کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی..... سیمی شاہ سے بھی نہیں

میر آرزو کا بوم رنگ کیسی آسانی سے نشانے پر ہو کر میری طرف لوٹ آیا

''آپ کو یسی شاہ سے؟......کمال ہے سر جی۔''

''لیکن یہ محبت......اچھا میں پھر کبھی explain کروں گا۔ابھی مجھے اور بہت کچھ سوچنا ہے۔وہ بالکل چپ ہو گیا۔

آدھے گھنٹے بعد جب میں اٹھنے لگا تو سہیل بولا......یاد رکھو......ایک اور قسم کا بھی رزق ہوتا ہے حرام و حلال سے پرے......ایک بار اللہ میاں نے اپنی چہیتی قوم بنی اسرائیل کو بھی وہ رزق دیا تھا۔یہ رزق نہ حرام ہوتا نہ حلال اور......اس سے ایک آگاہی پیدا ہوتی ہے عرفان جنم لیتا ہے جو عام آدمی کے لیے دیوانے پن ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس دیوانے پن کو سمجھنے کی ضرورت نہیں نہ ہی اس کی سمجھ آسکتی۔کیونکر یہ صرف اسی رزق سے پیدا ہوتا ہے جو اوپر سے اترتا ہے جس سے genes لمحہ بھر میں صدیوں کا ارتقاء کر جاتے ہیں۔ان میں ایسا تغیر آتا ہے جو قرنوں کی صالحہ mutation سے پیدا ہو سکتا ہے تم دیکھتے نہیں اسرائیلیوں میں کتنے سو پر ذہن لوگ پیدا ہوتے ہیں۔یہ اسی من و سلویٰ کا اثر ہے اب تک اب تو آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔

گدھے آدمی......اگر انسان پالتو مرغیوں کو ایک خاص قسم کی فیڈ دے کر انڈے دینے والی مرغیاں بنا سکتا ہے......اگر شہد کی مکھی اپنے بچوں کو کھلا کر رانی مکھی بنا سکتی ہے تو اللہ میاں اتنے پر بھی قادر نہیں......کہ خاص رزق دے کہ عام انسانوں میں سے پیغمبر بنا سکے ولی ڈھال سکے،عرفان عنایت کر سکے۔چل اٹھ جا اب اور اپنے السر کے لیے کچھ کر تو اسی قابل ہے کہ تجھے ہر وقت anxity ہے اور تو گیس کا شکار ہو۔''

میں چپ چاپ اٹھ گیا ڈاکٹر سہیل اس قوت ایک اور شخص تھا میری اس سہیل سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔اس اجنبی کو نہر میں پتھر پھینکتے ہوئے چھوڑ کر میں گھر

آ گیا۔ میں نے اپنی الماری کھولی اوپر والی شیلف میں جوں کے توں عابدہ کے سفید سلیپر پڑے تھے۔ ان سلیپروں کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے ریڈیو سٹیشن کی ایک آرٹسٹ یاد آ گئی جس کے پاؤں بہت گورے تھے اور جو ہمیشہ ربڑ کے سفید سلیپر استعمال کرتی تھی

....

دن چڑھے

رزق حرام

سندھ طاس میں اس جگہ جہاں اب رانی کوٹ کا بے آباد قلعہ ہے۔ یہاں خشک تال تھے جن کے اردگرد چھدری ڈاڑھی کی طرح درختوں کا سلسلہ تھا جن میں جب سمندری ہوئیں چلتیں تو قدم آدم گھاس انو ران درختوں میں چھپے ہوئے پوکھروں کی خودروئیدگی آہستہ آہستہ ہلنے لگتی ہے اور خوشبودار ہو جاتی...... ہواؤں میں نمی اور تالابوں کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں گنے کا باسی رس کی خوشبو دار تھی سارے۔ میں نیند تعویذ دفن تھا مورفیا کی بھول بھلیاں تھیں۔ ایل ایس ڈی کے خواب تھے۔

اس بار چیل جاتی نے کانفرنس سے بہت پہلے جنگل کے تمام پرندوں کو اپنا ہم زبان بنا لیا۔ وہ بھاری اکثریت سے جیت جانے کی امید لے کر آئے تھے۔ کالی کلچڑی مہر لاٹ قازموے، جنگلی تیتر سب چیلوں کی ٹکڑیون میں گھسے بیٹھے تھے اور جانتے تھے کہ اس بار راجہ گدھ اور اس کے ہم مشربوں کو ضرور جنگل بدر کا کم مل جائے گا۔

راجہ گدھ کو اپنی وکالت کے لیے وکیل ڈھونڈ نے میں بڑی مشقت کرنا پڑی تھی۔ ریڑھ والے جانور اس باتوں کو دیوانہ پن سمجھتے۔ رینگنے والوں کے پاس پہنچا تو وہ اس کی بات نہ سمجھ سکے۔ تھک ہار کر اس نے گیدڑ کو اپنی پیروی پر رضامند کیا تھا۔ لیکن اتنے انتظار کے باوجود ابھی تک گیدڑ چوپال میں نہیں پہنچا تھا۔ اب تو راجہ

گدھ کے کٹھ میں بھی چہ میگوئیاں ہونیل گیں تھیں۔

جس وقت سیمرغ کی سواری آئی۔ سارے میں آندھی چلی..... لال آندھی جس میں چھوٹے چھوٹے کنکر سرخ مٹی اور سوکھے پتے تھے۔ پھر برڑ کے جٹادھاری درخت پر جیسے بجلی گری۔ تمام جنگل سفید ہو گیا اور پرندوں کی آنکھیں چندھیا گیئں۔ اس کے بعد سارے میں امن اور شانتی پھیل گئی۔

سیمرغ نے تین بار اپنے تن کی فاسفورس جیسی بتی بجھائی اور سوال کیا..... کیا ملزم حاضر ہے۔"

"حاضر ہیں۔ آقا..... اور حکم کے منتظر ہیں۔" راجہ گدھ نے کہا۔

"تجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہو تو کہہ؟"

راجہ گدھ نے لجاجت سے نظریں جھکا کر کہا..... گیدڑ میرا وکیل ہے آقا..... وہی کچھ میری ترجمانی کر سکتا ہے۔"

سارے جنگل میں خاموشی چھا گئی۔ اور جنگل پار سے سانپوں کے پھنکارنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

"پھر نکال اپنے وکیل کو..... کہاں ہے وہ؟..... چیلوں کی ملکہ بولی۔

راجہ گدھ نے دور تک نظر دوڑائی اور لجاجت سے بولا..... آقا ہمیں کچھ مہلت دے تاکہ ہمارا وکیل پہنچ جائے اور ہماری بے بسی پر روشنی ڈال سکے۔ اگر قصور ہمارا نکلا تو یقین رکھ ہمیں رحم کی ضرورت نہ ہو گی۔ ہم خود جنگل چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اللہ کی مخلوق کے لیے یہ کرہ ارض تنگ نہیں ہے۔ ہمیں کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی۔"

چیلوں کو معلوم تھا کہ وہ عوام کو رام کر چکے ہیں اور گدھوں کی پشت پناہی کے لیے کوئی بھی تیار نہیں۔ حتٰی کہ مینا بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ ایک چیل نے تنک کر کہا..... " اے راجہ گدھ ہم اس وقت تک تیرا انتظار نہیں کر سکتے۔ جب تک

دوسری بار بنی نوع انسان تہذیب یافتہ ہو کر دوبارہ ایسے بم بنائے جو ایک ہی سانس میں میلوں تک بستیاں کھا جائیں نکالنا ہے تو اب حاضر کر اپنے وکیل کو۔"

اس وقت حبشہ کے دیس کی ایک بوڑھی گدھ بولی...... "سیمرغ! ہمرے وکیل پر جانوروں کا بہت دباؤ ہے جانور اس معاملے سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کو خوف ہے کہ اگر جنگل بدر کی رسم پرندوں میں رواج پا گئی...... تو رفتہ رفتہ جانور بھی کوئی نہ کوئی الزام لگا کر جلا وطن کا طریقہ رائج کر دیں۔ وہ گیدڑ کو روک رہے ہیں...... پرندوں نے معاملے میں دلچسپی نہ لے لیکن ہمارا وکیل ارادے کا پکا ہے ......آتا ہی ہو گا۔"

اس وقت سرخاب نے پر جھاڑے تو توقیر سے بولا...... عالی جناب کچھ پرندوں کا خیال ہے کہ جنگل بدر کی سزا مناسب نہیں...... جو جنگل کے لیے پیدا ہوئے ہیں انہیں یہیں رہنا چاہیے جو پانی کے باسی ہیں ان کے لیے پانی افضل مقام ہے۔ اگر ہم اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں دست درازی کریں گے تو وہ کسی نہ کسی عذاب کی شکل میں ہمیں سزا ضرور دے گا اور ہماری کئی ذاتیں ایسے معدودم ہو جائیں گی جیسے پرانے زمانے کے پہاڑ پیکر جانور......"

چیلوں کی ملکہ طمطراق سے سارے میں گھومی اور چلا کر کہنے لگے...... ان پرندوں کی نشاندہی کی جائے جو اس طرح سوچتے ہیں۔ ہم ان سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

سرکاری وکیل نے جز بز ہو کر کہا...... افسوس ان کمزور پرندوں کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ رازداری میں بتائی گئی بات کو افشا کرنا میرا منصب نہیں۔"

اس بات پر چیلوں کی ٹکڑی میں پر پھڑ کانے کی صدائیں بلند ہوئیں اور بھانت بھانت کی چہکار سے خشک تال گونج اٹھا تھوڑی دیر بعد سرخاب نے مجمع کو کنٹرول کر کے کہا...... "اور کچھ پرندوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جونہی گدھ جنگل سے باہر نکلے یہ

شہروں میں رہیں گے پھر انسان کو بھی ویسے ہی استعمال کرے گا جیسے صدیوں سے وہ گدھے گھوڑے بیل اور دودھ دینے والے جانوروں کو زیر استعمال لاتا رہا ہے...... آہستہ آہستہ انسان تک ہمارے وہ تمام راز پہنچ جائیں گے جو آج تک محفوظ ہیں وہ ضرور پرندوں کی بولی سیکھ لے گا۔"

تیتر نیا کا کسبر میکاؤ اٹھا اور مودب لہجے میں بولا...... "جنگل والے خوانخواہ انسان سے خائف ہیں ہم ابنوسی انسانوں میں رہتے ہیں وہ بڑی شرافت سے ہمارے ساتھ گزربسر کرتے ہیں آقا کرگس جاتی اگر شہروں کو جاتی ہے تو جانے دے ہمیں فکر نہیں کرنا شایئے کیونکہ اول و آخر انسان ہی اللہ کا خلیفہ ہے اور ہم سے زیادہ جانتا ہے۔"

سیمرغ نے تین بار فاسفورس کی بتی بند کی اور گویا ہوا...... "تو ٹھیک کہتا ہے میں جانتا ہوں صرف انسان ساکن ہے کائنات کی باقی تمام اشیاء متحرک ہیں کیونکہ انسان مطلوب ہے اور باقی ہر شے طالب...... افسوس انسان نے اپنے آپ کو مطلوب کی جگہ سے ہٹا کر طالب بنالیا ہے اسی لیے گردش میں ہے ورنہ وہ اس قدر دیوانے پن کا شکار نہ ہوتا اور اب تک اللہ کی رضا کو پالیتا۔"

اس وقت چیل جاتی کے ایک حواری سارس نے کہا...... "آقا! انسان طالب ہو یا مطلوب...... متحرک ہو کہ ساکن...... فرزانہ ہو کہ دیوانہ...... نجات کو پہنچنے والا ہو کہ تباہی سے ہمکنار ہونے والا...... ہم کو انسان سے غرض!...... انسان کے گرد گھوم کر ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

سیمرغ نے قہقہہ لگایا ناریل کے درخت اس قہقہے سے لرزنے لگے۔

"سنو اس احمق کی بات سنو...... بیوقوف اس کائنات کے جو بھی فیصلے ہوتے ہیں وہ جو بھی فیصلے ہوں گے کسی نہ کسی طرح آخر میں انسان ان سے متاثر ہوتا ہے یا انہیں متاثر کرتا ہے۔"

اس وقت گیدڑ تال میں ایسے اترا جیسے شیر سرکس کے پنجرے میں حاضر ہوتا ہے۔

سارے میں سناٹا چھا گیا گیدڑ نے اپنی گھپے دار دم کے ساتھ تین بار کورنش ادا کیا اور پھر بڑے کے درخت کی طرف چہرہ کر کے گویا ہوا...... "اے پرندوں کے بادشاہ! میں صورت حال سے اچھی طرح واقف نہیں کہ کچھ مجھ تک پہنچا وہ ملزم کی زبانی تھا اس تک طرفہ بیان پر اکتفا نہیں کر سکتا اگر واضح اور مختصر الفاظ میں مجھ تک راجہ گدھ اور ان کی برادری کا قصور بیان کر دیا جائے تو میں دفع الزام کی کوشش کروں۔"

چیل ملکہ نے جلال میں آ کر کچھ کہنے کو زبان کھولی لیکن سرخاب نے اسے روکا اور بیان کیا۔

"سن گیدڑ...... اس روئے زمین پر چرند پرند حیون انسان سب خیر و برکت سے رہتے تھے۔ صرف انسان فتنے سے خالی نہیں اس نے اپنی عقل سے اپنے آپ کو متمدن کیا اور پھر اسی عقل کا سہارا لے کر ایسے ہتھیار ایجاد کیے جس سے بستیاں اجاڑ، مرگنذار تباہ اور اللہ کی زمین پر فساد پھیلا...... چیلوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انسان دیوانہ ہے اور اس کی دیوانگی کا یہ اقتضا ہے کہ وہ اپنی ہی نسل کو نیست و نابود کر کے......"

"سانپ کی طرح کہ خود ہی کھا جائے" چیل ملکہ بولی۔

"چیلوں کو ڈر ہے کہ گدھ پر بھی دیوانگی کے دورے پڑنے لگے ہیں وہ نہ ہو کہ یہ بھی جنگل کے باسیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے...... اسی لیے چیل ملکہ دعویٰ دار ہے کہ راجہ گدھ اور اس کی برادری کو جنگل بدر کا حکم سنایا جائے۔"

گیدڑ نے پنجے سے اپنی ناک کھجلائی اور تحمل سے بولا...... "کیا تو وضاحت کر سکتا ہے کہ دیوانگی کیا چیز ہے؟"

سرخاب نے مدد طلب نظروں سے ملکہ چیل کی طرف دیکھا

ملکہ چیل بولی...... "ہاں دیوانگی کی کچھ علامتیں ہیں جو ذی روح اپنے آپ کو یا

اپنے ہم جنسوں کو خود ختم کرنے کی کوشش کرے وہ دیوانہ ہوتا ہے۔"

گیدڑ نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہا...... "تو کیا گدھ خودکشی کا یا پھر قتل کا مرتکب ہوا؟"

جیل جاتی میں تھوڑا سا خوف پھیل گیا۔

"ابھی نہیں ابھی آغاز ہے...... ابھی گدھ دیوانگی کے انجام کو نہیں پہنچا ابھی چاند راتوں میں پچھلے پہر یہ تالوں میں آوارہ پھرتا ہے ایسی آوازیں حلق سے نکالتا ہے جیسے تپتے ہوئے لوہے پر پانی کے چھینٹے...... یہ دیوانگی کا آغاز ہے فاضل جج دیکھے گا کہ بہت جلد راجہ گدھ اس انتہا کو پہنچنے والا ہے یہاں پہنچ کر آج کے انسان نے اپنے ہم جنسوں کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے...... پھر کوئی طاقت اسے جنگل کے جانوروں کو ختم کرنے سے نہیں روک سکے گی۔"

"کیا یہ گدھ ہمیشہ سے دیوانہ تھا؟"

"نہیں...... پہلے یہ ایسے نہیں رہتا تھا جیسے اب رہتا ہے اس کی اڑانیں بھی تھکا دینے والی تھیں اور یہ بھی رزق حلال کھاتا تھا لیکن اس نے کہیں چوری چوری رزق حرام کا تصور انسان سے سیکھا...... انسان حیلہ جوئی اور مکر سے کماتا ہے بھائی کا حق غصب کرتا ہے اپنوں کی دشمنی میں غیروں سے مل کر کماتا ہے صلۂ رحمی کا کیال نہیں کرتا ہر آنے والے مال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا بانٹ کر نہیں کھاتا بلکہ چھین کر کھاتا ہے جو کھا نہیں سکتا اسے کتے کی طرح چھپا کر رکھ چھوڑتا ہے حرام روزی کے انسان کو اتنے گر آتے ہیں جتنے گھونسلے بنانے کے طریقے ہمیں یاد ہیں...... انسان پہلے رزق حرام سے واقف نہ تھا نہ ہی راجہ گدھ کو اس کا علم تھا۔"

بھوری لم ڈوری جو طبعاً غبی تھی چلائی...... "بتا بتا کیسے کیسے واقف ہوا۔"

سرخاب اٹھا اور خطیب کی طرح گویا ہوا...... "صاحبو! رزق حلال کا مسئلہ اولا جنت میں طے ہو چکا ہے پہلے بابا آدم اور اماں حوا حنظ داماں سے جنت میں رہتے

تھے اور بموجب حکم الٰہی بہشتی لباس پہنتے تھے اس وقت ان پر بہشت کا ہر میوہ جنت کا ہر پرندہ ہر جانور حلال تھا لیکن وہ حرام کھانے کے مرتکب ہوئے حرام کیا ہے؟ وہ جس سے منع کر دیا جائے حضرت آدم نے وہ گندم کا دانہ کھایا جس کی ممانعت کی گئی تھی پہلی بار ان کے جسم میں منفی لہریں داخل ہوئیں اب تک ان کی سرشت صرف نیکی کی طرف راغب تھی اب اس میں تضاد شامل ہوا۔''

''اس بات سے تیرا کیا مطلب ہے سرخاب وضاحت کر......'' چنڈول بولے۔

''بات صرف اتنی ہے...... کہ جو کوئی رزق حرام کھاتا ہے وہ یا تو خود دیوانہ ہو جاتا ہے یا اس کی آنے والی نسلیں بعد کو دیوانی ہو کر رہتی ہیں۔ اب چیل جاتی بہت خوش ہوئی اور چلائی...... جنگل بدر جنگل بدر...... جس طرح حضرت آدم جنگل بدر ہوئے۔ ویسے ہی...... وہی سزا...... جنگل بدر جنگل بدر۔''

''بول...... کیا تو دیوانہ ہے......؟......'' راجہ گدھ سے سیمرغ نے سوال کیا۔

''ہاں آقا...... کبھی کبھی چاندراتوں میں جب میں اونچے چھتنارے درختوں پر بیٹھا ہوتا ہوں۔ خود بخود میرا جسم گر پڑتا ہے اور میری حالت طرح اپنے بس میں نہیں ہوتی...... میں ایسی راہوں میں ج نکلتا ہوں۔ جن کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔''

'' کیا رزق حرام کھانے کا مرتکب ہوا......'' سیمرغ نے سوال کیا۔

'' ہاں آقا!...... میں حرام رزق کھانے کا مرتکب ہوا...... میں اپنا شکار خود نہیں کرتا لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ میں دیوانگی اس رزق حرام کھانے کی وجہ سے پیدا ہوئی کہ...... دیوانگی نے مجھے رزق حرام کھانے پر مجبور کیا۔''

گیدڑ نے اپنی دم کو پٹک کر کہا...... '' آقا یہ بات خلاف قانون ہے میں یہاں گدھ کی وکالت کو موجود ہوں' جب تک مجھ سے طے نہ کی جائے۔ راجہ گدھ سے باز پرس نہیں ہو سکتی۔''

سرخاب نے حالات کو ہاتھ میں لے کر کہا...... '' کیا کوئی وضاحت کرنا چاہے گا

کہ راجہ گدھ نے انسان سے رزق حرام کھانا کیونکر سیکھا؟"

مینا نے اٹھ کر بات شروع کی...... "جب حضرت آدم نے توبہ کی اور ان کے رب نے توبہ قبول کی تو پھر دنیا میں حضرت آدم کے لیے تمام پاک اور طیب چیزوں کو مہیا کیا گیا۔ لیکن وہ رزق حرام جو وہ بہشت میں کھا چکے تھے۔ اس کے اثرات ان کی نسلوں میں آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہی رزق حرام کھانے کی سزا مقرر ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ تو حضرت آدم کے لہو میں چھپی ہوئی دیوانگی باہر نکلی...... یہ ضروری ہے آقا رزق حرام کا اثر پشت ہا پشت جاتا ہے۔ جس وقت کوے نے قابیل کو لاش ٹھکانے لگانے کے گر سمجھائے۔ تو انسان نے اپنی فہم و فراست سے جانا کہ پرندے بیوقوف ہیں اور راز اگلنے میں ثانی نہیں رکھتے۔ اس وقت انسان نے طے کیا کہ وہ نباتات جمادات چرند پرند حیوانات سب کو اپنے تابع کر کے رہے گا۔ آقا...... گدھ نے انسان سے رزق حرام کھانے کا سبق سیکھا...... یہ لمبی داستان ہے آقا بہت لمبی...... لیکن اتنی بات طے ہے کہ جو کچھ بھی دیوانگی اس وقت گدھ میں مقسوم ہے۔ یہ سبق اس نے صرف انسان سے سیکھا ہے۔"

گیدڑ نے سرے پنڈال میں تین چکر لگائے اور پھر سر جھکا کر بولا...... اتنی بات طے ہے آقا کہ گدھ نے دیوانگی کا الزام قبول کر لیا ہے؟ ...... کیا میں ٹھیک سمجھا ہوں۔"

"ٹھیک ٹھیک ٹھیک...... "تراقی سے آوازیں آئیں۔

"اس دیوانگی کی وجہ رزق حرام ہے جو گدھ کھاتا ہے...... وہ عرصے سے مردار پر پل رہا ہے اور اپنا شکار خود نہیں کرتا...... اسی رزق حرام نے اس کے لہو میں فساد کی وہ شکل پیدا کر دی ہے جسے پاگل پن کہتے ہیں...... کیا میں ٹھیک سمجھا ہوں۔"

"ٹھیک ٹھیک ٹھیک...... بلند درختوں سے آواز آئی۔

"اور چیل جاتی کا خیال ہے وہ جو کوئی بھی حرام رزق کھاتا ہے اگر خود دیوانہ نہیں

ہوتا تو اس کی آنے والی نسلیں اس سے ضرور متاثر ہوتی ہیں۔ اس کے لہو میں ساخت کچھ اس طور پر بدلتی ہے کہ بالآخر دیوانہ پن اسی رزق حرام کی وجہ سے اس کی پشتوں میں ظاہر ہونے لگتا ہے...... کیا میں ٹھیک سمجھا؟"

"سوچ لو عادلو! عاقلو! الزام درست ہے لیکن بات قابل غور ہے...... کیا یہ مسئلہ سرشت کا نہیں؟...... کیا کوئی پرندہ...... کیا کوئی جانور اپنی مرضی سے رزق حرام کھا سکتا ہے؟...... غور طلب بات صرف اتنی ہے کہ کیا گدھ جاتی کی سرشت میں حرام کھانے کی ترغیب پہلے سے موجود تھی کہ اب پیدا ہوئی...... عقل کے استعمال سے اس نے حرام کھایا۔

سوچ لو صاحبو! سرشت کی مطابقت گناہ نہیں...... آپ سب کو سوچنا پڑے گا کہ کیا گدھ جاتی اپنی مرضی سے رزق حرام پر راغب ہوئی کہ...... کہ یہ اس کی سرشت کا مسئلہ تھا...... کہیں ہم اس کے رب اور اس کے درمیان دخل در معقولات کرنے والوں میں سے نہ ٹھہریں...... سرشت کا معاملہ بیڈھب ہے۔"

تمام پرندے اللہ کی دی ہوئی سرشت کے سہارے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اپنی جبلت سے پرے ان کی زندگی اندھیر تھی...... وہ ہولے ہولے ٹکڑیوں میں اڑنے لگے...... سارے میں یہ بات پھیل گیء یکہ پرندے اپنی عقل سے اللہ کی دی ہوئی سرشت سے بغاوت کر رہے ہیں!...... سانپ دیر تک جنگل میں رینگ رینگ کر یہ خبر سب کو سناتے رہے۔

....

عابدہ کے چلے جانے کے بعد میرے پاس اپنی نوکری کے علاوہ اور کوئی ایسا سہارا نہ تھا جسے میں لاٹھی بنا سکتا...... کھوکھلی روح اور خالی جسم سے ناطہ بنانے میں میرا سارا وجود غار کی طرح ہوگا...... بھابھی صولن ان کے دونوں بیٹے اور بھائی مختار مجھ سے اتنے دور تھے۔ جیسے سکرین پر چلنے والی فلم اپنے تماشائیوں سے دور ہوتی ہے۔ یہ

وہ وقت تھا جب میں تمام تر قوت کے ساتھ اپنے آپ کو کسی ایک خاص مشن کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔

میرے السر کی تکلیف پہلے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ رات کے پچھلے پہر معدے میں جلن ہونے لگتی تو میں اٹھ کر شہ نشین پر چلا جاتا اور ٹہلنے لگتا۔لیکن اب میں ڈاکٹر فیضی کے مشورے کے مطابق اپنی زندگی کو مثبت طریق سے گزارنے کا آرزو مند تھا......دودھ، دہی سے پر اور جذباتی شعلہ سامانی سے تہی زندگی۔

یہ بھی پروفیسر سہیل کا مشورہ تھا۔

اچانک ایک دن پھر وہ مجھے ریڈیو سٹیشن پر مل گیا۔ایسے ہی ایک دن مجھے سیمی بھی اس کے ساتھ ملی تھی......وہ سٹوڈیو میں سے کسی پروگرام میں شرکت کے بعد باہر نکل رہا تھا۔ہم دونوں چپ چاپ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔اس نے مجھ سے کسی قسم کے سوال جواب کیے بغیر اپنی چمکدار مسکراہٹ پیش کر دی اور میں اسے اپنے دفتر میں لے گیا۔

''یہاں کیا کرتے ہو؟ ......مائی ڈیر سٹوڈنٹ۔''

''ملازم ہوں سر۔''

میں نے چائے کے لیے چپراسی سے کہا اور وہ میرے سامنے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

''السر کا کیا حال ہے......ٹھیک ہو گیا ہے ابھی تک anxiety کے شکار ہو؟''

ویسا ہی ہے۔''

تھوڑی دیر تک وہ چپ رہا۔

''میرا خیال ہے تم نے ٹھیک طور پر یوگا کیا نہیں ورنہ افاقہ ہوتا۔''

''میں......کوئی سمت نہیں مقرر کر سکا ابھی۔''

'' مین آج کل ٹی ایم کرتا ہوں۔ اس سے بہت آرام ملتا ہے

meditation سے سکون ملتا ہے۔"

"میں اندر سے اس قدر پراگندہ ہوں کہ conceutrate نہیں کر سکتا سر۔ دراصل مجھےخود معلوم نہیں کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں کس لیے پریشان ہوں...... میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں کہ کسی وقت غبار اترے تو میں اصلی پریشانی کو برہنہ دیکھوں۔"

وہ مسکراتا رہا...... پھر بڑی دیر بعد بولا......"دیکھو اگر کوئی آدمی زیادہ دیر بے سمت ہو کر پریشان رہے تو وہ دائمی پریشان ہو جاتا ہے۔ اگر غم دکھ اور ہیجان کی ایک نقلی سی وجہ بھی ہو۔ تو وہ اس پر قابو پالیتا ہے۔ تم کو پتہ ہونا چاہتے کہ آخر اس پراگندگی اس anxiety اس تذبذب کی اصلی بنیادی وجہ کیا ہے؟...... اگر معلوم نہیں تو ایجاد کر لو آرام میں رہو گے۔"

"سوچتا ہوں سوچتا رہتا ہوں...... بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔لیکن ایک اکیلی وجہ نہیں ہو سکتی......"

"میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں فری...... بغیر چارج کیے......" سہیل نے مسکرا کر کہا۔

ضرور دیں...... سر سو مشورے دیں"

تم کو اپنے آپ کو کوئی سمت دینی ہوگی...... کوئی مشن اپنانا پڑے گا۔ کوئی goal کوئی منزل...... ورنہ تم خالی بجرے کی طرح سمندری لہروں میں بھٹکو گے...... کبھی بحر قلزم میں کبھی بحیرہ عرب میں۔"

"میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں کوئی مشن اپنا نہیں سکتا...... نو تھینک یو۔"

وہ بڑی دیر تک میرا چہرہ دیکھتا رہا۔

"اپنے اردگرد دیکھو...... جو لوگ زندگی میں کوئی مشن بنا لیتے ہیں۔ چاہے چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو۔ وہ السر کا شکار نہیں ہوتے...... پیغمبروں کی زندگی غور سے دیکھو۔ وہ بڑی سے بڑی ذاتی قربانی دے کر بھی السر کا شکار نہیں ہوئے

......کوئی ٹریجڈی انہیں ہلا نہیں سکتی ...... بے نام جستجو ...... بے مصرف تلاش ......
زندگی میں ایک مشن ہو...... چاہے بالکل چھوٹا مثلاً بہتر کینو کا باغ لگانا...... پاکستان
کے لیے نئی قسم کی گندم بونا...... پلاسٹک کی ڈوری سے قالین بننا...... کسی بچے کو
سی ایس پی کرنا۔"

"ہاں ہے"

کیا...... ہے سر؟"

"میں اب انیسویں گریڈ کے لیے کوشش کر رہا ہوں...... پھر میں پروفیسر ہونے
کی کوشش کروں گا...... میں پاکستانی طلبا کو تعلیم دینے کا مشن لے کر تمہارے کالج
میں آیا تھا...... لیکن رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ وہ مشن میرے بس کا نہیں۔ اسی لیے میں
نے اپنی تبدیلی نیو کیمپس میں کرا لی۔ تعلیم جب سے عام ہوئی ہے لوگ تعلیم کی
تلاش میں نہیں رہے اس لیے میں نے اپنا مشن بدل لیا ہے...... میں اب فقط اپنی
زندگی بنانا چاہتا ہوں۔"

میری نظر میں کوثر آ کھڑی ہوئی جس نے مجھے اس کے متعلق پہلے یہ خبر دی تھی

......

"کیا تمہیں غریبوں سے ہمدردی ہے کبھی تم کسی بوڑھے چھابڑی والے کو دیکھ کر
اداس ہوئے ہو...... پرانے چیتھڑے جمع کرتی عورت کو دیکھ کر تمہارا دل پگھلا ہے
......ہے؟ سہیل نے سوال کیا۔

میں نے غریبی کے متعلق کبھی سنجیدگی سے سوچا نہیں۔ حالانکہ میں خود قلندر کی
زندگی بسر کرتا ہوں۔" میں نے لجاجت سے جواب دیا۔

'پھر تو مشکل ہے میں تمہیں کمیونزم پر کچھ کتابیں دینے والا تھا۔ لیکن وہ بھی ویگا
کی طرح تمہارے کام نہ آ سکیں گی۔"

"پھر؟"

تمہیں فنون لطیفہ سے دل چسپی ہے؟ ...... مصوری' شاعری' ناول نگاری وغیرہ ...... اگر تم چاہو تو تمہارا aggresuion تمہاری anxiety کسی cration میں ڈھل سکتی ہے۔"

"میں شاید...... پیدائشی آرٹسٹ نہیں ہوں...... سر۔"

"جبلی طور پر آرٹسٹ ہونا ضروری نہیں آرٹ کو مشن کے طور پر ...... ردی کی ٹوکری کے طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔"

"شاید میں اس کا اہل نہ ہوسکوں۔" میں نے معذوری ظاہر کی۔

"میرا خیال تھا کہ تم ...... تم کو غریبی کی طرف توجہ دینی چاہیے اس کا reapeبہت بڑا ہے ساری تھرڈ ورلڈ اس سے متاثر ہے۔ پڑھنے کے لیے ہمدردی کرنے کے لیے اپنے آپ کو جذب رکھنے کے لیے اس سے بڑا اور کوئی مشن نہیں ہو سکتا۔ کمبوڈیا سے چلتے آؤ ...... پاکستان تلے ادھر پورا افریقہ پڑا ہے۔ روڈیشیا گھانا' نائیجیریا ...... چاہو تو ساؤتھ امریکہ کے مسائل میں بھی وقت گزار سکتے ہو۔"

"اس کا فائدہ؟۔"

بھائی میرے ...... بیمار ذہن کے مالک کسی کے فائدے کے لیے مشن نہیں ہوتا؟ ...... اس کا فائدہ ہمیشہ مشن والے کو ہوتا ہے ...... بڑے سے بڑا مشن ہو کائناتی قسم کا تو آدمی اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔ گھٹیا کوالٹی کا آدم سائز ہو تو اپنے آپ کو آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔"

میں بڑی دیر چپ رہا۔

"اچھا یہ دروازہ مقفل نکلا ...... اب یہ بتاؤ عشق کر سکتے ہو راہ مولا ...... لا حاصل قسم کا ...... بغیر حصول کی آرزو کے ...... وہ تمہارا سارا وجود' سارا تخیل ساری انا کو جذب کر لے گا۔"

"مجھ میں عشق کی اب تاب نہیں ہے شاید ...... سیمی کے بعد ......"

''مذہب سے کوئی دلچسپی ہو؟...... مذہبی لگن سے بھی اس دنیا میں ٹائم پاس کیا جا سکتا ہے۔''

''میری تربیت گاؤں کی ہے۔ دیہات میں مذہب بڑا سادہ ہوتا ہے۔ باقی زندگی کی طرح...... اس لیے میری معلومات کم ہیں۔''

''ہاں میں دیکھ چکا ہوں۔ اگر تم میں وہ جوہر ہوتا تو یوگا کرنے سے ضرور چمکتا ......بچوں سے دلچسپی ہے؟ چھوٹے بچوں کو دیکھ ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کو دل چاہتا ہے؟''

''بھائی کے دو جڑواں بچے ہیں۔ کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''پھر تو مشکل ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شادی کروا کے تم اپنی زندگی کے منہ زور گھوڑے پر کاٹھی ڈال سکتے ہو۔''

''میں نے کبھی سوچا نہیں سنجیدگی کے ساتھ شادی کے متعلق ...... سر میرا کیس بالکل بگڑا ہوا ہے۔''

اس نے پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا...... ''قیوم! میں نے کئی سال تمہاری طرح گزارے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ E.S.P پر کتابیں بڑھنے سے telepathy wypuosis اور dairvonce کے متعلق پڑھنے رہنے سے مجھے افاقہ ہوگا میں astral travel کے پیچھے لگا رہا۔ دھرم ایمان نروان کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن اب میری سمجھ میں ایک بات آ گئی ہے۔''

''کیا بات؟''

''پانچ کینڈل پاور کا بلب...... لاکھ امپیئر بڑھا دو ہمیشہ پانچ کینڈل پاور کی روشنی دیتا ہے۔ ہم لوگ چھوٹے چمچ میں دیگ بھر پانی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چمچ میں صرف چمچ بھر پانی آ سکتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا مشن بدل لیا ہے۔ میں اب صرف اپنی job کی مشکلات کے متعلق سوچتا ہوں۔ کون کون سی

سفارش چلے گی۔ کس کس level پر کیا کیا کوشش کرنی پڑے گی......' میں کسی ideal کے لیے معاشرے سے اپنے آپ سے لوگوں سے نہیں لڑتا۔''

'' آپ جھوٹ بولتے ہیں...... سر...... آپ تو اتنی بڑی بڑی تھیوریاں بناتے ہیں بہت سوچتے ہیں۔''

'' خدا قسم یہ سچ ہے۔ میں نے وہ سب سوچیں نکال دی ہیں سر سے۔ اب میں دلجمعی سے پرسوں امریکہ جاؤں گا۔''

'' امریکہ۔''

'' وہاں چھ مہینے لکچر دوں گا۔ امریکہ روحانی طور پر اس وقت بنجر ہے۔ پانی چاہتا ہے میں اپنی بالٹی لے جاؤں گا۔ ایسے چھینٹے اڑاؤں گا کہ بارش کا گمان ہو گا...... حرام و حلال کی تھیوری بیان کروں گا سب سے...... میرے لیے یہ بہت ہے۔''

'' کیا کرنے جا رہے ہیں۔ امریکہ۔؟''

'' سٹڈی ٹور کروں گا...... تفریح کے اوقات میں وہاں کے لوگوں کو یہ یقین دلاؤں گا کہ مشرق کے پاس روحانیت کے خزانے ہیں۔ ہم لوگ رتی بھر بھر مادہ پرست نہیں ہمیں اشیاء کی محبت نہیں۔ ہم ایک اور سمت کے لوگ ہیں۔ ان کے اندر احساس خلا اور احساس کمتری پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ واپسی پر گریڈ کا کوئی پرابلم نہیں ہو گا...... نو پرابلم......''

میں نے سر جھکا لیا۔

'' دیکھو مجھے چھ مہینے لگیں یا دو سال...... تم اس دوران صرف اپنی نوکری پر دھیان رکھنے کی کوشش کرنا...... میری واپسی کا انتظار کرنا اور اس دوران ادھر ادھر مت جھانکنا۔ ہر بات کو اپنی job کے ساتھ link کرنا...... اگر کسی طرح یہ مشن فیل ہو جائے تو پھر شادی کر لینا...... آرام سے زیادہ سوچے سمجھے بغیر لیکن شادی آخری solution ہے۔ کوشش یہ رکھنا کہ نوکری واحد خدا ہو...... تمہاری زندگی کا مرکز کبھی

کبھی اس مشن کی لت پڑ جائے تو آدمی دور نکل جاتا ہے اور بڑا بندھا رہتا ہے مرکز سے باہر نہیں نہیں نکل جاتا۔ میں نے سر اٹھا کر سہیل کی طرف دیکھا۔ پہل بار اس کی آنکھوں مین آنسو تھے۔ اور چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔ مسیحا تھری پیس سوٹ پہنے ہاتھ میں سگار لیے اپنے علاج کی بے بسی کے سامنے خود کھڑا رو رہا تھا۔

....

سہیل کے امریکہ چلے جانے کے بعد کافی حد تک اپنی نوکری کے بارے میں اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ پہلے میرا معمول تھا کہ اگر مجھے بھائی مختار کی موٹر سائیکل ادھار نہ ملتی تو میں ساندہ کلاں سے چل کر کرشن نگر کے اختتامی سٹاپ تک پیدل آتا۔ راستے میں ہرے بھرے کھیت تعفن بھرے پانیوں میں لہلہلا رہے ہوتے۔ کرشن نگر کے سٹاپ سے میں بس میں سوار ہوتا اور پلازہ کے چوک پر بس سے اتر جاتا۔ یہاں سے مجھے پھر پیدل ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہوتا اس لمبے سفر اور پڑاؤ کے چوک پر بس سے اتر جاتا۔ یہاں سے مجھے پیدل ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہوتا۔ اس لمبے سفر اور پڑاؤ کے لیے مجھے کافی وقت اور سوچین درکار ہوتی تھیں۔ بچپن جوانی اور لڑکپن کے چھوٹے چھوٹے واقعات ذہن پر ابھرتے رہتے۔ میری ہمیشہ آرزو ہوتی کہ کہیں کوئی واقف کار نہ مل جائے۔ جس کے ساتھ کی وجہ سے خیالات کا تانتا ٹوٹ جائے۔ ان ہی سفروں کے دوران میں چند راہیں گزارے ہوئے دن' ماں کی موت' ابا کی گمشدگی سیمی اور رعابدہ کی جدائی کا تجزیہ کرتا۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا پڑتا لگاتا......لیکن اس سارے تجزیے اور پوسٹ مارٹم سے نہ میں کبھی کسی اہم نتیجے پر پہنچ سکا اور نہ ہی کوئی فیصلہ کن سبق سیکھنے کی نوبت آئی۔ جس طرح خلائی ہوا باز ایک خاص لباس میں ہی سفر کر سکتا ہے۔ میں بھی شادوں کی ایک خاص رضائی اوڑھ کر یہ سفر کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے سہیل کے مشورے کے بعد جو پہلا مثبت کام میں نے کیا۔ وہ موٹر سائیکل کی خرید تھی۔

نئی موٹر سائیکل میں نے بھائی مختار سے پیسے ادھار لے کر خریدی تھی اور انہوں نے مجھ میں دینا داری کے آثار سر نکالتے دیکھے تو بخوشی ادھار دے دیا۔ موٹر سائیکل کی سواری میں یہ خوبی ہے کہ یہ برق رفتار گھوڑے کی طرح بڑی انا بخشتی ہے۔ اس قدر خطرے کے باوجود آدمی اپنے آپ کو کافی پائیدار سمجھنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل کے مشورے کے بعد نئی سائیکل' ریڈیو کی تازہ نوکری اور ریڈیو پر آنے جانے والی رنگ برنگ لڑکیوں کے باعث ایک بار پھر میں اپنے آپ کو کافی حد تک نارمل سمجھنے لگا۔ اب کنٹین سے چائے منگوا کر سکرپٹوں کو ہاتھ میں لے کر لڑکیوں سے باتیں کرتا۔ تو میرا رویہ برادرانہ کھردرا نہ اور لاتعلق نہ ہوتا۔ بلکہ اس میں انا کی خوشبو بسی ہوتی۔

گو میں اس جنس سے چونکیل جانور کی طرح خبردار ہو گیا تھا۔ کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر بتاتی رہتی تھی کہ یہ وہ لڑکیاں ہیں جن کے ہاتھوں میں کسی دوسرے سٹیشن کا ٹکٹ ہے' یہ میرے پلیٹ فارم پر رکیں گی۔ کوکا کولا پئیں گی اپنی پسند کا میگزین خریدیں گی اور پھر ہاتھ ہلاتی کسی اور شہر کے لیے کسی اور ٹرین میں سوار ہو جائیں گی۔ اس لیے ریڈیو سٹیشن پر جہاں آنسو گیس زیادہ پھیلی ہوتی ہے۔ میری آنکھیں بہت خشک تھیں اور میں بہت محتاط بھی رہتا تھا اور ملا جلا بھی......

ریڈیو سٹیشن کا محکمہ عام محکموں سے قدرے مختلف ہے۔ سرکاری دفتروں میں مرد عورتیں اس طرح مل کر کام نہیں کرتے۔ اور اگر کرتے بھی ہیں تو عام دفاتر کی طرح بیرونی طور پر ان میں بڑا رکھ رکھاؤ اور خشک دفتری پن موجود ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے کام کی نوعیت ریڈیو سے ملتی جلتی ہے لیکن یہاں پیٹی بورژوا اور انگریزی خواں طبقے کی حکمرانی کے باعث ماحول میں ایک خاص قسم کا تصنع اور خشکی ہوتی ہے۔ فلمی دنیا میں بھی عورت اور مرد بہت قریب رہتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی وہ فضا نہیں ملتی جو ریڈیو سٹیشنوں پر ہوتی ہے۔ کیونکہ فلمی کارکنوں میں وہ ہلکا سا حجاب' شعریت

فاصلوں کی کسک نہیں ہوتی جو آرٹ سے وابستگی کے باعث دونوں جنسوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

ریڈیو سٹیشن پر اگر عملہ دلی طور پر ادب پرست' موسیقی نواز' دلدادہ۔ ڈرامہ نہ بھی ہو۔ تو ریڈیو کی روایات ہی ایسی ہیں کہ اچھے شعروں پر سر دھننا' مناسب لے پر داد دینا' مکالمے کی چست ادائیگی پر قربان ہونا سب کا شیوہ ہے۔ یہاں پہنچ کر طوائف آرٹسٹ بن جاتی ہے۔ مراثی ضلع جگت کا بادشاہ نظر آتا ہے۔ یہاں فلمی دنیا والے ٹھٹھوں اور پھکڑ بازی نہیں ہوتی۔ ایک ہلکا سا غلاف تعریف و تحسین کا' ایک سطحی سی اخلاقی پابندی ایک غیر محسوسی آرٹ نوازی سب پر چھائی رہتی ہے' کاتب سے لے کر انجینئر تک...... چپراسی سے لے کر آر ڈی صاحب تک...... طبلہ نواز سے لیکر ساؤنڈ ریکارڈسٹ تک چھوٹی اناؤنسر سے لیکر تجربہ کار نیوز براڈ کاسٹر تک سب اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ ادب نواز موسیقی پرست اور ڈرامہ شناس ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے ریڈیو سٹیشن کی فضا ہمیشہ ملن رت سے مشابہہ رہتی ہے۔ یہاں بھی ضرورتیں چلتی ہیں۔ جھگڑے ہوتے ہیں explanstions طلب کی جاتی ہے۔ ادھار مانگے جاتے ہیں۔

فائلیں خراب ہوتی ہیں۔ چغلی میٹنگ جاری رہتی ہے۔ وہ سب کچھ چلتا ہے۔ جو دفتروں میں چائے کے ساتھ ساتھ چلا کرتا ہے...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو سٹیشن پر ایک موسم ہوتا ہے جو ملن رت سے مشابہہ ہے۔ ادب نوازی' موسیقی اور ڈرامے کی ہلکی پھوار...... جنس مخالف سے میل ملاقات کی رت۔

میں ریڈیو سٹیشن پر ایسے ہی موسم میں افتل کو ملا۔

....

افتل شکلاً و عقلاً ریڈیو سٹیشن کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ موسیقی کے پروگراموں سے گو میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن اس شکل جثے اور ہیئت کی عورتیں یہاں وہاں

ملتی رہتی تھیں۔ لیکن اس کی ذات کا مجھ پر منفی یا مثبت کبھی کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مختلف پروڈیوسروں کے کمرے میں بیٹھی پائی جاتی۔ رسمی باتوں کے علاوہ اس سے بات کرنے کی کوئی نوبت کبھی نہ آئی۔ ریڈیو پر ظاہر وہ بڑی مقبول تھی۔ ہر ایک ٹھٹھہ مذاق کرنا' خوش دلی سے دوسروں کے مذاق سہنا' وقت بے وقت سازندوں کی مالی مدد کرنا' باوردی چپراسیوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے گھر والوں کی خیریت پوچھنا۔ امیر آرٹسٹوں سے بلا تکلف لفٹ مانگ لینا' نوجوان لڑکیوں سے سکرپٹ مانگ کر پڑھنا اور اچھے جملوں پر داد دینا' موسیقی کے پروڈیوسروں کی بظاہر بے عزتی کرتے ہوئے درپردہ ان کی خوشامد کرنا اور باوجودیکہ اسے اب پروگرام ملنے بند ہو گئے تھے۔ باقاعدگی سے ہفتے میں دو بار ریڈیو سٹیشن آنا اسکا ٹائم ٹیبل تھا۔

اختل کی آواز ریگستانی عورتوں کی طرح گھگھی تھی۔ جوانی میں اس کی آواز میں شاید وہ جادو ہوگا جسے بیڈ روم سیکسی کہتے ہیں۔ لیکن اب تو کبھی کبھی جب وہ جوش میں بولتی تو اس کے جملے کے جملے غائب ہو جاتے اور آواز نہ نکلتی۔ کئی سالوں سے وہ چھوٹے شہروں میں لگنے والے تھیٹروں میں گا رہی تھی۔ ان میلوں میں کئی بار مائیکرو فون کے بغیر بھی آواز لگانا پڑتی تھی۔ اس لیے اس کی آواز سے نزاکت' شائستہ پن اور ملائمت غائب ہو چکی تھی۔

سب سے پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو وہ قاضی کے کمرے میں بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس نے فل میک اپ کر رکھا تھا۔ برقعے کا نچلا سیاہ کوٹ جسم پر تھا اور نقاب کرسی پر لٹک رہا تھا۔ اس نے کوئی تازہ لطیفہ سنایا تھا۔ جس کی وجہ سے کمرے میں بیٹھے ہوئے قاضی کے تین حواری ہنس رہے تھے۔

میں نے قاضی سے ایک مقبول ریکارڈ کی ڈسک مانگی تو اختل بولی...... ''بتایئے سر جی یہ آپ کے قاضی صاحب مجھے کوئی پروگرام کیوں نہیں دیتے۔''

''بی بی میں کلاسیکی موسیقی کا انچارج ہوں۔'' قاضی بولا۔

''تو پھر میں کوئی فوک سنگر ہوں۔ میں نے بھی آخر استاد جمے خاں سے تعلیم حاصل کی ہے''

''وہ تو ٹھیک ہے بی بی لیکن تمہاری آواز میں خراشیں پڑ گئی ہیں ۔لوگ ایسی آواز کو پسند نہیں کرتے اب۔''

'' میرا کیا قصور ہے سر جی آپ بتائیں۔ یہ پچھلے ریڈیو سٹیشن کی بات ہے۔ میں گانے کے لیے آئی تھی۔ پورے دس بجے رات کو مجھے مالکونس کا پروگرام کرنا تھا۔ میں بیٹھی تھی آر ڈی صاحب کے دفتر مین ......تب نگینہ آئی ...... نگینہ کو آپ جانتے ہیں سر جی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''میری مقبولیت سے بیر تھا اسے آتے ہی چمٹ گئی مجھ سے باجی باجی کہتے منہ سوکھتا تھا اس کا مجھے پان دیا۔

'' یہ بات اب پرانی ہو چکی ہے اصل ......بہتر ہے کہ اب اسے نہ سنایا کرو سب جانتے ہیں۔'' قاضی نے چڑ کر کہا۔

'' سب جانتے ہوں گے لیکن یہ تو نئے ہیں ریڈیو پر ......کیوں جی نئے ہیں ناں......آپ سر جی۔''

''ہاں۔''

''بوجی مجھے دیا ہے پان نگینہ نے گشتی کا پان میں نے کیا کھایا۔ آواز بیٹھ گئی۔ وہ تو اللہ سائیں نے مجھے عقل دی پان تھوک دیا میں نے ......کہیں جو سارا کھا جاتی تو گونگی ہو جاتی پوری۔''

'' دیکھو تم کہیں آیا گیری کر لو......اب تمہارے یہی دن ہیں'' قاضی نے ہنس کر کہا۔

'' کر تو لوں سر جی...... پر آج کل کے خانساموں کا بھی taste اچھا ہو گیا وہ اب

بیگموں پر نظر رکھتے ہیں۔ آپ کی طرح۔ مجھے نکلوا دیں گے کھڑے کھڑے......
سب قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

''کتنی عمر ہے تمہاری امتل؟...... قاضی نے سوال کیا۔

''اگلے سال بیالیس کی ہو جاؤں گی انشاءاللہ۔''

''کے سالوں سے بیالیس کی ہو رہی ہے......'' قاضی نے گستاخانہ پوچھا''

''میں لیپ ایئر میں پیدا ہوئی تھی جی کیا کروں چار سال بعد برتھ ڈے آتا ہے میرا۔'' بوڑھی اور نئی کونپل جیسی نئی تھی۔ عمر اس کے جسم سے جھڑتی رہتی اور اس کے بالوں پر چڑھتی چلی جاتی۔ کبھی وہ پانچ سال کے بچے کی طرح معصوم ہوتی۔ کبھی بوڑھی نائیکہ کی رطح تجربے کار خرانٹ بے حس بن جاتی۔ وہ ذہنی جسمانی روحانی کئی قسم کے مرضوں میں مبتلا تھی اور کئی قسم کی بیماریوں سے شفایاب ہو چیک تھ ی۔ زندگی میں اسے ان گنت ٹیکے لگ چکے تھے اور کئی بیماریوں سے شفایاب ہو چکی تھ۔ زندگی میں اسے ان گنت ٹیکے لگ چکے تھے۔ اور کئی بیماریون سے وہ اپنے تجربے کی بنا پر اب تندرست ہو چکی تھی۔ اس کا جسم سٹیتھک فائر کی طرح بے جان تھا اور اس کے سانس سے بی کومپلکس، انٹی بائیوٹک کوڈلور آئل اور ملٹی وٹامنز کی خوشبو آتی تھی۔ بیماریوں کی شفایابی کے باعث ہی لگتا تھا کہ وہ بیالیس سے کئی گناہ زیادہ سال اس کرہ ارض پر بسر کر چکی ہے۔ دراصل امتل صرف زندہ تھی۔ وہ زندگی پر کسی قسم کی تنقید نہیں تھی اسی سے مل کر مجھے پتہ چلا کہ اچھا یا برا کچھ نہیں ہوتا۔ بس واقعات ایک دوسرے کے نقش قدم پر ابھرتے رہتے ہین۔ جو اپنی ذات کو تکلیف دیں۔ وہ برے لگتے ہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی وہ برے نہیں ہوتے اور کچھ واقعات راحت پہنچاتے ہیں۔ اس لیے اچھے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی قابل تعریف نہیں ہوتے۔ اچھے یا برے کی کائناتی حیثیت کچھ نہیں۔ ہر انسان اپنی ذات کو مرکز مان کر اچھے اور برے کا گراف بناتا ہے۔ اسی لیے تمام واقعات بالآخر کائناتی صفر میں داخل ہو جاتے

ہیں۔اوراسی لیے ان سے باقی لوگ زیادہ دیر تک متاثر نہیں رہ سکتے۔

....

اس روز مجھے ڈرامہ جھنجھورر ریکارڈ کرنا تھا۔ میں نے کاسٹ کو دس بجے کا ٹائم دیا تھا۔جب میں ریڈیو سٹیشن پہنچا پورے گیارہ بجے تھے اور امتل barrier کے اس طرف کھڑی دربان سے فصیح زبان میں جھگڑ رہی تھی۔ چہرے کا سیاہ نقاب الٹا ہوا تھا۔ہاتھ میں ماچس اور سگریٹ کی ڈبیا تھی۔ چہرے پر فل میک اپ اور منہ میں پان موجود تھا۔

''اوے ککھ نہ رہے تیرا تو اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔جب سے میں ریڈیو سٹیشن پر چلی آرہی ہوں شمشاد بیگم کا نام سنا ہے امراضیا بیگم کا نام جانتا ہے توبہ بابا ان کے بعد کس کا نام چڑھا تھا۔امتل العزیز کا......نہیں جانتا مجھے اب بھی۔''

دربان بڑے مزے سے ٹین کی کرسی پر بیٹھا تھا اور شانتی سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا......''ہوگا جی آپ کا بڑا نام......لیکن آر ڈی صاحب کا حکم ہے......آپ اجازت نامہ دکھائیں سیکورٹی معاملہ ہے کوئی ہماشما اندر نہیں جاسکتا۔''

''الو میں پرانے ریڈیو سٹیشن سے یہاں آتی ہوں۔آر ڈی بدلتے رہتے ہیں حکومتیں آتی جاتی ہیں آرٹسٹ وہی رہتے ہیں ریڈیو کے حرام خور امتل وہی رہتی ہے۔''

''ہاں جی رہتی ہوگی......لیکن آپ اندر نہیں جاسکتیں۔''

اپنے آپ کو مجبور پا کر امتل نے دو تین بھاری جان دار گالیاں دیں اس وقت میں جلدی سے موٹر سائیکل پر گزر جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے مجھے پکڑ لیا۔

''اے قیوم صاحب' رکنا سر جی......اس سور کے تخم سے کہہ دیں میری ریکارڈنگ ہے اب گیارہ بجے رہے ہیں۔ابھی ریہرسل بھی کرنی ہے۔''

میں نے دربان سے سفارش کرنے کے لیے کہا...... یار ولایت علی پرانے

آرٹسٹوں کا خیال رکھا کرو۔"

"اب یہ کیا پتہ چلتا ہے سر جی کون نیا ہے اور کون پرانا؟ کچھ شکل پرانی ہوتی ہے لیکن وہ آرٹسٹ نئے ہوتے ہیں۔ کچھ کی شکل نئی لگتی ہے پر جی وہ آرٹسٹ پرانے ہوتے ہیں۔"

"اچھا اب تو ان کو جانے دے ناں۔"

"جائیں جائیں سر جی...... پر بات تمیز سے کیا کریں۔"

"بکی نہ جا اب شرمندہ ہو کر...... خصم نوں کھانا حرامی۔"

ان کا خیال رکھا کرو...... یہ آرٹسٹ لوگ جلالی طبیعت کے ہوتے ہیں۔"

"ہاں جی...... ان کی طبیعت کی وجہ سے یہ جہنم میں جائیں گے انشاءاللہ" ولایت علی نے جل کر کہا۔

"لے کچھ کھا پیا کر جان کو لگے......" اب برقعے کی جیب سے پانچ روپے نکال کر احتل نے دربان کو دے دیے۔ دونوں ہنسنے لگے اور احتل آگے چلی گئی۔

یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ احتل کو آئندہ کی کوئی فکر نہ تھی اس کے پاس وہ آخری پانچ روپے تھے جو اس نے دربان کو بلا وجہ دے دیے۔ دراصل وہ ہر کام کرنے کے بعد ہر حادثہ سہہ گزرنے کے بعد ہر قسم کے پچھتاوے سے آزاد تھی اس کی زندگی لمحہ تک چلتی تھی اسی لیے ماہ و سال مل کر اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکے۔ وہ وقت کے بھاری ہتھوڑے سے ہر لحظہ بے پروا تھی۔

بھنبھوڑ ڈرامہ ریکارڈ نہ ہو سکا۔ عین ریہرسل کے دوران ہیروئن کو کاسٹ میں سے کسی نے کوئی چبھتی بتا کہہ دی۔ ناہید بڑی نازک مزاج تھی افوراً اٹھی آر ڈی صاحب سے رپورٹ کی اور گھر چلی گئی۔ براڈ کاسٹ میں ابھی چھ دن باقی تھے لیکن بڑے دنوں کے بعد میرے السر میں درد شروع ہو گیا۔ ساؤنڈ لفافٹ کی ڈسک اور سکرپٹوں کی کاپیاں لے کر اپنے دفتر میں لوٹا چار بجے ہوئے تھے۔ احتل میرے

دفتر میں بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے برقعے کا اوپر والا حصہ کرسی کی پشت پر لٹک رہا تھا اور پلاسٹک کے بٹنوں والے کوٹ نما برقعے میں وہ پھنسی ہوئی تھی۔

''جی فرمائیے......'' میں نے سرد مہری سے پوچھا۔

''اب دیکھیے یہ وقت ہو گیا ہے بھوکے پیاسے اب ریکارڈنگ ختم ہوئی ...... ہے''۔

میں چپ رہا۔

''ان میوزک والوں کی عقل دیکھیں...... میں کورس والیوں کے ساتھ گا رہی تھی اور حمیدہ گا رہی تھی لیڈ پر...... آپ خود انصاف کریں اس کی اتنی آواز ہے کہ لیڈ گا سکے؟''

میں نے سکرپٹ درواز میں رکھے اور چڑ کر کہا...... اچھا گاتی ہے حمیدہ اور پھر ہر آرٹسٹ کا ایک ٹائم ہوتا ہے اس کے بعد لوگ اسے قبول نہیں کرتے۔''

اختل ناک سکوڑ کر بولی...... اچھا جی یہ تو ہم لوگ جانتے ہیں کہ وہ کیسا گاتی ہے ...... ایسی کم سری...... ایسی کم سری پنچم پر جا کر تو اس کا گلا پھٹ جاتا ہے ٹیں ہو جاتی ہے آواز۔''

''پبلک کو پسند ہے یہ ٹیں۔''

''سارا قصور ان ریڈیو والوں کا ہے...... جس کو پروگرام ملیں۔ وہ آپی مقبول ہوگا ...... ساری بات تو موقعہ ملنے کی ہے۔''

'' آخر اس میں کیا خوبی ہے کہ اس کو پروگرام ملتے ہیں؟ کبھی سوچا آپ نے۔ میں نے سوال کیا۔

ہاں ایک خوبی ہے اس میں۔''

'' کیا......''میں اکتاہٹ کے آخری سرے پر تھا۔

''جوان ہے نخرے آتے ہیں ادائیں دکھاتی ہے پروڈیوسروں کو الو بناتی ہے۔''

''پہلی اور آخری یہی عورت کی خوبی ہے۔''

یکدم اختل ڈھیلی پڑ گئی۔

''سر جی آپ آر ڈی صاحب سے میری سفارش کر دیں ناں...... میرے گھٹنوں میں درد رہنے لگا ہے اب تھیٹروں میں کام نہیں کر سکتی' خدا قسم کئی کئی گھنٹے کھڑے رہنا پڑتا ہے۔''

مجھے اس پر ہلکا سا ترس آ گیا۔

''کیا سفارش کروں۔''

''کم از کم چار بکنگ تو دے دیا کریں مہینے میں...... دیکھیں ناں نازیہ تو چھ چھ بار بک کر لیتے ہیں وہ۔ مجھ سے کون سے بہتر گاتی ہے۔''

''یہ بھی تمہارا خیال ہے اس کا وقت بھی منتیں کرتے نکلتا ہے۔''

''ہماری عمر ہی ترلے منتوں کی ہے سر جی...... پر یہ ریڈیو والے معاف کرنا بہت چندرے ہیں۔ عمر بڑی عورت کو ذرا گھاس نہیں ڈالتے...... سارے پروگرام لڑکیوں کو دیتے ہیں بوڑھی عورتوں کے رول بھی لڑکیوں سے کراتے ہیں۔''

''وقت وقت کی بات ہے اختل...... تم کو بھی گھاس ڈالا ہو گا جوانی میں...... ریڈیو والوں نے۔''

وہ چپ ہو گئی۔

ریڈیو سٹیشن پر تین قسم کی خواتین آرٹسٹوں سے ملاقات رہتی تھی ایک وہ گلوکار اور ڈرامہ وائس عورتیں اور لڑکیاں تھیں۔ جن پر رائے عامہ سے مقبولیت کی مہر لگ چکی تھی۔ جو اے کلاس میں شمار ہوتی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بھاگنا' چاپلوسی کرنا' پان سگریٹ آفر کرنا اپنے کمرے میں بلا کر ریڈیو کے باقی عملے پر تبصرہ کرنا' کچھ دوسرے آرٹسٹوں کی چغلی سے دل بہلانا۔ ہمارا شیوہ تھا۔ دوسری ان آرٹسٹ لڑکیوں کی تھی جو گانے یا ڈرامے کے پروگراموں کے لیے بسنت کے دن نیلا

آسمان بن کر آیا کرتی تھیں۔ ہر پروڈیوسر جانتا تھا' کہ ان لڑکیوں میں talent کی واضح کمی ہے اور یہ شاید کبھی بھی اچھی پرفورمنس نہ دے سکیں۔ لیکن ان سے چھیڑ چلی جانی چاہیے۔ یہ لڑکیاں گانے کا پروگرام ڈرامے کا پارٹ یا casual اناؤنسمنٹ کے لیے آتی تھیں۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ کنٹریکٹ پر سائن کرواتے وقت' برآمدوں میں' سٹوڈیو کے اندر' لفٹ کا انتظام کرواتے وقت کاروں کے دروازوں تک پہنچاتے ہوئے خوش دلی سے باتیں ہوتی تھیں اور ہم لوگ ہلکا پھلکا محسوس کرتے تھے۔

تیسری قسم سب سے قابل ترس تھی۔

اعتل نے لمبی سانس لی اور دکھ سے بولی...... ''یہ آپ کا قاضی بہت بے حیا آدمی ہے۔ دیکھا نہیں آپ نے کتنی لڑکیاں گھسی رہتی ہیں اس کے کمرے میں۔''

''قاضی اچھا آدمی ہے...... ہنس مکھ اور ملنسار۔''

''سو واری عشق کرے ان چھپکلیوں سے لیکن پروگرام تو ہمیں دے ناں آرٹسٹوں کو۔

''اگر وہ لڑکیوں کو پروگرام نہ دے تو کبھی وہ آ کر بیٹھیں اس کے پاس۔ پھر وہ عشق کن سے کرے۔''

''آپ بھی ایسے ہی ہیں سر جی؟''

''ہاں کچھ کچھ''

ہم دونوں ہنس دیے۔

ریڈیو سٹیشن پر بھائی چارے' بے تکلفی اور عجیب قسم کے بیچ کی فضا رہتی ہے۔ بوڑھے آرٹسٹوں کو کوئی آپ کہہ کر نہیں بلاتا۔ بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ اپنے سے چھوٹوں کی طرح بولنا' ہنسی مذاق ضلع جگت شیام گھات سب چلتا ہے۔ اسی لیے اس فضا میں کئی بار سالوں کا سفر لمحوں میں کٹ جاتا ہے۔ اعتل اور میں بھی اس ملاقات

میں بڑے قریب آ گئے۔

''کیا عمر ہے تیری امتل؟...... میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے پوچھا۔

''بتیس سال سر جی''

''یہ کم بخت سارے لوگ مجھے ابھی سے باجی کہنے لگے ہیں۔ کم بختوں کو شرم نہیں آتی ابھی میں سب کے سامنے بچوں کے پروگرام میں ترانے گایا کرتی تھی۔ کل کی بات ہے۔''

''لیکن پچھلے ریڈیو سٹیشن کی باتیں تو تمہیں خوب یاد ہیں'

''بس بچے کو سب کچھ یاد ہوتا ہے۔''

''لیکن قاضی کے کمرے میں تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری عمر بیالیس برس ہے۔''

''کیا کریں قاضی صاحب اسی بات سے خوش ہوتے ہیں سر جی۔ خدا قسم ہماری پروفیشن میں جسم ویسے ہی ڈھل جاتے ہیں۔ میری ماں پچاس کی ہے لیکن ستر کی لگتی ہے۔''

میں نے اسے زیادہ زچ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''ایک بات بتاؤں آپ کو؟''

''بتاؤ''

''آج میری کوئی ریکارڈنگ نہیں تھی...... ہمیں تو کوئی کورس میں بھی چانس نہیں دیتا جی۔''

جھوٹ بول کر اس پر قائم رہنا امتل کے بس کی بات نہیں تھی۔

مجھے امتل پر یکدم بڑا ترس آیا...... کوئی کوئی عورت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ وہ چاہے ستر برس کی کیوں نہ ہو جائے اسکے اندر کچھ ایسا دوشیزہ پن موجود رہتا ہے کہ مرد کا دل اسے دیکھ کر موم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا...... امتل ہمیشہ تو ایسی نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اچانک وہ بڑی معصوم بڑی کنواری اور کھوئی ہوئی نظر آنے لگتی۔

ایسے لمحوں میں اسے دنیا سے بچانے کو جی چاہنے لگتا۔

....

بھنبھور ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے دوسرا دن ڈیڈ لائن تھی۔

میں چاہتا تو ناہید کی جگہ کسی اور لڑکی سے کام نکال سکتا تھا۔لیکن مجھے نازک مزاجوں سے بڑا عشق ہے۔ ریڈیو سٹیشن کی نوکری بھی مجھے اسی لیے پسند آ گئی۔ کیونکہ یہاں بھی چپے۔ ٹوٹے بنگے' اڑب' ملائم سب نازک مزاج تھے۔ خاص کر وہ آرٹسٹ جن کی ضرورت پروڈیوسروں کو کم تھی اور جن کی نازک مزاجی اس ضرورت کو کمتر کر دیتی تھی۔

ناہید سے معافی مانگ کر اس کی انا کو بحال کرنے کے لیے میں ہیرا منڈی گیا۔ میں اپنی نئی موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ اس کی نمبر پلیٹ ہینڈل سیٹ سب چمک رہے تھے۔ موٹر سائیکل نیا ہو اور اپنا ہو تو یوں لگتا ہے جیسے عربی گھوڑا رانوں تلے آ گیا ہے اور آدمی زمین کے بجائے بادلوں میں اڑ رہا ہے داتا دربار سے آگے دورویہ سڑک پر رش نسبتاً کم محسوس ہوتا ہے۔ سڑک کی دوسری جانب نالے سے ادھر لال پیلی ڈوروں کے تانے پر کچھ مزدور صورت مانجھا پھیر رہے تھے۔ ہیرا منڈی کو دراصل دو راستے جاتے ہیں ایک لیڈی ولنگڈن کے پہلو سے ہو کر بادشاہی مسجد کے عقب تک پہنچتا ہے۔دوسرا ذرا پہلے گھاٹی نما سڑک سے گزر کر ہیرا منڈی پہنچتا ہے۔ میں بادشاہی مسجد والے راستے پر بڑے خطرناک طریقے سے موٹر سائیکل چلاتا بازار میں داخل ہوا۔اس سے پہلے نہ کبھی میں ناہید کے گھر گیا تھا نہ ہی ان گلیوں سے واقف تھا۔

تھوڑی سے تلاش کے بعد میں ناہید کی گلی میں جا نکلا۔ ناہید کے گھر کے بالکل سامنے رانی بینڈ والوں کا چوبارہ تھا۔اور اس وقت وہ پگڑیاں سروں پر لپیٹتے کلارنٹ' بھونپو' باجے' تاشے اور ڈھول اٹھائے تنگ سیڑھی سے اتر رہے تھے۔گلی صاف

ستھری اور سنسان تھی...... بینڈ والوں کے کوٹھے پر ان کا بورڈ نصب تھا جس کے نیچے رقم تھا کہ باوردی آنے کے ریٹ مختلف ہیں۔

جس وقت اکادکا سر بجاتے رانی بینڈ والے نکڑ پر غائب ہو گئے۔ میں نے چوتھی مرتبہ ہارن بجایا۔ لیکن ناہید کے سہ منزل مکان سے کوئی برآمد نہ ہوا۔ اس سے پہلے گھنٹی بجانے پر بھی کوئی باہر نہ نکلا تھا۔ اس کے بعد میں نے دروازے کا کنڈا تختے سے بجانا شروع کر دیا۔ جس وقت ایک سات آٹھ سالہ لڑکی باہر نکلی۔ میرا ارادہ ناہید کو کاسٹ کرنے سے بالکل اکتا چکا تھا۔

بڑے محرابی پھاٹک کے پیٹ میں بنے ہوئے طاقچہ نما دروازے سے وہ باہر نکلی اندر ایک بھینس بیٹھی جگالی کرنے میں مشغول تھیں اور مشین چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

''ناہید بی بی ہیں؟''

لڑکی نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آرام سے کھڑی املی کھاتی رہی۔

کیا ناہید بی بی کا یہی گھر ہے؟''

وہ آرام سے کاغذ چاٹنے میں مشغول تھی۔

'' منی میں ریڈیو سٹیشن سے آیا ہوں...... کیا یہ ناہید کا گھر ہے؟ ریڈیو آرٹسٹ ناہید کا۔''

اب منی کی زبان فر فر چلنے لگی۔

''اچھا جی آپ ریڈیو سٹین سے آئے ہیں۔ باجی تو صبح کی ریڈیو سٹیشن گئی ہوئی ہے ناشتہ بھی نہیں کیا اس نے...... بابا علیا آج صبح ٹکسالی سے نہاری لایا تھا۔ باجی نے وہ بھی نہیں کھائی خدا کی قسم...... صبح بی بی نے اتنے جھڑکے دیے باجی کو...... تین بار میک آپ کرنا پڑا باجی کو۔''

تین بار کیوں؟''

وہ میری کم عقلی پر ہنس دی...... باجی رو رہی تھی صاحب جی۔ پوڈر تھوڑی ٹھہرتا

تھا اس کے منہ پر۔"

"جھڑ کے کیوں دیے بی بی نے۔"

"ریڈیو سٹیشن نہیں جاتی تھی باجی...... بی بی کا غصہ ہی برا ہے...... پرسوں باجی گلزار کے منہ پر کھچ کے چپیڑ ماردی تھی۔ باجی گلزار گری منجے پر پاوا لگا گال پر دو ٹانکے لگے۔ پھر سارا دن بی بی بیٹھی روتی رہی۔ اپنے منہ پر چپیڑیں مارے اور روئے ہائے ہائے اپنا مال آپی داخلی کرلیا میں نے...... صاحب جی ریڈیو سٹیشن کیا ہے؟......" چھوٹی سی لڑکی بڑی پکی باتیں کر رہی تھی۔

"کبھی اپنی باجی کے ساتھ آکر دیکھ لینا۔

"باجی کہیں نہیں لے جاتی جی...... کہتی ہے میری پوزیشن خراب ہوتی ہے۔"

میں اس شہزادے سے پتہ نہیں کب تک باتیں کرتا رہتا لیکن اسی وقت کسی نے میرے کندے پر ہاتھ رکھ کر کہا...... "کیوں سر جی اس وقت کہاں چوری چوری؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا احتل کھڑی تھی سرخ ہونٹوں تلے اس کے نسواری دانت بھی مسکرا رہے تھے۔

"آئیں ناں غریب خانے پر"

"آج نہیں احتل آج مجھے ڈرامہ بھنبھور ریکارڈ کرنا ہے۔"

"ناں ناں...... لارا چھوڑیں...... ہمارا رواج نہیں کہ ایک بار پھنسے شکار کو چھوڑ دیں...... چلیں آپ۔"

"یہ باجی سے ملنے آئے ہیں ریڈیو سٹیشن سے......لڑکی نے قہر بھری نظروں سے احتل کو دیکھ کر کہا۔"

"کیوں ایک تیری باجی کے ملنے والے ہیں ریڈیو سٹیشن پر......اور کسی کا کوئی ملنے والا نہیں وہاں چلترو۔"

یکدم لڑکی نے مرا بازو تھام لیا

''بی بی مجھے مارے گی صاحب جی۔''

''اوئے ہوئے وڈی ہیجلی ...... چل جا کر بتا اندر اپنی کپتی بی بی کو اصل لے گئی ہے ریڈیو والے صاحب کو...... جا کھڑی کیوں ہے؟...... ان کے گھرانے نے تو دہلیز میں تعویذ دبا رکھا ہے جو کوئی اندر داخل ہو گیا باہر جوگا رہتا ہی نہیں...... چلیں سر جی فوراً یہاں سے۔''

اب ایک بازو میرا شہزاد کے ہاتھوں میں تھا اور دوسرا اصل تھامے ہوئے تھی

''مجھے ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہے منی میری ریکارڈنگ ہے۔''

باجی کے ساتھ؟

''ہاں باجی کے ساتھ۔'' منی نے بازو چھوڑ دیا۔

''خدا کے لیے سر جی ایک بار میرے گھر چلے چلیں...... میری عزت بن جائے گی......؟''

اصل گڑگڑائی

میں شہزاد سے نظریں ٹرا کر اصل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ہم تھوڑی دور گئے تھے کہ منی بھاگی ہوئی ہمارے پاس آئی اور گھبرا کر بولی...... ''بی بی مجھے مارے گی آپا جی آپ انہیں ساتھ نہ لے جائیں۔''

''چل مشٹنڈی خبردار جو پیچھا کیا ہمارا پتہ نہیں میرا۔''

لڑکی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں شہزاد کے ساتھ لوٹنا چاہتا تھا لیکن اصل میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں خوفزدہ ہو گیا۔

گلی تنگ اور خاموش تھی دو رویہ پرانی وضع کے چھجے اور شہ نشینوں والے مکان تھے جن پر پرانے پینٹ کے جالی دور دروازے اور بوسیدہ کھڑکیاں اس وقت سختی سے بند تھیں۔ رات کو یہاں سے موسیقی کی آواز اور گھنگھروؤں کی جھنکار نکلتی ہو گی اس وقت ان مکانوں کے پٹ کھلتے تو کھانستے ہوئے بڈھے پان کھاتی ادھ کھائے

امرود جیسی عورتیں اور مٹھیوں میں پیسے بھینچے بچے باہر نکلتے۔گلی ویران تھی۔جوان پیشہ ور عورتیں اس وقت رات جاگے چوکیداروں کی نیند سو رہی تھیں اپر والی منزلوں سے گدلا پانی رس رس کر گلی کی نالیوں میں پڑ رہا تھا پرانے گھروں کی دیواروں میں پیپل کی کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔...... یہ گلی بالکل شانت تھی اس کا رات کے کاروبار کے ساتھ دن کے وقت کوئی تعلق نہ تھا۔اس کے اندر باہر اس وقت ٹوٹے ہوئے میلے جیسی اداسی تھی۔

''دیکھو احتل میری ریکارڈنگ ہے پورے گیارہ بجے ساری کاسٹ جمع ہو گی۔ پھر انجینیر وقت دے سکے یا نہ دے سکے اب مجھے جانے دو۔''

احتل کے گھر کے سامنے میں نے سماجت سے کہا۔

''سر جی آپ کی بڑی مہربانی ہو گی کہ آپ آج میرے گھر چل کر ایک بوتل پی لیں۔خدا قسم سارے محلے میں میری بڑی عزت ہو جائے گی۔اب تو کئی سالوں سے میرے گھر نہ کوئی فلم والا آیا ہے نہ ریڈیو سٹیشن سے کسی نے خبر لی ہے۔''

باہر ڈیوڑھی میں اپنی موٹر سائیکل پارک کر کے ہم دونوں اندر صحن میں داخل ہوئے ان صحن کے اردگرد کمرے ہی کمرے تھے۔آنگن میں ڈھیلی چارپائیاں پڑی تھیں ان چارپائیوں پر رنگ برنگ مختلف عمروں کے لوگ بیٹھے ہم دراز اور لیٹے ہوئے تھے جا بجا باسی برتنوں کے ٹرے کوڑے کی ٹوکریاں، پرانے کپڑوں کے انبار پڑے تھے بچے رو رہے تھے عورتوں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی ریڈیو چل رہے تھے حساب ہو رہے تھے عورتوں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی ریڈیو چل رہے تھے حساب ہو رہے تھے یہ گھر کسی کا گھر نہیں تھا اور سب کا گھر تھا بہت سا بے مصرف سامان زائد چہرے اور فرنیچر کی وجہ سے یہاں سب کچھ فالتو اور بیکار نظر آتا تھا۔

احتل میرا بازو تھامے بڑے فاتحانہ انداز میں صحن میں داخل ہوئی میں اس کی ٹوفی تھا اور وہ مجھے جیت کر لائی تھی ہم دونوں بغلی سیڑھیوں سے اوپر والی منزل میں داخل

ہوئے یہاں بھی نچلے کمروں کی طرح چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے لیکن اوپر
والی منزل میں داخل ہوئے یہاں بھی نچلے کمروں کی طرح چاروں طرف کمرے ہی
کمرے تھے لیکن اوپر والی منزل قدرے غیر آباد تھی صحن کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں
بند تھیں۔ کمرہ بے ترتیب تھا ایک پرانا پلنگ تھا جس پر بوسیدہ کھیس اور نسواری رنگ
کی شنیل کی رضائی پڑی تھی الماری کے پٹ بالکل کھلے تھے اور ان میں ٹھنسا ٹھنس
بغیر تہ کیے ہوئے کپڑے اٹے رہے اصل نے کمرے میں گھستے ہی الماری کے پٹ
بند کر کے اس کے سامنے کرسی رکھ دی بوسیدہ صوفے پر چڑھ کر پھر سڑک کی جانب
کھلنے والی کھڑکیاں کھولیں اور مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''یہ اتنی ساری مخلوق یہاں رہتی ہے اصل...... تمہارے ساتھ؟''

''ہاں سر جی ہمارا رواج ہے ہم لوگ اپنے بزرگوں کی بہت عزت کرتے ہیں
......'' وہ اپنا دوپٹہ اتار کر صوفہ جھاڑنے لگی۔

''یہ سب تمہارے بزرگ ہیں...... بچے لڑکیاں سب؟''

''کچھ بزرگ ہیں کچھ رشتہ دار ہیں۔ اچھا یہ بتائیں کو کا پئیں گے فینٹا۔''

''اصل...... سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں ریکارڈنگ ہے میری۔''

''چائے سبز قہوہ؟''

''چلو چائے سہی۔''

اب اس نے دوپٹہ برقعہ سب پلنگ پر پھینک دیا اور اندر صحن کی جانب کھلنے والے
چھجے کی طرف چلی گئی۔

''بی بی...... بی بی جی چائے بھجوائیں اوپر...... پارٹی آئی ہے......'' پشت سے وہ
بالکل بیالیس برس کی معلوم نہ ہوتی تھی اس کے کولہے کمر کندھے پچیس برس کی
جوان عورت کے نظر آرہے تھے جب وہ صحن کیطرف کھلنے والے دروازے کی چٹخنی لگا
کر اندر آئی تو اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی تھی۔

''پارٹی کا کیا مطلب ہے احتل؟''

اس نے آنکھ مار کر کہا...... ''سر جی پارٹی گاہک ہوتا ہے اب وقت بدل گیا ہے گاہک کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

میں کچھ گھبرا کر بولا...... ''لیکن میں تو پارٹی نہیں ہو احتل''

''سر جی کیا بتائیں میری عزت بن جائے گی محلے میں آپ کا کیا جائے گا ...... ویسے بھی اب تو میرے مہمان کی بی بی خاطر ہی نہیں کرتی اب تو فیروزہ کے دن ہیں۔''

''فیروزہ کون؟''

''میری چھوٹی بہن ہے سر جی ...... اچھے پیسے لاتی ہے مجروں سے۔ اس کی خاطریں ہوتی ہیں اس کے مہمانوں کو کگڑ بھون بھون کر کھلاتی ہے...... میں تو چائے بھی منگوالوں تو بی بی کو غصہ چڑھ جاتا ہے۔''

پتہ نہیں مجھے کیوں احتل پر شدید ترس آ گیا۔ جب آدمی اندر سے شدید بحران کا شکار ہو چکا ہو اور تنہائی کے دشت میں بہت گھوم پھرے تو عموماً وہ اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے محبت کرنے لگتا ہے کیونکہ اسے مامتا کی سکورٹی درکار ہوتی ہے شاید یہی وہ لمحہ تھا جس میں ایک لاحاصل رابطے کا شکار ہوا۔

مجھے اس کے بوڑھے جسم میں دوشیزگی کی ادائیں دیکھ کر ایسی تکلیف ہو رہی تھی کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسے اس کی جوانی کہیں سے لا کر لوٹا دیتا دراصل یہی وہ وقت تھا جب مجھے بھاگنا چاہیے تھا کیونکہ وہ بھی میری طرح ادھ موا گرج تھی اس گدھ کی ساری زندگی بیابونوں میں اجڑے تھلوں میں سوکھے پیڑوں پر کٹی تھی لیکن ہم مشرب کو سامنے پا کر مجھ سے بھاگا نہ گیا اس میں کچھ ایسی گرمی لجاجت اور خبصورتی تھی کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے السر کا درد بھی بھول گیا۔

''میری بی بی بھی بہت بدقسمت ہے بیچاری۔ اگر اس کے گھر پانچ بیٹوں کی جگہ

پانچ بیٹیاں ہوتیں تو آج راج کرتی بی بی...... پر ایسی ٹھنڈی قسمت ہے بی بی کی ...... دے لڑکا پے لڑکا...... دے لڑکے پر لڑکا...... جو کہیں فیروزہ پیدا ہوتی تو ہم سب تو فاقوں مر جاتے۔ خدا قسم بی بی تو اسے بھی میرا قصور سمجھتی ہے اس کا بس چلے تو اس کی سزا بھی مجھے ہی دے۔"

پہلی بار میں ایک ایسی سوسائیٹی میں داخل ہوا تھا جہاں بیٹے کی پیدائش غم انگیز امر تھی...... "پانچوں بہوئیں بھی تو آئی ہوں گی اسی گھر میں؟"

"ہماری طرف بہو پیشہ نہیں کرتی سر جی۔ پیشہ صرف بیٹی کرتی ہے۔"

"اس کی کیا وجہ ہے امتل"

"بظاہر تو کوئی وجہ نہیں سر جی صرف رواج ہے لیکن شاید صرف بیٹی ہی ماں کو سارا کچھ دے سکتی ہے۔ بہو ہمیشہ کرے تو کبھی ساس کو کچھ دے؟ پھر پیشہ کرانے کا فائدہ؟ "

اس وقت میں سوشیالوجی کا ایک پرانا طالب علم اصلی معنوں میں طالب علم بنتا ہے۔

"امتل...... یہاں کس قسم کی لڑکی اچھی طوائف بنتی ہے...... کچھ تو نشانیاں ہوں گی ناں؟"

"ہاں سر جی نشانیاں پکی ہوتی ہیں۔ جس لڑکی کی آنکھ بولے ہونٹ دعوت دیں چلتے میں کولھے ہلیں سچی بات ہے سر جی جس کا جسم نہ بولتا ہو وہ ادھر بھی گرہستن رہتی ہے، آپ کے شہر میں بھی بیچاری بچے پالتی مرتی ہے عورت کا تو انگ انگ بولتا ہو تو کام بنتا ہے......" میری نگاہوں میں گم سم بھابھی صولت کا چہرہ گھوم گیا۔

"ادھر تمہاری طرف بھی کچھ Status وغیرہ کا چکر ہے امتل۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"یعنی کچھ طبقے وغیرہ...... کچھ ذات برادری کا چکر اونچ نیچ۔"

وہ ہنسنے لگی۔

''لو سر جی اونچ نیچ کا چکر کہاں نہیں...... چوروں میں اس کا چکر سمگلروں میں اس کا چکر کچھ چور صرف نقدی سونا چرانے والے ہوتے ہیں۔ کچھ بھینس بکری کھول کر لے جاتے ہیں۔ کچھ صرف گٹروں کے ڈھکنے اٹھاتے ہیں۔

''اور تمہارے ہاں؟''

''ہمارے ہاں بھی سر جی تین طبقے ہیں۔ اونچا طبقہ...... امیر ڈیرے دار طوائفیں، درمیانہ طبقہ عزت دار غیرت دار لوگ رسم ورواج کے پابند...... تیسرے غریب مندے حال...... سب سے راندی ہوئی بھیڑے حال اور ٹھکیائی ہوتی ہے۔ جسے ہونٹ لال کرنے جوگے پیسے بھی نہیں ملتے۔ اس کا پیٹ سینہ سب سپاٹ ہوتا ہے۔ بالوں میں پلاسٹک کے کانپ جسم پر نائیلون کے ایسے پرانے کپڑے جن سے پسینے کی بو آتی ہے۔ اس ٹھکیائی کے کئی حرامی بچے ہوتے ہیں۔ ایک بیمار شوہر ہوتا ہے کئی ہرجائی مفت خورے آشنا ہوتے ہیں۔ یہ سوتی بھی باربار ہے اور کاروبار بھی اس کا ادھر پر چلتا ہے۔ شوہر اس کا مارنے والا چرسیا ہوتا ہے۔ وہ سر جی کئی چکیوں میں پستی ہے۔ کبھی شوہر کی چکی میں کبھی بچوں کی چکی میں کبھی غریبی کبھی ادھار کی چکی میں، تیس تک پہنچتے پہنچتے تو اس کا صرف چھچھڑا باقی رہ جاتا ہے ہڈیوں پر...... آپ کو ایسی طوائف نظر آجائے تو آپ ناک پر رومال رکھ لیں۔ یہ جو آپ کے ادیب شاعر لوگ ہیں۔ وہ کبھی ایسی طوائف کی کہانی نہ لکھیں اس پر کون غزل کہے؟ گندی نالی کے پاس کون بیٹھے بتایئے؟''

میں غور سے امتل کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ بہت تجربہ کار اور بوڑھی نظر آ رہی تھی۔

''دوسرا مڈل کلاس طبقہ ہے سر جی جس طرح آپ کی مڈل کلاس عورت شریف ہوتی ہے۔ رسم رواج کے ہاتھوں ہماری مڈل کلاس عورت پر بھی بڑی پابندی ہوتی

ہے۔

اس پر اخلاقی معاشرتی ذہنی کئی پٹیاں کسی ہوتی ہیں۔ یہ کرو وہ نہ کرو کی تلوار لٹکی ہوتی ہے ان کے سر پر ...... انہیں بھی شریف زادیوں کی طرح عشق کرنے کی اجازت نہیں ہوتی''۔

''وہ کیوں''

''طوائف کا تو ازلی دماغ خراب ہے۔ ادھر اس کو عشق ہوا ادھر وہ بھاگ جائے گی۔ سارا کاروبار ٹھپ اسی لیے تو کنجر، نائیکا گھر والے سب اسے ڈرا دھمکا کر رکھتے ہیں۔ وہ عزت، غیرت، نفع نقصان، لین دین پردہ بے پردگی، کئی قسم کے نظریات میں جکڑی ہوتی ہے۔ نماز روزہ، نذر نیاز، عاشورے کونڈے گیارہویں شریف گنڈہ تعویز دم و درود سب اس کی زندگی پر چھائے ہوتے ہیں۔ دراصل وہ بھی آپ کی مڈل کلاس عورت کی طرح بڑی جذباتی وہمی اور ڈرپوک ہوتی ہے سر جی ...... جو رقم وہ کماتی ہے سیدھی ماں کے پاس پہنچتی ہے۔ کیونکہ مڈل کلاس کی عورت کو اپنی ماں سے بڑا پیار ہوتا ہے۔ اس پیسے سے اس کے بھائی بوسکی کی قمیضیں پہنتے ہیں عطر لگاتے ہیں۔ بلیک میں ملنے والے سگریٹ پھونکتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہر مڈل کلاس عورت کی طرح ڈنڈی مار کر رقم بچانے لگتی ہے۔ کسی کسی گاہک سے علیحدگی میں کچھ رقم موس لیتی ہے۔ پھر اس رقم سے پان مٹھائی کھانے کا آرام ہو جاتا ہے کاسٹیم جولیری خریدی جا سکتی ہے''۔

''اور اخلاقی طور پر یہ مڈل کلاس کی طوائف کیسی ہوتی ہے افضل''۔

شریف ہوتی ہے سر جی ...... عموماً اسے شراب، جوئے اور اپنے پیشے سے نفرت بھی ہوتی ہے۔ آپ کی مڈل کلاس عورت کی طرح ...... لیکن اس کا حسن بھی دو روزہ ہوتا ہے۔ عمر ڈھلے پر چاہے وہ اچھی گانے والی ہو چاہے تہلکہ مچانے والی سب اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں ...... سب کے سب''۔

میں نے امتل کی جانب دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک چھوڑی ہوئی مڈل کلاس طوائف تھی۔

''صرف اسی کو شادی کا شوق ہے۔ جتنی عورتیں ہیرا منڈی سے نکاح کے شوق میں بھاگتی ہیں وہ سب اس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ گرہستی کے شوق میں یہ ساری ساری عمر کنجری ہونے کا طعنہ سنتی ہیں اور کبھی لوٹ کر پیشہ کرنے نہیں جاتیں...... ان کی عقل ہمیشہ ان کو خراب کرتی ہے ان کا دل ہمیشہ ان کی مٹی پلید کرتا ہے۔''

''وہ سرجی ہر جگہ عیش کرتی ہے۔ آپ کی طرف ہو تو ایک مرد کی دولت اس کا نام شہرت اس کے کام آتا ہے۔ ادھر کی ہو تو کئی امیر آدمیوں کے گھروں میں سیندھ لگ جاتی ہے۔ آپ کا شاعر جب غزل کہتا ہے اس طبقے کی طوائف پر کہتا ہے فلم بنتی ہے تو اس کو سامنے رکھ کر...... کہانی لکھی جاتی ہے تو وہی نظر میں ہوتی ہے مشٹنڈی...... نہ نماز نہ روزہ لے دے کر ایک مذہب ہے اس کا کالے کپڑے پہن کر بڑھیا فرانسیسی خوشبو لگا کر مجلسوں میں جانا...... سرجی جس عورت کے منتر تلوے چاٹتیں جاگیردار ہاتھ جوڑیں اونچا افسر جس کے گھر میں ٹائی اتار کر بیٹھے بھلا اس کے کیا کہنے؟ اللہ ادھر منڈی میں تو پیدا کرتا سرجی پر کسی اونچی ڈیرے دار طوائف کے گھر۔''

اس امتل سے میں واقف نہ تھا۔ وہ بڑے تسلسل اور تجربے سے بولنے کی اہل تھی اور اس کی باتوں میں ایک خاص قسم کی منطق تھی۔ پتہ نہیں یہ اس کی گفتگو تھی۔ کہ سوشیالوجی میں دلچسپی اب میں کافی حد تک ہو چکا تھا اور مختلف قسم کے سوال پوچھ رہا تھا۔ چائے کا ٹرے میز پر رکھ کر نوجوان لڑکے نے پوچھا...... ''بی بی پوچھتی ہیں صاف چادریں اور غلاف بھی بھیج دوں۔''

امتل نے چور نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر کھسیانی ہنسی ہنس کر بولی۔

لے اور نہیں تو کیا۔''

''اور پان کا بھی پوچھا ہے بی بی نے۔''

''وہ بھی بھیج دے۔''

نوجوان لڑکا ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈال کر لجاجت سے بولا..... سر جی زرا موٹر سائیکل کی چابی دیں..... میں لوہاری سے پتنگ لے آؤں۔

''تیری ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ یہ ریڈیو سٹیشن سے آئے ہیں کوئی ایویں کیویں نہیں ہیں جا..... پھٹا کھا۔''

میں نے جیب سے نئے موٹر سائیکل کی چابی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

''نہ سر جی جو ادھر آتا ہے یہی کرتا ہے یہ اسی لیے چوڑ ہو جاتے ہیں ہمارے لڑکے۔''

''اچھا بھئی جلدی آنا مجھے ریڈیو سٹیشن جانا ہے..... ریکارڈنگ ہے میری ..... گیارہ بجے!''

''یہ کم بخت کبھی جو رات کے بارہ بجے سے پہلے آ گیا..... امتل نے جھپٹ کر چابی چھین لینا چاہی لیکن وہ اتنی دیر میں چمپت ہو گیا۔

''اب آپ ریڈیو سٹیشن کیسے جائیں گے؟

''تم فکر نہ کرو آ جائے گا ابھی..... اس عمر میں سب کو موٹر سائیکل کا شوق ہوتا ہے۔'' وہ عمر میں مجھ سے قریباً دوگنی تھی۔ اس کے باوجود اس کی لجاجت، شرمندگی اور کم ہمتی نے عمر میں اسے مجھ سے چھوٹا بنا دیا تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر وہ تھانیدارنی بنی پھرتی تھی یہاں اس کے چہرے پر کنواری لڑکی جیسی حیا چھلکنے لگی۔ پتہ نہیں کیوں یکدم میں اس کے ساتھ بہت آرام دہ محسوس کرنے لگا۔

بڑی دیر تک وہ آؤ بھگت میں لگی رہی۔ مہمان نوازی اس کے ساتھ ایک نیچرل نسوانی فعل تھا۔ جیسے ماں دودھ پلاتی ہے۔ میں اب اس علاقے کی طبقاتی کشمکش میں دل سے دلچسپی لینے لگا۔

''تم بھی تو بڑے ٹھسے کی ہو گی اپنے وقت میں امتل۔''

تھی جی ...... پر ادھر مڈل کلاس کی عورت سے کچھ نہیں ہوتا۔ ٹا کیوں کی گڈی ہوتی ہے وہ تو ...... میں نے ساری عمر اتنی مار شریف عورتوں سے نہیں کھائی سر جی جتنی امیر رنڈیوں سے کھائی ہے جو بھی اچھا گاہک بھی ملا۔ بالآخر انہوں نے چھین لیا۔ جو کام کا گاہک لگا یہ اڑا کر لے گئیں۔

پتہ نہیں کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ چپ ہو گئی۔

امتل بہت زیادہ جی چکی تھی۔ ان گنت لوگوں سے ملتی تھی۔ اس کے تمام خوب صورت کنارے، منیارے، رنگ روغن، منقش پھول بوٹے ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اس قدر استعمال شدہ ہونے پر بھی اس میں ایک حزن اور خوبصورتی ایسی بھی پیدا ہو گئی تھی جو پرانے کھنڈروں میں ہوتی ہے۔ ایک طرح سے وہ بجھا ہوا سگریٹ تھی۔ بے دھیانی، بے منزل کی انتہا ...... لیکن کبھی کبھی اس سگریٹ میں آگ کے شعلے خود بخود نکلنے لگتے ...... ریڈیو سٹیشن پر وہ اور ہوتی ...... گھر پر ایک اور امتل ملتی ...... بازار میں اس کا رنگ بالکل انوکھا ہوتا ......

نوجوان کے جانے کے بعد چادریں اور غلاف آ گئے، امتل نے بستر اصفائی سے بچھایا اور مجھ سے نظریں چرائے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ ریکارڈنگ کا ٹائم نکل گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے لیکن نوجوان موٹر سائیکل لے کر نہ لوٹا۔ میں چلا تو جاتا۔ لیکن دوبارہ میں موٹر سائیکل لینے ادھر نہ آنا چاہتا تھا۔ جب ہم رات کا کھانا کھا چکے تو امتل نے لجاجت سے کہا۔ ”سر جی اب آپ چلے جائیں خدا قسم وہ تو چاہے کل تک نہ آئے الو کا پٹھا۔!‘

مجھے دوبارہ ادھر آنے سے خوف آ رہا تھا۔ خیال تھا کہ اگر ایک دفعہ اور میں ادھر آیا تو پھر میں کبھی یہاں سے جا نہ سکوں گا۔ بازار جاگ اٹھا تھا اور موسیقی کی آواز اب ادھر بھی آنے لگی تھی۔

”آپ سو جائیں سر جی ...... میں ادھر صوفے پر لیٹ رہوں گی صاف بستر ہے۔

''

میں چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔

وہ لجاجت سے پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ اتنی عمر کی عورت کو میں نے اس قدر بے بس کبھی نہیں دیکھا۔

''آپ ٹیکسی پر چلے جائیں سر جی...... میں کل ریڈیو سٹیشن آپ کا موٹر سائیکل بھجوادوں گی۔''

میں چپ رہا۔

''یہ رضائی صاف ہے...... اس میں کوئی نہیں سویا سر جی......'' اس نے منہ پرے کرلیا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

میں نے جوتیاں جرابیں اتاریں ٹائی کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا اور چپ چاپ پلنگ پر دراز ہوگیا۔

''ادھر آؤ امتل۔''

''جی سر جی۔''

''میرا نام معلوم ہے ناں تمہیں؟''

''جی''

تو مجھے قیوم کہو ناں؟''

''اچھا سر جی۔''

''یہاں بیٹھو۔''

وہ پلنگ کی پائنتی بیٹھ گئی۔ اس کے کندھے آنکھیں اور ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ یکدم وہ میری ٹانگیں دبانے لگی۔

''یہ کیا کر رہی ہو امتل؟''

''کچھ نہیں جی...... جی چاہتا ہے...... بڑی دیر ہوگئی میں نے کبھی کسی کی

ٹانگیں نہیں دبائیں۔"

"ادھر آؤ میرے پاس۔"

وہ ڈرتے ڈرتے سرہانے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"کبھی تم نے کسی سے محبت کی ہے...... لاحاصل محبت...... دیوانہ بنا دینے والی...... جیسے خالی کنویں میں گونج پھرتی ہے۔"

وہ چپ رہی...... میں کہنی کے بل ہو گیا۔ پھر میں نے اس کی جھولی میں ہاتھ ڈال کر پوچھا...... "لاحاصل محبت اور دیوانگی میں کچھ فرق تو نہیں ہوتا امتل...... تم تو تجربہ کار ہو بتاؤ...... تم نے کبھی عقل شعور سے نکل کر محبت کی ہے۔"

میرے ہاتھ پر ایک بڑا سا آنسو گرا...... پھر امتل نے لمبی سانس بھری۔ لیکن خاموش رہی۔

"بتاؤ امتل۔"

اس نے منہ پھیر کر کہا...... ہمیں کیا پتہ ان باتوں کا سر جی...... ہم لوگ کوئی زخم تھوڑے ہوتے ہیں۔ زخم تو اور جگہوں سے لگتے ہیں۔ ہم تو صرف پھاہا رکھتے ہیں زخموں پر...... ہمارا تو فسٹ ایڈ کا محکمہ ہے۔"

"پھر کسی کا زخم ٹھیک ہوا تمہارے ہاتھوں۔"

اب اس کی آنکھوں سے جھرنے کی طرح آنسو گرنے لگے...... "ناں سر جی...... یہ زخم ہمیشہ اسی سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں عنایت کرتا ہے...... کبھی کبھی تو یہ اس کے بس کی بات نہیں رہتی۔"

میں نے اٹھ کر اس کے دونوں کندھے پکڑ لیے...... بتاؤ امتل جب آدمی کسی کو زخم عطا نہیں کر سکتا۔ خود کسی کا زخم بھر نہیں سکتا تو پھر وہ جیتا کیوں ہے؟ جیئے کیوں چلا جاتا ہے؟۔"

پتہ نہیں کیوں اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے بولی...... آپ کیوں

روتے ہیں روئیں آپ کے دشمن۔''

''آدھی رات گئے جب میرا موٹر سائیکل نیچے آیا تو میری آنکھ کھلی۔ باہر کے لیمپ پوسٹ کی روشنی تکیے پر اس جگہ پڑ رہی تھی۔ جہاں اصّل سوئی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر اس کے چہرے پر لکھی تھی۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور ہونٹ لکیر دار تھے۔ وہ منہ کھولے ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ پہلی بار عافیت سے دو چار ہوا۔ اپنے ہم جنس کی رفاقت ملی۔ گدھ برادری کا کوئی فرد اس قدر قریب پا کر میں نے اسے آہستہ سے اٹھایا۔

''اصّل!''

وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

جی سر جی۔''

''مجھ سے شادی کرو گی۔ ہم دونوں...... ہم دونوں ہمیشہ اکٹھے رہیں گے ہمیشہ ہمیشہ۔''

وہ عجیب طور پر ہنسی اور پھر مجھے تکیے پر دھکیل کر بولی...... ''اچھا صبح سہی اس وقت تو مولوی نہیں ملے گا۔''

پہلی بار مجھے دیر تک ہنسی آتی رہی۔ اپنے آپ پر...... اصّل پر اور ساری دنیا پر۔

....

یوں تو ہر دفتر میں یونہی آنے والوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن ریڈیو ٹیلیویژن اور فلمی دنیا میں ایسے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے کچھ ایکٹر کچھ ادیب کچھ موسیقار پروگراموں کی تلاش میں آتے ہیں کچھ نفری یہاں محض ادیبوں گلوکاروں اور ایکٹروں سے ملنے آتی ہے کچھ ایسے خوش فہم خالی الوقت لوگ یہاں آتے ہیں جو سمجھتے ہیں ان شعبوں میں نام بنانا اور دولت کمانا بہت آسان ہے یہ لوگ ان مکھیوں کی طرح ہوتے ہیں جن کا شہد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکنوہ مکھیوں کی دیکھا

دیکھی پھولوں کا طواف کرنے میں مگن رہتے ہیں

میں کئی دن تک اصل کا اسی بھیڑ میں انتظار کرتا رہا لیکن وہ ریڈیو سٹیشن نہ آئی

اس روز میں دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک میرے سینے کے نیچے معدے میں جلن شروع ہو گئی میں کرسی پر بیٹھ گیا کچھ دنوں کے آرام کے بعد اب میرے السر میں پھر تکلیف ہونے لگی تھی تکدم اتنا شدید درد اٹھتا اور جلن ایسی ہوتی کہ سانس رکنے لگتا کبھی کبھی تو اس شدت تکلیف سے میرا سارا بدن پتے کی طرح کانپنے لگتا اور میں سوچتا کہ کسی ہسپتال میں داخل ہو کر باقاعدگی سے اپنا علاج کراؤں۔

اس وقت دروازے پر دستک ہوئی اور بھائی مختار اندر آئے راجپوتی مونچھوں والے...... سیکرٹریٹ میں کام کرنے والے میرے بھائی نے کھانس کر میری جانب دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''بیمار ہو......'' آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی نے سوال کیا۔

''جی نہیں......'' میں یکدم چوکنا ہو گیا۔

وہ تھوڑی دیر تک اپنے گھٹنے دیکھتے رہے

''نارمل صحت مند آدمی کو...... ایک وقت پر ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے...... ورنہ وہ صحت مند نہیں رہ سکتا!''

''جی!''

''اچھا ہے کہ تم اب باقاعدگی سے دفتر جانے لگے ہو...... اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم پہلے سے بہتر ہو رہے ہو...... نئی موٹر سائیکل کی بھی مبارک باد ہو۔''

''جی!''

''کالج کے زمانے میں ہر نوجوان کو عشق ہو جاتا ہے...... یہ واقعہ قریباً سب کو پیش آتا ہے...... لیکن اس کو روگ بنانا درست نہیں۔''

میں حیران رہ گیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے سوائے کوئی میرے حالات سے اس قدر اچھی طرح آشنا ہو سکتا ہے اس وقت میرے ٹانگیں برادے کی بنی ہوئی تھیں اور میرا بوجھ ان کے لیے بہت زیادہ تھا میں اور بھائی مختار مکمل طور پر ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے ایک نا آشنا کے منہ سے اتنی قریبی باتیں سن کر میں بھونچکارہ گیا۔

''ہر آدمی اوسطاً زندگی بھر میں پانچ یا چھ فل سائز عشق کرتا ہے اور ہر عشق سے جانبر ہونے کے لیے اسے اوسطاً چار سے چھ ماہ تک لگتے ہیں......تم نے بہت دیر لگا دی۔!''

میں چپ رہا۔

''تمہاری بھابھی کا بھی یہی خیال ہے کہ شادی کی یہی عمر ہے اس کے بعد شادی بالکل بیکار ہے کیونکہ عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں......پھر آدمی کسی اور کے لیے زندگی میں جگہ نہیں بنا سکتا۔''

''میں سوچ کر جواب دوں گا۔''

''تمہاری نظر میں کوئی ہو تو ہمیں بتا دو۔''

میری نظر میں میری ہم مشرب ہم جنس ہم مسلک امتل گھوم گئی۔

''عاندہ نے اپنی چھوٹی بہن کے لیے کہلوایا ہے بلکہ اس نے تو بہت اصرار کیا ہے اگر تم چاہو تو۔''

''جی میں سوچ کر جواب دوں گا''

وہ چپ چاپ واپس چلے گئے جیسے چھٹی کی درخواست منظور کرالی ہو۔

یکدم میرے معدے میں دل جیسی دھڑکن پیدا ہو گئی میں لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا میں کھنگار کر تھوک دور پھینکا۔ آگے بند کی طرف سے متعفن بو کا ایک بھبھکا میرے طرف لپکا۔

میری نظروں میں عابدہ......سیمی......امتل پنکھے کے پروں کی طرح گھومنے

لگیں۔تیز گھومتیں تو ان کا ہیولا ایک ہو جاتا رفتار کم ہوتی تو علیحدہ علیحدہ نظر آنے لگتیں۔

عابدہ نے اپنی چھوٹی بہن کا رشتہ کیوں بھیجا تھا؟

کیا وہ بہن کے توسط سے مجھے زیر منقار رکھنا چاہتی تھی۔

کیا اپنی بہن سے مجھے بیاہ کر وہ مجھے انگوٹھا دکھانے کے منصوبے باندھ رہی تھی؟

جس وقت میں ریڈیو سٹیشن کے باہر پارک کی ہوئی کاروں کے ساتھ اپنی موٹر سائیکل رکھ کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا احتلبر آمدے میں آتی ہوئی دکھائی دی اس وقت کچھ السر کی درد اور کچھ ذہنی ناآسودگی کی وجہ میں باتیں کرنے کے موڑ میں نہیں تھا۔ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ اور میں کتاب کے صفحوں کی طرح بہت قریب رہ چکے تھے لیکن احتل ہر دن از سر نو شروع کرنے کی عادی تھی۔اس کے چہرے پر پرانی ملاقاتوں کا شائبہ تک نہ تھا اس نے ایک بار پھر مجھ سے قطعی اجنبی پن سے بات کی

''السلام علیکم سر جی!''......

''وعلیکم السلام''

''سر جی اپنے دوست قاضی سے میری سفارش کر دیں......سنا ہے رات ان کے گھر کاکا ہوا ہے آج موڈ بھی اچھا ہے ان کا......چائے بھی پلائی ہے انہوں نے اپنے چپڑاسیوں کو۔''

میں ذہنی طور پر اپنے السر سے لڑ رہا تھا۔

''آج نہیں احتل۔''

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''میں آپ کے لیے کلیجی لائی تھی پکا کر......آپ کے دفتر میں رکھا ہے ٹفن کیریئر میں نے......''

''میں تو آج ایک لقمہ نہیں کھا سکتا احتل......آج میرے السر میں تکلیف ہے

ایک نوالہ بھی کھا لیا تو سارا دن معدے میں جلن رہے گی...... کھٹے ڈکار آتے رہیں گے۔"

جس وقت ہم مڑ کر پروڈیوسروں کے دفاتر کی طرف جانے لگے پروڈیوسر غنی کے کمرے سے ستارہ نکلی یہ پتلے ہونٹوں والی آرٹسٹ نیل کلاسیکی موسیقی کے پروگرام کرتی تھی۔ اسے آئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا لیکن ریڈیو سٹیشن پر اس تفنگ انداز کے گن گانے میں مشغول تھے کچھ کن رسیا حضرات کا خیال تھا کہ اس کا مخرج بہت درست ہے الفاظ میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے رچاؤ اور لگاؤ سے وہ گاتی تو تھی لیکن سب سے بڑی بات آرٹسٹ کا مقدر ہوتا ہے۔ یہ جس وقت یاور ہو دنوں میں سنان مقبولیت کے باپ پر آفتاب کی طرح چمکنے لگتا ہے۔

پرانی گانے والیاں اس سے جس قدر جلن، حسد اور بیر کا اظہار کریں یہی اس کی شہرت کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔

ستارہ کو آتے دیکھ کر امتل بھاگی اور اس سے بغل گیر ہو گئی۔

"سبحان اللہ سبحان اللہ کیا بات ہے تیری چن جی...... کل شام میں نے تیرا پروگرام ٹیلی ویژن پر دیکھا ہوا ونی سادھائی پا...... پاپا کیا جگہ بنائی ہے تو نے پا کی ...... کیا سر سجایا ہے کوئی کہہ سکتا تھا کہ فوک میوزک کا پروگرام ہے ماشاء اللہ ماشاء اللہ استاد محمود خان کی تعلیم کو چار چاند لگا دیے...... سارا ماں کا رنگ ہو بہو وہی لے پکڑنے کا انداز جیتی رہ چن جی۔"

ستارہ تعریف کے باوجود خفیف کھڑی تھی۔

ان امتل نے ستارہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ میری طرف کیا "...... دیکھیں دیکھیں سر جی...... اللہ کی کرامت دیکھیں...... ہے کسی کی ریڈیو سٹیشن پر ہے یہ موہنی مورت کسی کا رنگ اچھا ہوتا ہے کسی کے نقش اچھے ہوتے ہیں اس کو تو رب نے سب کچھ دے رکھا ہے چھپڑ پھاڑ کر دیا ہے اسے سب کچھ۔"

حالانکہ نو دریافت شہرت نے ستارہ کو بہت تیز کر دیا تھا وہ میزیشنو سے لیکر پروڈیوسروں تک سب کے ناک میں دم کرنے کی اہل تھی لیکن اس وقت وہ بھی گڑبڑا کر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی۔

''چھوڑیئے باجی احتل۔''

''ناں چن جی میں کوئی تیرے گن گارہی ہو میں تو اللہ سچے کی تعریف کر رہی ہو کیا کیا مورتیں بناتا ہے......اپنا روپ کیسے کیسے دکھاتا ہے......سبحان اللہ''

''چلو میں قاضی کی طرف جارہا ہوں......'' میں نے ان دونوں سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔

''چلتے ہیں سر جی چلتے ہیں......یہ تل دیکھیں اس کی ناک پر......اس کی ماں کے ہونٹ پر تل تھا سنا ہے سر جی عورت کے ہونٹ پر تل ہوں مرد اس سے بہت محبت کرتے ہیں......ہیں جی......؟''

ستارہ مری ہوئی بھینس کے کٹے کی طرح منہ تھتھائے کھڑی تھی میں بھی رسہ تڑوا کر بھاگنے کے موڈ میں تھا لیکن اس نے ہم دونوں کو پکڑ رکھا تھا۔اپنے مظبوط ہاتھوں سے

''اس کی ماں کو بھی پہننے کھانے کا بہت شوق تھا سر جی......پاکستان سے پہلے کا ذکر ہے میری عمر بہت کم تھی اس وقت لیکن میں نے اس کی ماں کو دیکھا ہے کناٹ پیلس میں......میرٹ سوٹ سر جی......آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا ہوا پیروں میں سفید سویڈ کے کورٹ شوز......وکٹوریہ سے اتری تو سارا کناٹ پیلس ہل گیا......مہاراجہ بڑودا ہاتھی دانت کا صوفہ سیٹ خرید رہے تھے اس وقت......دو لاکھ روپے تک مول تول ہوا تھا اس وقت......صوفہ سیٹ تو کیا خریدتے......دو لاکھ اس کی ماں کو دیئے اور ساتھ بٹھا کر لے گئے اپنی رولز رائس میں......چن جی تیری ماں کی کیا بات تھی بٹیا......آفت تھی آفت......''

ہم دونوں برآمدے میں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''یہ تم مجھے اس کا چہرہ کیوں دکھا رہی تھیں اجتل؟''

''تو اور کیا اپنا چہرہ دکھاؤں سر جی؟...... ہیں نا کملے بادشاہو...... جوانی اتر جائے تو دوسروں کے ہی چہرے دکھانے پڑتے ہیں۔''

''تم اس کی ماں کا ذکر کیوں لے آئیں درمیان میں...... اسے کوفت ہو رہی تھی...... اسے کوفت ہو رہی تھی۔''

''جھوٹی ہے سب کو بتاتی پھرتی ہے کہ یہ کسی ڈاکٹر کی بیٹی ہے بڈھی ہو کر اس کی ماں نے ڈاکٹر کر لیا تو کیا یہ ڈاکٹر کی اولاد ہو گئی ہم سے کسی کا پیچھا چھپا ہے دو گلیاں ہم سے آگے گچھے والیوں کی گلی میں انکا چوبارہ تھا اب چاہے یہ گلبرگ رہے کالج جائے میم بن جائے ہم کو تو یاد ہے سب کچھ۔''

چاہے یاد ہو لیکن کسی کو یاد دلانے سے فائدہ؟ کوئی اپنا ماضی بھولنا چاہے تو تم اسے بھولنے نہیں دو گی...... ہے نا؟

ہم دونوں میرے دفتر کے اندر پہنچ گئے۔ اجتل نے برقعہ کا اوپر والا حصہ اتار کر کرسی کی پشت پر لٹکا دیا اور لمبی سانس بھر کر بولی۔

''بڑی مشکل ہے سر جی...... ہمارا دل بھی ہے ہم بھی انسان ہیں ہم سے شریف لوگ نفرت کرتے ہیں تو ہم برداشت کر لیتے ہیں لیکن ہم میں سے جب یہ لوگ اٹھ کر جاتی ہیں اور پھر ہم کو ذلیل سمجھتی ہیں تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا سفیدی کروا کر کوے سے کبوتر بن جائیں اور پھر کوؤں سے ہی نفرت کریں سبحان اللہ...... ہم تو پھر اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ انہیں یاد دلائیں کہ وہ بھی کبھی کوے تھے۔''

''اس بے چاری نے تمہیں کیا کہا تھا؟''

اجتل نے سگریٹ سلگا کر کہا...... ''بیچاری نہیں ہے موقع شناس ہے یہ بھی اس کی ماں بھی...... پچھلیوں کو بھولتے دیر نہیں لگی انہیں...... اس کی ماں نے کسی ڈاکٹر سے

نکاح پڑھوالیا ہے اپنی کشتی تو بچالی ہے لیکن گھر والے تو اجڑ گئے ان کے بوڑھے نانی اوراس کے مامے تو خوار ہو گئے سارے ...... ساری عمر جنبھائیوں نے اس کی ماں کی کمائی پر راج کیا نشہ پانی کیا اب وہ مزدوری ڈھونڈ نے نکلتے ہیں...... لعنت ہے ایسی نیکی پر...... ہم سے یہ نہیں ہو سکا۔اس لیے تو اپنی جنت تلاش کی پچھلوں کے دوزخ میں اس کے ساتھ بیٹھے ہیں۔''

''اگر تمہارے دل میں اتنا بغض ہے تو اس کی تعریف کیوں کر رہی تھیں؟۔''

''پتہ نہیں جی کیوں؟...... شاید مجھے منہ پر خوشامد کرنے کی عادت ہے یا شاید میں لوگوں سے ڈر جاتی ہوں؟''

بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ امتل کے متعلق پیش گوئی ناممکن ...... تھی کیونکہ وہ بچوں کی طرح کسی Sustained emotion کے قابل نہ تھی اس کا لڑنا جھگڑنا پیار محبت نفرت سب موڈ کے تابع تھے کسی تھیوری مسلک۔دباؤ کے تحت وہ کچھ نہ کرسکتی تھی۔وہ سب کچھ بغیر سوچے سمجھے کرتی تھی جی چاہا مدد کر دی دل میں آیا گالی دے دی۔کسی کو کھانا کھلا دیا۔نیا پرس عطا کر دیا کڑھا ہوا دوپٹہ اس کے کندھوں پر ڈال کر اس کا بوسیدہ دوپٹہ اپنے پر لے لیا۔کسی سے بیس روپے ادھار مانگ کر شکریہ بھی ادا نہ کیا۔مدد کرنے تحفہ دینے کسی کو الو بنانے تعیف کرنے کے لیے اس کا کوئی فلسفہ نہ تھا وہ لہر تھی گالی آئی گالی دے دی مدد کو جی چاہا مدد کر دی غیبت پر طبعیت مائل ہوئی تو سارے بخیے ادھیڑ دیئے خوش اور ہمدرد غالب آجاتی تو پاؤں پڑ جاتی معافی مانگ لیتی۔وہ وقت ضابطے اور طریقے کی پابند نہیں تھی اس کا سارا نظام Impulse پر چلتا تھا اسی لیے اس کی رائے پر چلنا مشکل تھا کیونکہ اس کی دوستی دشمنی نظریے سب منٹ کی سوئی کے تابع تھے۔کچھ بھی گھنٹوں دنوں سالوں پر محیط نہ تھا۔

''سر جی میں آپ کے لیے کلیجی پکا کر لائی ہوں۔''

''بھائی میں السر کا مریض ہو مدت ہوئی ایسی خوراک چھوڑ دی میں نے۔''

اسے مجھ میں السر میں چھوڑی ہوئی خوراک میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''فکر نہ کیا کریں پہلے السر ہوتے ہیں پھر پاگل ہو جاتا ہے آدمی...... چلیں قاضی کے پاس میرے سفارش کر دیں۔''

جس وقت میں اٹھ کھڑا ہو گیا وہ کسی واقف کار کا نمبر فون پر ملا بیٹھی...... امتل کو فون کرنے کا بہت چسکا تھا وہ ہمیشہ میز کی نکڑ پر چڑھ کر بیٹھ جاتی اور اپنی واقف کاروں کو انار کلی کے دوکان داروں کو ریلوے سٹیشن انکوائری پر پی آئی اے کارگو والوں کو فون کھڑکاتی رہتی فون پر اسے لوگوں کو مرعوب کر کے بڑا مزہ آتا تھا۔

''ہیلو...... ہیلو...... ہے لو...... کون جی...... میں امتل بول رہی ہو۔ ریڈیو سٹیشن سے...... جی آر ڈی صاحب کے دفتر سے......'' اس نے مجھے آنکھ ماری۔ ''کہاں باجی اب تو وقت ہی نہیں اب تو...... میں ضرور آتی...... لیکن ٹیلی ویژن والے چھوڑتے ہی نہیں...... میرا پروگرام ہے پرسوں شام سوا سات بجے ضرور دیکھیں۔ اچھا جی گڈ بائی۔''

''جب تمہیں ٹیلی ویژن کے پروگرام مل رہے ہیں تو ریڈیو سٹیشن والوں کے منتوں سے حاصل؟''

میں واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کس کافر کو ٹیلی ویژن سے پروگرام ملتا ہے۔''

''یہ تم اپنی ملنے والی کو کیا بتا رہی تھیں ابھی؟''

''اس چندری کا ٹیلی ویژن خراب ہے اسی لیے تو میں نے ذرا عزت بنا لی اپنی...... کیوں آپ کو کوئی اعتراض ہے۔''

''یہ سارا وقت تمہیں اپنی عزت بنانے کی فکر کیوں لگی رہتی ہے؟''

''تو ہم لوگ اور کیا بنائیں سر جی...... جن کے پاس عزت نہیں ہوتی وہ ساری عمر اسے ہی بنانے میں گنوا دیتے ہیں سچ پوچھیں سر جی تو ستارہ کی ماں اے بڑی عقلمندی

کی چلو دس بارہ سال مجھ جیسے کمینے اس کا پیچھا کریں گے پھر بیٹی تو سکھ کی زندگی گزارے گی...... نانی تو ویسے بھی مرکھپ جائے گی دو چار سالوں میں...... اچھا ہی کیا بازار چھوڑ دیا۔''

امتل کی آواز میں دکھ تھا جس درخت پر سارا دن دھوپ پڑتی ہے اس کے چکنے پتے چمکتے ہیں بچے اس میں جھولا ڈالیں عورتیں اس کے سائے تلے بیٹھیں شام پڑتے ہی ایسے درخت کے گرد اس کے اندھیروں میں بڑی اداسی ہو جاتی ہے ایسے ہی امتل تھی ہر وقت ہنسی مذاق۔ چکا چوند ادھر ادھر کی بے تکی باتیں جب وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتی تو اس کے ارد گرد بڑی مایوسی پھیل جاتی۔

''کیسی تھی ستارہ کی ماں...... شکلاً عقلاً؟......'' میں نے موضوع کو ہلکا کرنے کی خاطر کہا۔

''اچھی تھی...... اتنی خوبصورت بھی نہیں جتنی مرد مار تھی...... پیسہ زیادہ نہیں کمایا ہاں آدمی بہت ضائع کیا ٹوانوں کا ایک نوجوان زہر کھا گیا اس کے پیچھے...... چھ فٹ کا جوان تھا۔ اگلے دانتوں میں ایک پر سونے کا پترا چڑھا تھا جہلمی طرز کے پٹے تھے مسکرا پڑتا تو دل جلترنگ کی طرح بجنے لگتا۔ اس کے جنازے پر گئی تھی میں...... سر جی یہ کیا بات ہے کبھی کبھی مرد اپنی جان دے دیتے ہیں عزت کی دال روٹی نہیں دیتے۔؟''

''مردوں کے دینے کا بھی عجیب حساب ہے...... عجیب بادشاہ لوگ ہوتے ہیں مرد بھی۔''

''عزت کی دال روٹی میں بڑی بک بک ہوتی ہے امتل...... ساری عمر کا لیکھا جان کا حساب تو ایک بار نپٹایا جا سکتا ہے...... ایک جھٹکا اور دوسرے پار......''

''ہاں جی......'' اس نے لمبا سانس لے کر کہا۔

اس روز امتل بار بار بجھ رہی تھی جیسے کھلے میدان میں آگ جلنے کی کوشش پر بوندا

باندی ہو رہی ہو۔

''ابھی تم کہہ رہی تھیں اصل کی ستارہ کی ماں کو تم نے کناٹ پیلس میں دیکھا تھا۔ یہ کس سن کی بات ہے بھلا؟''

میں نے اس کا موڈ بدلنے کی غرض سے کہا۔

''سن چھیالیس کی جی...... مجھے اچھی طرح یاد ہے آگ لگنے کی وارداتیں عام تھیں ان دنوں۔''

''اس وقت تمہاری عمر چودہ برس کی تو ہوگی......'' میں نے ہنس کر کہا۔

''کھلی جی...... کھلی چودہ کی......''

''اس حساب سے تم بیالیس کی ہوئیں...... دیکھ لو پارٹیشن کو کتنے سال ہو چکے ہیں''

میرا خیال تھا کہ وہ جھگڑا کرے گی اور اس کا موڈ ہلکا ہو جائے گا۔ لیکن وہ خفیف ہو کر مسکرانے لگی اور بولی...... ''ایسے گھپلے تو ریڈیو سٹیشن پر عام ہوتے ہیں آرمی تھیٹر کے واقعات سناتا ہے خاموش فلموں کے شاٹ بیان کرتا ہے اور عمر اپنی تیس سال بتاتا ہے باتیں آل انڈیا ریڈیو کے زمانے کی کرتا ہے اور عمر پوچھو تو چالیس سے آگے نہیں جاتی سچی بات بتاؤں سر جی...... عمر تو سب کے منہ پر لکھی ہوتی ہے بالوں میں رنگی ہوتی ہے منوانے والے زیادتی کرتے ہیں مجھ سے تو جب کوئی عمر پوچھتا ہے مجھے لگتا ہے جیسے میں تھانے میں آ بیٹھی ہوں...... بھلا میری عمر اگر بیالیس کی ہے تو اس میں میرا کیا قصور......؟ ہوگئی سو ہوگئی۔''

بوندا باندی میں آگ پھر بجھ گئی۔

''فون کرنا ہو تو کر لو پھر قاضی کے پاس چلیں۔''

فون کا نام سن کر اس نے پی آئی اے کارگو سروس کا فون نمبر ملایا اور بولی...... ''ہیلو جی پی آئی اے کارگو......؟ میرا ایک پارسل آنا تھا کراچی سے......؟ باجی؟

......بڑا ضروری ہے جی......تبھی تو پوچھ رہی ہوں......جی میرا فون نمبر نوٹ کر لیں اور فوراً اطلاع دیں۔''

اس نے میرا فون نمبر دوسری طرف دے دیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو اختل ؟......یہ سرکاری فون ہے۔''

''جب کار گو والے پوچھیں تو رانگ نمبر کہہ دیں آپ اتنی سی تو بات ہے۔''

''چلو اب۔''

''سر جی آج آپ میرے ساتھ چلیں۔''

''چلو تیار ہوں میں۔''

''قاضی کے پاس نہیں میرے کرائے کے گھر۔انہوں نے مجھے چھ مہینے کا کرایہ نہیں دیا۔کوئی مرد وہاں جاتا نہیں۔وہ عورت سے کیوں ڈرنے لگے۔''

''تمہارے پانچ بھائی ہیں وہ نہیں جاتے کرایہ لینے۔''

''ناں جی۔وہ کیوں خجل خوار ہونے لگے۔وہ فیروزہ کی کمائی پر عیش کر رہے ہیں ان کو کیا پروا۔؟''

میں اس کے ساتھ دوبارہ جانا نہیں چاہتا تھا۔

''آپ کو کچھ کرنا کرانا نہیں ہے سر جی۔صرف میرے ساتھ چل پڑیں رعب پڑ جائے گا کرایہ داروں پر۔خدا قسم میرے پاس تو رکشا کو دینے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے اور بی بی تو ایک پائی بھی نہیں دیتی ہم جیسے بیکاروں کو۔''

پتہ نہیں اس میں کیا تھا؟ اس جلتی بجھتی آگ کے ساتھ میں نوگزے کی قبر کے پچھواڑے اس کے کرایہ داروں کے پاس چلا گیا۔

اختل کو اپنا سمجھنے کی صرف یہ وجہ تھی کہ شہر میں وہ اور میں بالکل تنہا تھے میں ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار تھا وہ میری ماں کی عمر کی تھی پھر اس کا اور میرا مسلک گدھ جاتی کا

تاہم دونوں مردار آرزوؤں پر پلے تھے ہم دونوں بجھے ہوئے کارتوس تھے اور اتفاقاً ایسے اکٹھے ہوئے تھے جیسے کورپس کرسٹی جیسی دور دراز جگہ میں اپنا ہم وطن ہم مشرب ہم زبان مل جائے ہمیں آپس میں بات کرنے کے لیے زیادہ اوڑھنے بچھونے، لگانے چھپانے، رکھ رکھاؤ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے اٹھارہ بیس سال سال بڑی تھی لیکن وقت بیوقت اس کے اندر ایک کھلنڈری سے بچی بھی جاگ اٹھتی وہ جو کچھ بھی کرتی تھی کہتی تھی میں اس کا کبھی برا نہ مناتا اور نہ ہی اپنی باتوں کی اسے کچھ سمجھ تھی اسے معلوم نہ تھا کہ روٹھا کیسے جاتا ہے اور کتنی دیر روٹھے رہنے میں عزت بنتی ہے اس کی باتوں میں لغت سچائی اور کمینہ پن تھا کبھی کبھی جیسے کھلی کھڑکی سے بارش کا ریلا اندر آ جائے وہ بڑی بے بس قسم کی گفتگو بھی کرنے لگتی۔ سچ وہ صرف اس لیے بولتی تھی کہ اب جھوٹ اور سچ اس کے نزدیک بالکل برابر ہو چکے تھے وہ اپنے جسم سے بے پروا عزت وشہرت سے بے نیاز روپے پیسے سے غنی تھی۔

امتل کا ایک چھوٹا سا گھر نوگزے کی قبر کے پچھواڑے بھی تھا یہ گھر بوسیدہ اور پرانا تھا اوپر والی منزل میں کرائے دار رہتے تھے نچلی منزل کے دو کمروں میں غفور درزی اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھا ہم دونوں جب یہاں پہنچے تو غفور درزی تیزی سے مشین چلا رہا تھا۔ امتل کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ غفور درزی کے چہرے پر اب صرف آنکھیں باقی تھیں باقی سارا چہرہ دقت، صبر اور غریبی کی نذر ہو چکا تھا۔

''آئیں ...... آئیں السلام علیکم صاحب جی''

''کیا آئیں ماسٹر جی ...... پھر آپ نے کرایے لے کر نہیں دیا۔''

ماسٹر غفور یوں خفیف ہو گیا جیسے وہ قصوروار ہو ...... ''بی بی جی ...... ان کے مرگ ہو گئی ہے میں پوچھا تھا دوبار۔''

''اور جب میری مرگ ہو گئی تب ...... تب کفن دفن کیسے ہوگا ...... کون خرچے کرے گا ...... کمیٹی والے ایل ایم سی کے ٹرک میں ڈال کر لے جائیں گے۔''

ماسٹر غفور کا نچڑا ہوا چہرہ اور بھی نچڑ گیا...... ''خدا نہ کرے......''

''خدا نہ کرے...... کیا نہ کرے خدا؟...... آپ کو کیا پتہ میرا گزارہ کیسے ہوتا ہے ...... میں بھوکی مر جاؤں آپ کو تو کرایہ داروں سے ہمدردی ہے۔''

ماسٹر غفور نے مشین کی ڈبیا میں سے دو سو روپے نکالے اور احتل کو لجاجت سے پیش کرتے ہوئے بولا...... ''آپ یہ لے جائیں میں خود ان سے وصول کر لوں گا۔''

احتل نے پیسے لیے اور شکریہ کر کے دوکان سے نکل آئی...... ''ماسٹر جی ان کو کہہ دیں اگر اگلے مہینے کرایہ نہ دیا تو میں انہیں نکالنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔''

''اچھا جی کہہ دوں گا۔''

''زور سے کہنا ماسٹر جی رعب سے من من من نہ کرنا......'' روپے لے کر ہم واپس احتل کے دو منزلہ مکان میں چلے گئے۔

احتل کا سارا روزگار یہ کرائے والا مکان تھا کھانا اور رہائش مفت تھی اور اوپر کے خرچے کے لیے یہی دو سو روپے ماہوار اس کا کفیل تھا اس وقت مجھے احتل کی بجائے درزی غفور پر ترس آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی بے چارگی اور شرم تھی جو آج تک میں نے کسی چہرے پر نہیں دیکھی۔

اس روز پھر بی بی نے پارٹی کے لیے پرتکلف چائے بھیجی۔ نئی چادریں اور غلاف آئے احتل نے بڑے وقار کے ساتھ پچاس روپے نوجوان بھائی کو پکڑا کر کہا...... ''بی بی کو دے دینا...... کہنا ریڈیو والے صاحب نے پان سگریٹ کے لیے بھیجے ہیں۔''

نوجوان کے جانے کے بعد میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھ کر کہا...... ''یہ کیا؟''

''آپ کی عزت بن جائے گی بی بی کی نظر میں آپ کا کیا جاتا ہے۔''

رہ رہ کر مجھے غفور درزی یاد آ رہا تھا اس کی مسکینی، حیا، کم آمیزی نے میرے دل پر عجیب اثر کیا تھا۔

''تم نے غفور درزی سے دو سو روپے کیوں لیے؟......اب بے چارہ کیا کرے گا۔''

''اسے خوشی ہوئی ہو گی''

''خوشی؟''

''یہ میری بڑی بہن کا عاشق تھا سر جی......پلومر کی دوکان نہیں اس کے پیچھے ایک تین منزلہ بلڈنگ ہوتی تھی......اس کی جائیداد تھی......وہ ساری بلڈنگ سارا کچھ بک بکا گیا......دھیلا دھیلا ہمارے گھر کی نظر ہوا۔ یہ جو ہمارا گھر ہے اسی نے بنوا کر دیا تھا......جب کچھ نہ رہا رو درزی بن گیا......میرے سارے کپڑے مفت سیتا ہے ایسے ایسے نمونے بناتا ہے ابھی کل ہی فیروزہ کا غرارہ سی کر لایا تھا سارے پھڑک گئے۔''

''تمہاری باجی کو بھی محبت تھی درزی غفور سے۔''

''وہ بڑی مشغول رہتی تھی سر جی......اسے اللہ نے جوانی میں اٹھا لیا سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملا......اگر برف کی بنی ہوتی تو پگھل جاتی ساری کی ساری......درزی غفور اسے ایسے دیکھتا تھا!

بڑی دیر تک وہ مجھے اپنی بہن کی طوفان آمیز زندگی کی باتیں بتاتی رہی درزی غفور کی داستان اس آندھی میں اڑنے والا ایک تنکا تھی۔ جب رات کے کھانے کا ڑے سج کر آیا تو اختل نے سارے ڈونگھے کھول کھول کر دیکھے سالن چکھے پھر نوجوان پر گرجی۔''

''گوشت کون لایا تھا آج۔''

''چاچا ابراہیم گیا تھا۔''

''اب چاچے کو کوئی قصائی سودا نہیں دیتا خود جایا کرو گوشت لینے آخر سارے خاندان نے کھانا ہوتا ہے۔''

آج احتل کی جیب میں پیسے تھے وہ شیرنی تھی۔ ویسے بھی میں نے اسے کھانے کے معاملے میں از حد محتاط پایا برا کھانا دیکھ کر فحش گالیاں بکنے لگتی قصائی، پکانے والا مرچ مسالا سب کی شامت آ جاتی۔ دال سبزی سے اسے نفرت تھی اسے گوشت مرغی مچھلی کا شوق تھا کھا پی لیتی تو پھر ڈھیر ہو جاتی سونے کا بھی اس کا عجیب ڈھنگ تھا صوفے پر نیند آئی تو وہاں ڈھیر ہو گئی۔ کرسی پر اونگھ آئی تو ملکہ وکٹوریہ کا بت کرسی پر خراٹے لینے لگا۔ پلنگ پر سوئی تو ایسے جیسے دلدل میں بھینس دم چھوڑے پڑی ہو۔

''سوئیں گے سر جی؟''

''نہیں اب میں چلوں گا۔''

''اچھا جی......'' کھانے کے بعد وہ بیٹھی نہ رہ سکتی تھی......آرام سے پلنگ پر روانہ ہو گئی

''آپ کے کون سے بیوی بچے روتے ہیں سو جائیں یہیں۔''

''نہیں چلتا ہوں احتل۔''

''کیا سوچ رہے ہیں آپ''

میں غفور درزی کی گلی میں پھر رہا تھا۔

''ایک لڑکی یاد آ رہی ہے......کالج میں پڑھتی تھی میرے ساتھ''

''پرانے وقتوں کو یاد نہیں کرتے سر جی......نئے دنوں میں گھن لگ جاتا ہے۔''

میں چپ ہو گیا، وہ ہنسنے لگی اس کی ہنسی میں کوئی چیز تھی جو بکھرنے کی طرف مائل تھی۔

''سر جی ہر انسان کے انجن چلانے کے لیے خاص کا پٹرول چاہیے جب تک یہ پٹرول گاڑی میں ہو گا گاڑی چلتی ہے انسان کا سلف چاہے چلے نہ چلے دھکے دے کر گاڑی چل پڑتی ہے کنڈم نہیں ہوتی۔''

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ تکیے پر سر ٹکائے اس پر اپنا سر جمائے نیم درازی تھی ...... ''عورت کا ایندھن مامتا ہے صبر ہے آنسو ہے جب تک شہد کی روکتی ہے جیتی رہتی ہے۔''

''اور مرد؟''

''مرد کے اندر کام کا پیٹرول چلتا ہے کامنا ہو یا کام رہے تو اس کا سلف چاہے بیکار ہو جائے چلتا رہے گا...... عجیب بات ہے اب کبھی میں روتی نہیں ...... آنسو ہی نہیں آتے...... کبھی کبھی خیال آتا ہے یہ میرے آخری دن نہ ہوں۔''

اس کی خشک آنکھوں میں خشک آنسو تھے۔

''''درزی غفور جیسا کوئی ہنر آتا تو رزق حلال ہی کھاتی اب تو سارا جسم بوجھ بنا رہتا ہے دل پر...... کہاں سے اتنا ایندھن لاؤں اس کا دوزخ بھرنے کو...... کبھی ماں کو بیوقوف بناتی ہوں کبھی فیروزہ کو لیکن کب تک۔ یہ حرام رزق کب تک؟

''میرے پاس اس وقت ڈیڑھ سو روپیہ ہے امتل ......'' میں نے لجاجت سے اس کے تکیے پر پیسے رکھ کر کہا۔

''ناں سرجی...... ابھی نہیں ابھی ہیں میرے پاس یہ دیکھئے۔''

''رکھ لو امتل کام آئیں گے۔''

وہ ہنس دی ...... ''ابھی تھوڑی دیر کے لیے میں نیک بننے لگی تھی شکریہ سرجی ...... میرے لہو میں تو ایک بوند بھی حلال کی نہیں ...... مجھے ڈر کیسا۔''

پیسے لے کر اس نے اپنی باڈس میں ڈال لیے اور میرے طرف کمر کر لی جس وقت میں اس کے کمرے سے نکلا مجھے شبہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔

امتل سے میرا رابطہ کچھ کچھ عجیب نوعیت کا تھا آہستہ آہستہ اکے پرو تلے گھستا چلا جا رہا تھا وہ ایسی ماں تھی جو ساونپی کی طرح جھولی میں لاتعداد بچے کھا چکی ہو تجربات کا دکھ سکھ دل پر اسی وقت آری کٹاری بنتا ہے جب یہ کبھی کبھی وارد ہوں۔ وہ اتنے

سارے دکھ سکھ سے گزر چکی تھی کہ اب ڈاکٹروں کی طرح مریضوں کے وارڈوں میں پھرتے ہوئے اسے اختلاج قلب نہ ہوتا تھا۔ اسلم کے ساتھ رہنے میں ایک خاص آرام یہ تھا وہ کچھ نہ مانگتی تھی نہ جسمانی تعلق نہ روحانی محبت نہ روپیہ پیسہ نہ شہرت نہ تعریف ...... جس طرح پچانوے فی صد شادی شدہ مرد اپنی محبوبہ سے دل کا ٹیلیفون ملا کر بیوی سے مباشرت کرتے ہیں

ایسے ہی اسلم بالکل لاتعلقہ کے ساتھ میرے ساتھ وقت گزارتی تھی اسے غالبا میرا بالکل شوق نہ تھا کیونکہ وہ مجھ سے بھی پرانا گدھ تھی ہم دونوں زیادہ وقت ساتھ ساتھ تو ضرور گزارتے تھے لیکن جس طرح جوتے کے پیر الگ الگ ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں ایک نوعیت سے یہ رشتہ پہلے رشتوں سے بھی زیادہ بانجھ تھا اسی لیے فریقین کو جذباتی ذہنی کوئی نکھار بھی حاصل نہ ہوا۔ اسلم وہ لاش تھی جو مدتوں بیماریاں جھیلنے کے بعد مری تھی اس کا گوشت انسانی نہیں تھا ایک طرح کا سنتھٹیک فایبر تھا جس کے ہر مردہ جرثومہ میں بے جان غیر نامی دوائیوں کا سٹور ہاؤس تھا۔

اسلم سے جب میری ملاقات ہوئی میں ذہنی جسمانی جذباتی طور پر بہت الجھا ہوا تھا میرا دل بلال گنج کی ایسی دوکانوں سے مشابہہ تھا جہاں ہر طرف پرانا لوہا بکھرا ہوتا ہے۔ کاروں کی پرانی باڈیاں لوہے کی الماریاں، پہیئے۔سریے۔نٹ بولٹ، گراریاں، پانے سپلوک ...... ہر طرف چیزوں کا انبار لیکن تالے نہیں تھے نہ اپنے نہ پرائے بارش جھکڑ آندھی میں یہ سامان باہر صرف اس امید پر پڑا رہتا کہ کبھی شہر والوں کو کسی پرانے پرزے کی ضرورت ہوگی تو وہ اسے یہاں سے خرید کر اپنی نئی کار موٹر سائیکل یا پرنٹنگ مشین میں لگالیں گے۔

اسلم سے ملنے کے بعد میں پہلے سے کم تھو کنے لگا تھا۔ اسلت کی تکلیف گو کبھی کبھی بہت بڑھ جاتی اور جلن کا یہ عالم ہوتا کہ ہتھیلیاں بھیگ جاتی لیکن ذہنی طور پر میں سوسائٹی سے ابھی کٹا نہ تھا اور اپنی نوکری پر جانے کے قابل تھا Withdrawal کے

لمحے عموماً راتوں کو آتے جب میں چلتا چلتا عابدہ اور سیمی سے گزرتا گزرتا چندرا میں جا کر وہاں کی گلیوں میں گھومنے لگتا اچھی یادیں یا تو کبھی مجھ سے وابستہ نہ ہو سکی تھیں یا ان کا تاثر گہرا نہ تھا اس لیے یادوں کی ٹوٹنی جب بھی کھلتی اس میں سے کھولتا پانی نکلتا محرومیوں کی داستان حلقہ پوری کوشش رہتی کہ میں اپنا وقت یا تو کارآمد کاموں میں گزاروں یا پھر احتل کی صحبت میں، جس کے ساتھ وقت نہ بیکار تھا نہ کارآمد صرف گزرتا چلا جاتا تھا۔

مرد اور عورت کے رابطے کئی بار خود ان کی سمجھ میں نہیں آتے اور سارا شہر ان کی نوعیت سے واقف ہو جاتا ہے...... ڈاکٹر سہیل کے بعد شہر میں میرا کوئی دوست نہیں تھا ریڈیو سٹیشن پر جن پروڈیوسروں سے صاحب سلامت تھی وہ گہری نہ تھی دفتر میں گپ شپ رہتی لیکن شام کو علیحدہ ہو کر ایک قسم کا سکوم ملتا۔ پتہ نہیں احتل کے ساتھ میرے رشتے کی کس نے ہوائی چلائی تھی کیونکہ ہم دونوں ریڈیو میں بہت کم ملتے تھے اور میرے گھر وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ اس روز میں سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ آنگن میں مجھے صولت بھابھی ملیں یہ ان غمگین صورت عورتوں میں سے تھیں جنہوں نے شادی کی کاٹھی کو بہت سختی سے اپنی پیٹھ پر فٹ کر لیا ہوتا ہے صولت بھابھی اب ہررت اور حالات کے مطابق بھاگی چلی جا رہی تھیں ان کی چال بدل جاتی کبھی دلکی کبھی پویہ کبھی سرپٹ ...... لیکن پیٹھ سے کاٹھی اتار کر ستانے کا کوئی لمحہ نہ آتا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے ایسے بات کرتیں جیسے نامحرموں سے کی جاتی ہے نگاہیں جھکا کر...... آواز میں سختی پیدا کر کے...... بار بار کھانس کر۔

''قیوم......'' انہوں نے ستون کو مخاطب کر کے کہا۔

''جی؟''

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''کہیے؟''

''یہاں نہیں اندر چلو...... یہاں بچے ہیں''

بڑی دیر کے بعد مجھے یاجوج ماجوج نظر آئے وہ ایک ہی رنگ کی بس سرٹیں اور ایک جیسی لکیر دار نیکریں پہنے انجن بنے آنگن میں چکر لگا رہے تھے پہلی بار مجھے افسوس ہوا کہ اتنی دیر میں ان سے واقفیت پیدا کرنے کی بھی میں نے کبھی کوشش نہیں کی

ہم دونوں اندر چلے گئے۔

میں مودب بھائی مختار کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

''جی۔''

بھابھی کھڑی رہیں، وہ بات کرتے ہی بھاگ جانا چاہتی تھیں۔

''شکر ہے کہ تم باقعدگی سے نوکری کر رہے ہو...... رزق حلال کمانا مرد کا فرض ہے۔''

میں چپ رہا۔

''تمہارے بھائی تمہاری صحت کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔''

''میں نے بھابھی کو بھرپور نظروں سے دیکھنا چاہا لیکن وہ چھت کو دیکھ رہی تھیں''

''آخر وہ تمہارے بھائی ہیں...... وہ سارا دن تمہارے متعلق سوچتے ہیں۔''

''میں ٹھیک ہوں بالکل......'' پتہ نہیں کیوں اس وقت میرا رونے کو جی چاہا۔

''کہاں ٹھیک ہو۔ کبھی شیو کرتے وقت اپنا چہرہ دیکھ لیا کرو ڈر آتا ہے ہاتھ دیکھو کیسی نسیں ابھری ہوئی ہیں اور تو اور اس عمر میں سفید بال آگئے ہیں تمہارے۔'' میں نے حیرانی سے بھابھی کی طرف دیکھا۔ وہ میرے متعلق اتنا سب کچھ کیسے جانتی تھیں وہ اب کرسی کی بید پر نظریں جمائیں ہوئے تھیں۔

''تم کو کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہیئے جلد از جلد''

''ملا تھا جی...... دوائیاں پیتا ہوں باقاعدگی سے''

صولت بھابھی کا رنگ آہستہ آہستہ گلابی ہونے لگا

''تمہارے بھائی تم سے بات نہیں کر سکتے اس سلسلے میں......لیکن یہی کافی نہیں صرف ڈاکٹر ہی۔''

''جی......؟ ارشاد؟......''

''سنا ہے وہاں ریڈیو پر کوئی چکر چل رہا ہے رمھارا......کسی بوڑھی عورت کے ساتھ!''

میں سناٹے میں آ گیا

''ایسے چکروں سے بچنا چاہیئے۔ آدمی ایک بار پھنس جائے تو پھر نکل نہیں سکتا ویسے ادھوالیوں کو پھنسانے کے خوب طریقے آتے ہیں۔''

میری آنکھوں میں احتل کی شکل گھوم گئی معصومیت حمق اور قلب کی صفائی کا ایک کوندا لپک گیا۔ اس احمق نے تو آج تک مجھ سے سگریٹ پان کے پیسے نہ لیے تھے اسے کسی کو پھانسنے اور خود پھنس جانے سے قطعی کوئی دل چسپی نہ تھی۔

''کچھ خاندان کی عزت کا ہی خیال کیا ہوتا تم نے......'' بہت آہستہ دبی ہوئی آواز میں صولت بھابھی نے کہا۔

اب یقیناً یہ مشن ان کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔

چندرا گاؤں میں جس روز چاچا غلام نے عزیز گائن کی بے عزتی کی اور وہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اسی روز کے بعد میں نے پھر کبھی عزت کے متعلق نہ سوچا تھا۔

بھابھی صولت جیسے ابھی بھاگنے والی تھی اس نے آخر حملہ کیا......''نوکری کر لی ہے......تو اب شادی بھی کر لو......جگہ جگہ حرام کھانے سے حاصل؟......شادی حلال چیزیں میں سب سے افضل ہے۔''

میں نے اس دیندار عورت کی طرف نگاہ ڈالی۔

''عابدہ کی بہن کا رشتہ آیا ہوا ہے کہو تو طے کر دوں''

یہ کہہ کر بھابھی رسہ تڑوا کر باہر بھاگ گئی۔

میں نے بھابھی کو پکڑ کر کہنا چاہا...... بھابھی کچھ لوگ معاشرے کے قابل نہیں ہوتے۔ معاشرے کے مطابق نہیں رہتے جیسے کچھ جانور جنگل میں رہ کر جنگل لاء کے تحت زندگی بسر نہیں کرتے ایسے لوگوں کو محبت کی تلاش ہوتی ہے۔ لیکن وہ محبت کے اہل نہیں ہوتے شادی کی نہ انہیں خواہش ہوتی ہے نہ ضرورت...... بھابھی تم ہمیں کرگس جاتی کے لوگوں کو حلال کھانے پر کیوں مجبور کر رہی ہو...... ہم تم جنم جنم سے مردار پر پلے ہیں ہمیں حلال سے کیا غرض؟

جب میں آنگن میں پہنچا تو مسعود اور فرید ایک ہی رنگ کے شلوار قمیصیں پہلے گیلے بالوں میں کنگھیاں پھیر رہے تھے۔

پتہ نہیں کیوں اس روز بڑے دنوں بعد مجھے خیال آیا کہ چندرا چلا جاؤں اور اپنی آبائی کلر شدہ زمین آباد کرنے کی کوشش کروں؟ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے علم تھا کہ وہاں پہنچ کر بھی کوئی بندھی ٹکی محنت نہیں کر سکوں گا...... میرا دل کسی ایک دریا میں رہنے کے قابل نہ تھا۔

جس وقت میں دفتر پہنچا قاضی اور امتل دونوں میرے کمرے میں بیٹھے تھے، اور سگرٹوں کے دھوئیں سے فضا نیلی نیلی ہر رہی تھی امتل حسب عادت بغیر غسل کیے صرف چہرے کا میک اپ درست کر کے آئی تھی اس نے کنگھی بھی صرف گردن تک پھیر رکھی تھی باقی سارے الجھاؤ وائم تھے برقعے کا نقاب کرسی سے لٹک رہا تھا اور کوٹ اس کے جسم پر ایسے پھنسا ہوا تھا کہ تمام بٹن کھلنے ہی والے تھے۔

''لیجیے سر جی میں ان قاضی صاحب کو پکڑ لائی ہو اب آپ میری سفارش کر دیں ان سے''

''بھائی اسے کوئی پروگرام وغیرہ دے دیا کرو ورنہ یہ مجھے قتل کر دے گی۔''

''ہائے یہ سفارش ہے'' امتل نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اور کیسی ہوتی ہے سفارش؟''

''رعب سے کہتے ہیں کہ یہ میری رشتہ دار ہے دس سال سے ہمارے تعلقات ہیں ان کا کام نہ کیا تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا۔''

میں اس روز موڈ میں نہ تھا قاضی بونگا بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

''جو کچھ یہ کہہ رہی ہے اس کے مطابق کر دو...... یار......''

''اب تم نئے پروڈیوسر سے ان کی سفارش کرنا میری تو تبدیلی ہو گئی ہے...... حیدر آباد کی''

''کب؟''

''آج ہی آرڈر آئے ہیں'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اپنے آپ سے پیچھا چھڑا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا...... ''تم تبدیلی سے خوش نہیں ہو۔''

''لاہور چھوٹتا ہے لاہور کے ساتھ اور بہت کچھ چھوٹتا ہے......'' قاضی کی آواز بھرا گئی

''کوئی سفارش لگوائی ہوتی''

''حیدر آباد نے جو لگوائی ہے''

''آپ کا کوئی قصور نہیں سر جی...... میری قسمت ہی ماڑی ہے جس پروڈیوسر سے واقفیت ہو جاتی ہے اس کی تبدیلی ہو جاتی ہے...... اللہ کو منظور ہی نہیں کہ احتل کوئی پروگرام کرے اب اس ڈاڈے کے ساتھ کون لڑے۔''

قاضی سلا دعا کیے بغیر عاشق صورت رخصت ہو گیا۔

''اچھے آدمی تھے قاضی صاحب...... ہے نا سر جی......؟''

میں کافی دیر چپ رہا۔

''شادی کیسی چیز ہے احتل...... کبھی تمہیں اس سے پالا پڑا؟''

''ہاں جی کی تھی شادی میں نے بھی ...... اس کا پھاہا بھی ڈالا تھا گلے میں''

''بچے؟''

''ایک لڑکا ہوا تھا سر جی ...... لیکن ...... اس کا بھی دماغ ٹھیک نہیں ...... ہم جیسیوں کے ایسے ہی بچے ہوتے ہیں سر جی۔''

''کیا؟''

''ساری عمر حرام کھانا ...... ہم لوگ حلال کی اولاد کہاں سے پیدا کریں گی جی؟ میرے بیٹے کا بھی دماغ ٹھیک نہیں ...... تین بار مینٹل ہسپتال رہ آیا ہے۔ اس کے باپ کا خیال ٹھیک ہے ساری وجہ میری ہے نہ میں حرام رزق پر پلتی نہ میرا بیٹا ایسا ہوتا۔''

وہ بہت دکھی ہو گئی۔

''یہ پرانی باتیں ہیں۔''

''ہاں جی میں تو پرانی پر ٹھیک ہیں''

ہم دونوں چپ ہو گئے

''کہاں رہتا ہے تمہارا بیٹا''

''اسی کے پاس ہے جی اب تو جواب ہو گیا ہے۔ بڑا گبرو ہے شکل سے تو نہیں لگتا کہ دماغ ٹھیک نہیں۔''

''تمہیں ملتا ہے احتل''

''ناں جی ...... مجھے مل کر کیا کرے گا ...... میں اسے کیا دے سکتی ہوں باپ نے تو ساری بلڈنگ اس کے نام کرائی ہے۔''

''پھر ایسے اچھے شوہر کو چھوڑا کیوں؟''

بھابھی صولت نے میرے دماغ میں ایک نیا ایٹم بم چھوڑ دیا تھا۔

''چھوڑا کیوں اسے احتل''

''بس سر جی نبھی نہیں''

''پر کیوں وجہ کیا تھی؟''میں نے اصرار کیا

''میں مڈل کلاس کی طوائف تھی سر جی ...... اس چندری کپتی کو محبت درکار ہوتی ہے۔ لیکن عزت زیادہ پیاری ہوتی ہے ...... اگر اسے صرف محبت درکار ہو ناں تو وہ ہمارے ہاں بہت لیکن یہ حریص چاہتی ہے جو بیاہ کر لے جائے وہ محبت کرے دوہرا پنگا ادھر وہ بھی کم بخت مڈل کلاس کا آدمی تھا۔ بھلا بتایئے نباہ کیسے ہوتا ...... عشق کے لیے نہ مڈل کلاس کا مرد بنا ہے نہ عورت ...... ایک ڈرپوک دوسرا تھوڑدلا ...... بتایئے ان کا عشق کتنے دن چلتا؟''

''تھوڑدلا مرد کیسا ہوتا ہے اختل''

''تھوڑدلے مرد کی ایک نشانی ہے صاحب جی۔ وہ عورت کو ضرورت کی ہر چیز لا دیتا ہے لیکن عیاشی کا کوئی سامان نہیں کرتا۔ زیور کپڑا سینما، پھول تعریف سب اس کے لیے بیکار چیزیں ہوتی ہیں۔''

''میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں۔''

''سر جی ...... یہ جو تھوڑدلا مرد ہوتا ہے ناں وہ روٹی کپڑا مکان دیتا ہے ...... جنس دیتا ہے ...... کیونکہ یہ ضرورت کی چیزیں ہیں لیکن وہ بیوی پر محبت ضائع نہیں کرتا تعریف برباد نہیں کرتا ...... لاڈ پیار سے خراب نہیں کرتا ...... مثلاً ...... تھوڑدلا مرد اگر سوٹ سلا دے گا تو اس پر کڑھائی کو اسراف سمجھے گا زیور اگر اپنی عزت کی خاطر بنوا بھی دے تو زیور کبھی جڑاؤ نہیں ہوتا شاعری کی کتاب کبھی خرید کر گھر نہیں لائے گا ...... نیک بیبیوں کو نیک مشورے قسم کی کتابیں لا کر دے گا گھر میں ...... تھوڑدلے مرد سے اللہ بچائے ...... بھڑوے کو یہ علم نہیں ہوتا کہ عورت کا اندت ہی ایسا بنا ہے کہ وہ روٹی کے بغیر تو زندہ رہ سکتی ہے عیاشی کے بغیر نہ زیبائش کے بغیر کملانے لگتی ہے۔''

''کبھی تم نے سوچا اختل کہ شادی کے بعد محبت نبھتی کیوں نہیں؟ ...... وہی جو ایک

دوسرے پر مر مٹنے کو تیار ہوتے ہیں دشمن کیوں بن جاتے ہیں ایک دوسرے کے؟"

اس نے ناک میں انگلی ڈالی اور کھجلا کر بولی...... "بات یہ ہے سر جی کہ جب محبت مل رہی ہوتی ہے تو سمجھ نہیں آتی کہ کبھی محبت دینی بھی پڑے گی...... شادی ہوئی قربانی ساری کی ساری...... گاٹا اتر وانا پڑتا ہے چاہے من کا چاہے تن کا۔"

"تمہیں اس سے اصلی گلہ کیا تھا اختل اب تک تو تم کسی نتیجے پر پہنچ چکی ہو گی۔"

"اس کا بھی قصور نہیں تھا کچھ ایسا...... بس سر جی اس کا دل چاہتا تھا کہ میں شریف عورتوں کی طرح بھانڈے مانجھ کر بچے پال کر بڑوں کی عزت کر کے چھوٹوں کی گستاخیاں سہہ کر اس کے گھر میں گزارہ کروں اور ثابت کروں سب پر کہ بازار والیاں شرافت میں کسی سے کم نہیں ہوتیں۔ چونکہ میں شریف تھی اس لیے مجھے ڈراموں سے نفرت تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میاں اتنے لوہے کے چنے چبا کر جو تیرے گھر والوں کو قائل بھی کر لیا اپنی شرافت کا تو مجھے کیا حاصل ہو گا...... دراصل سر جی مجھے اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی عادت نہیں تھی میرا مزاج ہی نہیں تھا نوکرانی کا...... بڑی تو تو میں میں ہوا کرتی تھی۔"

"کس بات پر اختل؟"

"خاص بات کوئی نہیں ہوتی سر جی میاں بیوی میں تو تو میں میں کی...... بس باسی ہانڈی میں بڑ بڑ ہوتی رہتی ہے کچھ لوگ بڑی چھٹی مت کے ہوتے ہیں پہلے تتلی پر مرتے پر مرتے ہیں اسے پکڑنے کے جتن کرتے ہیں جب پکڑ لیتے ہیں تو پھر اسے شہد کی مکھی بنانے پر تل جاتے ہیں" وہ جہاندیدہ فلسفی جیسی باتیں کرنے لگی۔

اختل بڑی دیر تک تاسف کے انداز میں سر ہلاتی رہی۔

"کیا ہوا اختل؟"

"اپنا نقشہ یاد آ رہا ہے سر جی...... چہرے پر چھائیاں، کھردرے ہاتھ بوائیاں پھٹی ہوئی ہونٹوں پر لکیریں۔...... یہ سب کس لیے کہ کچھ گمنام سے لوگ کہیں کہ آئی

تو بازار سے ہے لیکن شریفوں کو مات کر دیا...... ہٹ تیری! اتنی سی تعریف سننے کے لیے آدمی ساری عمر تلاش بنا رہے نہ زردہ ڈال کر پان کھائے نہ سر میں مہندی لگائے نہ نقلی باڈیں پہنے......اور سنے کیا ہر وقت بازار سے بھاگ کر آئی ہے...... ہیرا منڈی سے اٹھ کر آئی ہے...... چلو جو یہ سننے میں آئے کہ بازار کا لفظ کبھی نہیں بھولتا۔ تعریف بھی کریں گے تو آپ کی اوقات آپ کو یاد دلا کر...... سر جی خود انصاف کریں جب بازار کا لفظ پیچھے سے اترتا ہی نہیں تو وہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے سے فائدہ؟"

"تمہیں وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔"

سگریٹ کا لمبا کش لگا کر وہ بولی...... "لگتا تھا جی...... کبھی کبھی تو بہت لگتا تھا پر وہ سارا وقت مجھے ماڈل عورت بنا کر خاندان کے سامنے پیش کرنے میں لگا رہتا تھا ...... بیچارا! ہائے ہائے اس نے بھی بڑے دکھ اٹھائے۔ لیکن کیا کرتی سر جیا سے میری کمزوریوں غموں، غلطیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یا یوں سمجھیے آپ کہ وہ معاف کرنا نہیں جانتا تھا۔ ہر جگہ ہر محفل میں ہر وقت اسے ایک ہی شو مارنی آتی تھی کہ دیکھو میں کتنا نیک ہوں میری وجہ سے ایک بازاری عورت تائب ہوئی ہے اسے میرے تائب ہونے کی خوشی نہ تھی اپنا دب اونچا کرنے کی فکر تھی ہر وقت...... چلیے سر جی محبت کی خاطر تو آدمی سولی پر چڑھتا رہے مرتا رہے کھپتا رہے پر کسی کی انا کو موٹا کرنے کے لیے کوئی کب تک اپنی جان مارے؟"

"اسے......اسے تو پیار ہو گا تم سے اختل؟ جس نے معاشرے سے ٹکر لی گھر والوں کے سامنے کھڑا ہوا......اسے پیار تو ہو گا تم سے۔"

سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر وہ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر بولی...... "تھا جی پیار......تھا کیوں نہیں پر پولا پولا پیار تھا۔"

"پولا پولا پیار کیسا ہوتا ہے اختل؟......" میں نے سوال کیا۔

"ایسا پیار جی جیسی بودی رسی ہوتی ہے زور سے کچھ باندھو تو تڑک کر کے ٹوٹ

جاتی ہے ایسا پیار جس کا یقین سب کرواتے پھریں اور خود اپنے جی کو کبھی یقین نہ آئے ایسا پیار سر جی ٹھبڈی چاہئے اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا اس کی دوکان تھی انار کلی میں کپڑے کی...... ماں تھی نہیں تھیں ایک پچھلی منگیتر تھی ایک شادی کے بعد کی محبوبہ تھی اتنی لمبی چوڑی ذات برداری کی عورتیں تھیں جو آدمی اتنی عورتوں میں بٹا رہے وہ بیچارہ بھی خالی ہو جاتا ہے اس کی زندگی ساری حصہ پتی میں گزرتی تھی۔ ادھر مجھے عادت نہیں تھی بٹے کے سوالوں کی...... ہم بچپن سے مرد کے جسم دل روح پر سوار ہونا سیکھتی ہیں ہم جب بھی کسی کو پکڑیں مضبوطی سے پکڑتی ہیں...... پولے پولے]یار سے مجھے نفرت تھی سر جی۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر آپی بولنے لگی...... "ہمارے ہاں رواج ہے کہ مرد کو قابو کریں تو پھر ایسا کہ وہ...... اس کی ساری جائیداد بک جائے اور وہ ہمدردی چوکھٹ پر بیٹھ کر ساری عمر چلمیں بھرتا رہے غفور درزی کی طرح...... اس کی بیوی ساری عمر مزاروں پر بھٹکتی پھرے۔ بچے یتیموں کی طرح پھریں...... سر جی ویسے ہر انسان کا جی چاہتا ہے ناں کہ اس کے چاہنے والے کا لکھ نہ رہے ہر انسان کے اندر رب جو ہوا سر جی...... رب اپنے چاہنے والوں کا کچھ رہنے دیتا ہے کبھی؟ سوائے اپنے۔"

"ہر ایک کا نہیں امتل...... کسی کسی کا......" میں نے لمبی آہ بھر کر کہا۔

"ناں سر جی ہر مرد کا ہر عورت کا...... ہر انسان کے اندر رب چاہتا ہے کہ کوئی اسے ٹوٹ کر چاہے اس کی پرستش کرے...... بیوی بچوں والا ہو تو بیوی بچے چھوڑ دے...... دولت مند ہو تو مانگتا پھرے کسی بیاہی ہوئی عورت سے پیار ہو تو عاشق چاہے گا کہ آدھی رات کو شوہر کے پہلو سے اٹھ کر آئے...... نیک نام ہو تو بدنامی کے کنوئیں میں اترے۔"

"تھیں سر جی......" وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

''کیوں؟......''

''بس اٹھیں مجھے ایک کام یاد آ گیا۔''

میں احتل سے بھابھی صولت کی بات کرنے والا تھا لیکن اس وقت اس کی آواز میں کچھ ایسی تیزی تھی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے آج بہت کام ہیں احتل...... ایک ریہرسل ہے ایک رہکارڈنگ ہے پھر کالمسٹ کو میں خاص...... بلوا رکھا ہے۔''

''آپ چلیں تو سہی...... جلدی آ جائیں گے۔''

پہلے وہ میرے کمرے سے رخصت ہوئی دس پندرہ منٹ کے بعد میں نکلا ریڈیو سٹیشن کے باہر وہ میرا انتظار کر رہی تھی سڑک پر پہنچ کر وہ میری موٹر سائیکل پر سوار ہو گئی چلتی سواری کے شور میں میں نے اسے کہا ''تم وہاں سے میرے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟''

''کچھ پردہ رکھنا پڑتا ہے......'' موٹر سائیکل کی فلا بلاسٹ آواز پر غالب آ کر وہ بولی۔

میں نے اسے بتانا چاہا کہ احتیاط کے باوجود خوشبو کی مانند ہوتی ہیں جہاں کہیں ہوا جاتی ہے انہیں ساتھ لیے جاتی ہے...... بھابھی صولت کو اس وقت سانده کلاں میں معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

دینی اعتبار سے بھی احتل بڑی رنگا رنگ تھی۔

اسکے گھر میں مجلسیں ہوئی تھیں اور وہ بڑی دھوم دھام سے محرم مناتی تھی۔ عاشورے کے دوران اس کے تن سے کبھی سیاہ کپڑا نہیں اترا پنج تن پر جان نثار کرتی تھی بی بی فاطمہ کے گھرانے کی عاشق تھی اس کے دو منزل مکان میں محرم کے دنوں میں مجلسوں کا زور شور سے انتظار رہتا تھا اور وہ ایسے ایسے مرثیہ پڑھنے والے حاضر کر

لیتی جو ساری محفل کو رلائے بغیر نہ رہتے شعیہ رجحانات کے باوصف وہ لاہور کی تمام درگاہوں پر باقاعدگی سے جاتی تھی۔ حسین زنجانی میاں میر صاحب بابا شاہ جمال اور داتا صاحب کے قدموں میں جانا تو اس کا معمول تھا کرسمس کی رات کو وہ بڑی خوش ہوتی اور اکیلی کرسمس مناتی اس نے مجھے بتایا تھا کہ قیام پاکستان سے پہلے وہ بڑے خوش سے دیوالی کے دن گھر کی منڈیر پر دیئے بھی جلاتی تھی اور اس نے ایک مرتبہ ایک ہندو برنس مین کو راکھی بھی باندھی تھی۔

جس وقت ہم دونوں لارنس باغ میں داخل ہوئے میرا دل دھک سے رہ گیا میرا خیال نہیں نہیں تھا کہ وہ مجھے باغ جناح لے جائے گی...... اس باغ میں ایک کافور کا درخت تھا اور اس درخت کی چھاؤں سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

''بس سر جی یہاں اترتے ہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے مجھے آج بہت کام ہے...... میں باغوں کی سیر کو نہیں نکل سکتا''

''میں آپ کو باغ میں نہیں لے جا رہی سر جی...... وہ دیکھئے بابا ترت مراد کا مزار۔ بس یہاں حاضری دیں گے اور لوٹ جائیں گے...... بس دس منٹ......''

ہم barrier کے پاس موٹر سائیکل پارک کر کے مزار کی طرف چلنے لگے مزار کی جانب سے قوالوں نے ہارمونیم کے سر اٹھانے شروع کر دیے تھے...... میں چپ تھا اندر باہر...... اجتل سے مل کر میں نے سیمی کی یادوں کو قفل لگا کر کولڈ سٹورج میں رکھ دیا تھا۔

''بہت چپ ہیں آپ سر جی؟۔''

''ہاں کچھ کچھ۔''

پتہ نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ اجتل کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر رونے لگوں؟ لیکن رونے کی بھی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔

''اس عورت کو دیکھ کر چپ لگی ہے؟......'' اجتل نے سوال کیا۔

''کون سی عورت۔''

''وہ......؟......''

میں نے سامنے دیکھا ایک جوان عورت ہاتھ اٹھائے مزار کی دیوار سے لگی، دعا مانگ رہی تھی اس نے ریشم کا کرتا پہن رکھا تھا اور مخالف رخ کی ہوا کے باعث وہ مڑی ہوئی شاخ جیسی لچکیلی نظر آ رہی تھی۔

''کیسی ہے؟......'' اجتل نے پوچھا۔

''کسی بوڑھے مرد کی بیوی ہے جوان عاشق سے ملنے کی دعا منگ رہی ہے۔''

''ناں جی......جوان آدمی کی محبوبہ ہے اور دعا مانگ رہی ہے کہ شادی ہو جائے اس سے''

''شادی شدہ تو نہیں لگتی......'' میں نے کہا۔

''لیکن ہے......ورنہ پیٹ ایسا نہ ہوتا''

''اگر شادی شدہ ہے تو پھر......بیٹے کی دعا منگ رہی ہے''

''بیٹا تو ہے......اس کے پاس صرف محبت نہیں ہے بچپن کے عاشق کو یاد کر رہی ہے۔''

''پھر ہمیں کیا؟۔''

''ہاں ہمیں کیا۔''

ہم دونوں مزار کے قرب میں پہنچ کر چپ ہو گئے۔ ساری فضا والی کے اولین سروں سے بوجھل تھی ترت مراد کے مزار پر بہت کم لوگ تھے......ہر طرف آنند تھا شانتی تھی، خوشبو تھی کچھ مزار کے پھولوں کی......کچھ باغ سے اڑ کر آنے والہ بہار کے دنوں میں مزاروں کی فضا آرزوؤں سے سسکنے لگتی ہے قریب پہنچ کر میں نے ریشمی کرتے والی کی طرف دیکھا وہ مزار سے باہر والی دیوار کے پاس ہاتھ اٹھائے چپ کھڑی تھی نہ اس کے چہرے پر کسی آرزو کا کرب تھا نہ کچھ پا لینے کی ہوس......وہ

لچکیلی شاخ کی طرح تمام کی تمام شکر گزاری کے پھولوں سے لدی تھی۔

مزار پر پہنچ کر یکدم احتل اجنبی ہوگئی اس نے وضو کیا۔ گیلے چہرے کے اوپر دوپٹے کی بکل ماری اور اندر مزار کی طرف چلی گئی...... میں قوالوں کے پاس درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ رہا۔

اسی طرح جب میں چندرا سے قصور آتا تھا تو میں ماموں کے گھر سے نکل کر روز بابا بھلے شاہ کے مزار پر عین وہاں جا بیٹھتا جہاں قبریں ہیں قوالوں کی آوازیں آتی رہتی اور میں مزار سے ہٹ کر ان قبروں کے بیچ بیٹھا رہتا...... گپ چپ...... ان دنوں نہ مجھے بابا بھلے شاہ سے عقیدت تھی نہ میں قوالوں کی موسیقی سے متاثر ہوتا ...... صرف وہاں بیٹھ کر میں آنے جانے والے عقیدت مندوں کو دیکھتا رہتا مجھے ان عقیدت مندوں سے بڑا پیار تھا ان کی شکلیں بدلتی رہتی تھیں لیکن ہاتھوں کو جوڑنے کا انداز بھرائی ہوئی آنکھیں لرزتے ہوئے ہونٹ وہی رہتے تھے کئی کئی گھنٹے میں چپ چاپ قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہتا...... چندراں میری ماں ابا عزیز گا تن سب مجھے ان قبروں میں سوئے ہوئے نظر آتے...... میں ان قبروں کے ساتھ ٹیک لگا سکتا تھا ان کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا......

بڑی دیر بعد احتل میرے پاس آئی رونے کے بعد وہ بڑی کمسن لگ رہی تھی

''آپ بھی کوئی دعا مانگ لیتے سر جی۔''

''مانگ لی ہے۔''

''کیا؟''

''بس بتائیں گے کبھی! اور تم نے کیا دعا مانگی ہے احتل ؟''

''بس یہی...... یہی سر جی زندگی تو کسی پیار کرنے والے کے سہارے گزری نہیں اب موت تو کسی پیارے کے ہاتھوں آئے۔''

ہم دونوں واپس موٹر سائیکل کی طرف چلنے لگے۔

وہ بھی بلا کی دھنسی ہوئی چپ تھی جس وقت ہم بیریئر کے پاس پہنچے تو پتہ نہیں کیوں مجھے خیال آیا کہ آج پہلی بار میں احتل کو وہ مزار دکھاؤں جہاں سیمی میرے خیالوں میں دفن تھی میں اسے سیمی کے متعلق وہ سب کچھ بتاؤں جس کا اظہار میں آج تک نہ کر سکا۔

''آؤ احتل۔''

''کہاں سر جی۔''

''یہیں اسی باغ میں۔''

''آپ کو دیر ہو رہی ہے...... بہت کام ہے آپ کو دفتر میں۔''

''کام تو ہوتا ہی رہے گا آؤ۔''

بہار کے نئے نئے دن تھے...... کچے ناریل جیسے کچر کچر دن...... گرم ملکوں میں بہار تنہا نہیں آئی اس کے ساتھ گرمیوں کا احساس بھی آتا ہے جسم میں سردیوں کی یاد اور گرمیوں کا خوف ہوتا ہے پتے جھڑے درختوں میں نئی کونپلیں سبز براؤں چکنے پتے اور بند بند کلیاں ہوتی ہیں ہر رت میں تمام عناصر کی ہئیت بدل جاتی ہے ہوا پانی اور روشنی کا مزاج بدلتا رہتا ہے لیکن روشنیوں کا موسم کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے سردیوں کی روشنی اور دھوپ میں معافی مانگنے کا انداز ہوتا ہے دیر سے آنے والے مہمان کی طرح وہ چوکھٹوں کے سایوں سے چمٹی رہتی ہے اور دیر سے آنے کا اعتراف کیے بغیر وقت سے پہلے رخصت ہو جاتی ہے گرمی کی روشنی دندناتا ساہو کار ہے...... مارشل لاء ہے پولیس ایکشن ہے...... دندناتی آتی ہے گلیاں بازار سب ہونے ہو جاتے ہیں جیسے کرفیو لگا ہو۔

لیکن بہار کی روشنی میں نہ تند ہوتی ہے نہ شکست۔

وہ بار بار گلے لگنے والی محبوبہ کی طرح ہر ہر مسام میں خوشی بھر دیتی ہے بہار کی روشنی جگمگاتی ہے سلاتی ہے ہوش میں رکھتے ہوئے بے سدھ کیے رکھتی ہے...... اس

میں دن چڑھنے سے دن ڈھلنے تک ہزاروں کیفیتیں بدلنے کا مادہ ہوتا ہے باغوں میں اس کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔

کوٹھوں پر بازاروں میں اس کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے کھڑکیوں دروازوں میں یہ منتظر کھڑی ملتی ہے...... بار بار گلے ملنے والی محبوبہ کی طرح پذیرائی ہی پذیرائی ہوتی ہے......

بچھڑنے سے پہلے بار بار ملنے کی وارفتگی!

دراصل بہار کی روشنی مکمل انتظار ہے۔

زردہ زرہ دھوپ میں گھومنے پھرنے والے بھونروں کا انتظار۔

موٹر سائیکل پر آنے جانے والے نوجوانوں کا انتظار۔ بسوں پر سوار ہوتی لڑکیوں کا انتظار۔

سارے شہر کو نہ جانے کس مسیحا کا انتظار ہوتا ہے کہ بہار کی روشنی پیلا پڑا جاتا ہے اور وہ بسنتی کپڑے پہن کر پیلی دھوپ میں نکل آتی ہے...... مجھے بھی اس بہار کے دن میں پتہ نہیں کس کا انتظار تھا؟...... سیمی کا؟...... عابدہ کا...... یا فقط اپنی ذات کا۔

سامنے درختوں سے چمگادڑیں قطار در قطار، گروہ در گروہ چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک اندھی چمگادڑ ہمارے سامنے اوپر سے گری اور چند بچے گھیرا ڈال کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ ہم چپ چاپ پہاڑی کے بائیں جانب منٹگمری ہال کی سمت چلنے لگے۔ بہار کے دنوں میں کبھی کبھی اچانک زندہ رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اگر جلد زندگی کا لہو منہ کو نہ لگے تو آدمی بہار کی زرد روشنی میں صرف سانس روک کر مر سکتا ہے کافور کے درخت تلے پہنچ کر میں رک گیا۔

''یہاں کچھ کچھ دیر بیٹھیں امتل...... یہ بڑا مقدس درخت ہے۔''

امتل نے اپنے برقعے کا نقاب اتار کر گھاس پر بچھا دیا...... ''آپ اس پر بیٹھ جائیں سر آپ کا سوٹ خراب ہو جائے گا۔''

میں نے نقاب کو گھٹنوں پر رکھ لیا اور چپ چاپ بیٹھ گیا۔

''اس درخت تلے ایک لڑکی ملی تھی مجھے ایک بار۔''

پتہ نہیں یہ کافور کا درخت کی خوشبو تھی کہ سیمی کے نہ نظر آنے والے وجود کی

......لیکن اس وقت میں امتل کے ساتھ نہیں تھا میں اندر ہی اندر بھیگ رہا تھا جیسے کسی آبشار کے کنارے بیٹھا ہوں۔

''امتل! کبھی تم نے کسی ایسے شخص سے محبت کی ہے جو کسی اور کی محبت میں مبتلا ہو؟''

''ہاں جی...... بلکہ ہمیشہ!''

''بہت ٹوٹ کر...... پاگل پن کی حد تک۔''

''ہاں جی ایک شخص سے کی تھی''

''درزی غفور جیسی محبت۔''

''کی تھی سر جی......'' امتل نے لمبا سانس لیا۔

''کہاں ملی تھیں تم اسے۔''

امتل نے اپنے گھٹنوں کے گرد بازو حائل کیے اور کھڑے زانو پر سر رکھ کر بولی

......''پرانے ریڈیو سٹیشن پر ملی تھی جی اسے بہت سال ادھر کی بات ہے تب میری شادی بھی نہ ہوئی تھی ان دنوں ریڈیو سٹیشن شملے پہاڑی کے پچھواڑے ہوتا تھا میں ریڈیو پروگرام کیا کرتے تھے آر ڈی صاحب مجھے اپنے کمرے میں بلا کر دھیما دھیما ٹھرک جھاڑا کرتے تھے بڑی عزت تھی میری ان دنوں ...... بڑی شان تھی پروگرام پروڈیوسر کار تک چھوڑنے آتا تھا۔ ذرا لیٹ جاتی تو فون پر فون آتے ریڈیو سٹیشن کی گاڑی لینے آجاتی ......گھر پر ریڈیو سٹیشن پر...... چہر میں ہر جگہ عزت ہی عزت تھی۔''

''کیا نام تھا اس کا؟''

''ایسے لوگوں کا کوئی نام نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسے بندوں کا کوئی گرام ہوتا ہے

......بس وہ دیس بدیس بجلیاں گراتے پھرتے ہیں۔"

"ہم دونوں بڑی دیر تک خاموش رہے سڑک پر لکڑی کی ہیل پہنے کوئی لڑکی جا رہی تھی میں نے آنکھیں بند کرلیں جوتوں کی چاپ بالکل سیمی جیسی تھی......لکڑی کی ہیل......سیسہ پلائی سڑک کا سینہ کوٹ رہی تھی۔"

"جس وقت میں آرڈی صاحب کے کمرے میں پہنچی وہ جانے کے لیے اٹھ رہا تھا کھدر کی سفید شلوار قمیض کندھوں پر کالی سیاہ چادر......سفید رنگ، براؤن بال براؤن آنکھیں......کھڑا ہوتا تو لگتا کہ کھڑے رہنے میں اس کا سارا حسن ہے بیٹھ جاتا تو لگتا کھڑے ہو کر اتنا پیارا کبھی نہیں لگ سکتا......مجھے دیکھ کر وہ دوبارہ کرسی میں بیٹھ گیا لیکن بولا نہیں میرے سلام کا جواب ہی نہیں دیا۔آرڈی صاحب نے تعارف کروایا اس نے صرف سر کے ہلکے سے اشارے سے جواب دیا۔چائے آ گئی آرڈی صاحب مجھ سے دھیما دھیما توجہ بھرا عشق کرتے رہے میں دو گھنٹے بھٹھی رہی وہ ایک لفظ نہیں بولا......لیکن بار بار دیکھتا تھا......کچھ لوگوں کی نگاہیں جب بھی آپ پڑتی ہیں ہمیشہ چوم کر لوٹتی ہیں......ہے نا سر جی؟......"

وہ چپ ہو گئی۔

یہ ایک نئی اختل تھی یادوں کی غلام گردش میں ننگے پاؤں بال کھول کر پھرنے والی اختل......اس کی باتوں میں سے سارا پھکو پن غائب تھا اس کی آواز پنکھڑیوں کی طرح گر رہی تھی پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ایک زمانہ ضرور ایسا بھی ہو گا کہ جب وہ بہت اچھا گاتی ہو گی اور لوگ ریڈیو سے کان لگا کر اس کے گیتوں کو سنتے ہوں گے۔

"پھر......پھر اختل؟......"

"جب میں ریہرسل کر رہی تھی تو وہ اندر آ گیا۔بڑا مشہور شاعر تھا ریڈیو کے لیے غنائیے بھی لکھتا تھا سب کے ساتھ صاحب سلامت تھی اندر آ گیا اور ایک کاغذ کا پرزہ مجھے پکڑا کر بولا......اسے گائیے......میں نے غزل پڑھی اور سنتے میں آ گئی میں

بڑے بڑے خوبصورت مرد کو کوٹھے پر دیکھے ہیں سر جی......لیکن کسی خوبصورت مرد کو اتنی خوبصورت شاعری کرتے نہیں دیکھا دھن تیار ہوئی میں نے ریہرسل کی سارا وقت وہ آنکھیں بند کیے کونے میں چپ چاپ بیٹھا رہا جب کبھی اچانک وہ میری طرف دیکھ لیتا تو میں لے پکڑنا بھول جاتی اس طرح آغاز ہوا......پھر......پھر لمبی داستان ہے بدنامی کی......جھگڑوں کی......ہماری طرف تو خدا نہ کرے کسی کو عشق ہو جائے......"

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں نے اس کے لیے کئی سوئیٹر بنے......تمباکو کا اسے شوق تھا کئی پائپ منگوائے ولایتی ٹائیاں......قمیضیں......میں اسے جب بھی میرا جی چاہتا میں اس پر کچھ نہ کچھ نچھاور کر دوں اپنا جسم اپنی روح......ساری ریاضت دھری کی دھری رہ جاتی اور میں اسے خط لکھتی رہتی......دن میں تین تین خط سر جی......اور وہ مجھے ہفتے میں ایک آدھ گزل بھیج دیتا اسے نے کبھی مجھے خط نہ لکھا کبھی کوئی تحفہ نہ دیا......کبھی میرے جسم کو ہاتھ نہ لگایا......اس کے باوجود......اس کے باوجود وہ ایسے لگتا جیسے کسی روز مجھے ٹوٹ کر چاہنے لگے گا۔ میں اسی دن کی آرزو میں جی رہی تھی......ہم روز ملتے تھے ہر روز میں اس ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کرتی......سر جی کبھی آپ نے ایسے زخمی پرندے کو دیکھا ہے جو اپنے گھونسلے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن پہنچ نہ سکتا ہو؟ ہراڑان کے بعد میں منہ کے بل گرتی اور اڑنے لگتی۔"

"ہاں اتنل سیکھا ہے اتنل غور سے دیکھا ہے۔"

میں ذہنی طور پر حاضر بھی تھا اور غیر حاضر بھی ہر انسان پر ایسے لمحے آتے ہیں جب اردگرد کی ہر چیز کافی ہوتی ہے کسی نئی چیز کی خواہش یا انتظار بھی نہیں ہوتا بظاہر کسی سے کوئی شکایت یا گلہ بھی باقی نہیں رہتا عشق کا روگ بھی کوسوں دور ہوتا ہے آگے پیچھے ہر سمت سے سکھ کا سندیسہ آتا ہے فضا میں ہوا میں روح میں کوئی پھانس نہیں ہوتی

صرف اس کے سائے کا رنگ بدل جاتا ہے اور اس سائے میں نہ جانے کیا کشش ہوتی ہے کہ وہ سارے کا سارا خوف سے لبریز ہو جاتا ہے اور جیسے ہوا میں سگریٹ کی پنی کانپتی ہے ایسے ہی اس کی پسلیوں تلے اس کلا دل کرزنے لگتا ہے انجانے خوف سے انجانی تبدیلیوں سے۔

''آخر میں نے ایک دن آر پار جانے کا فیصلہ کر لیا سر جی...... میں نے اسے خط لکھا کہ وہ مجھے رات کے دو بجے شملہ پہاڑ کے پاس ملے''

''اس نے میرے اس خط کا بھی جواب نہ دیا۔''

''تمہیں یقین تھا کہ وہ آئے گا؟''

''جی مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔''

''کیسے احتل؟''

''بس سر جی کچھ باتوں کا دل کو ایسے ہی یقین ہوتا ہے...... میں نے بڑا زمانہ دیکھا ہے مجھے معلوم ہے آج جس پر دم نکلتا ہے کل وہی اجنبی لگے گا...... وقت کے ساتھ ساتھ سب عشق عاشقی ختم ہو جاتی ہے...... لیکن...... وہ ایسا عشق نہیں تھا جیسے وقت کا ہتھوڑا کوٹ پیس سکے......''

بڑی دیر تک وہ اپنے برقعے کے پھونسڑے نکالتی رہی پھر بولی...... ''بی بی کو مجھ پر بہت شبہ تھا۔ اس نے کئی دن سے میرا نکلنا بند کر رکھا تھا...... میرا سارا زیور کپڑا بھی بی بی نے نیچے لے جا کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ بڑی کپتی تھی جوانی میں بی بی...... مجھے ایسا ایسا مارا ہے کہ...... کہ پتہ نہیں میں اندہ کیسے ہوں آج...... کونڈی والا ڈنڈا ہمیشہ سرہانے رکھ کر سوتی تھی۔''

''مارا کیوں؟''

''مارتی نہ تو اور کیا کرتی آپا کر مرے تھوڑا عرصہ ہوا تھا فیروزہ سات سال کی تھی اور باقی پانچ بیٹے تھے بی بی کے سارے کے سارے نکھٹو...... میری مانگ بھی تھی ان

دنوں ڈیرہ غازی خان ہزارہ سبی ...... زیارت، شورکوٹ ...... سکھر جانے کہاں کہاں مجرے نہیں ہوئے میرے ان دنوں ...... بی بی مالداری ہو رہی تھی وہ میرا عشق کیسے برداشت کرتی بھلا؟۔"

میں بولنا چاہتا تھا لیکن ہر جگہ سیمی بلھری پڑی تھی ...... اس کی جوتیاں، کینوس کا بیگ، کھلے بال جینز ...... گلابی عینک، کستوری کی خوشبو۔

"جس روز میں گھر سے بھاگی ہوں۔ اس کی روز شام سے بارش پڑتی رہی تھی پہلے میں نے ان مانے جی سے تین چار غزلیں گائیں اور پھر طبعیت کی خرابی کا بہانہ کر کے بیٹھک سے آ گئی ...... بڑی بارش تھی بڑی سردی تھی دروازے کھڑکیاں آنے جانے سے روکتے تھے میں سر پر لحاف لے کر جاگ رہی تھی کہ بی بی نے ایک سندھی نواب اوپر بھیج دیا بڑی بڑی موچھیں گہری سیاہ آنکھیں ...... بڑی بڑی بولنے سے پہلے مسکراتا ...... اور مسکرانے سے پہلے ابرو کے بال کھینچتا ...... پرانے مراسم تھے اس کے میرے ساتھ ...... جب بھی لاہور آتا ہمارے پاس ہی ٹھہرتا تھا۔"

اشتل نے لمبی سانس لی اور بڑی دیر بولی ...... نواب صاحب کا باغ تھا حیدر آباد کے قریب کیلوں کا باغ ...... بڑی آمدنی تھی ...... تین تین کاریں تھیں لیکن ہمیشہ اپنے بٹوے کو ازار بند سے باندھ کر سوتا تھا ...... باہر بارش کی چادر لٹک رہی تھی ...... زیور کپڑا سارا بی بی کے پاس ...... قسمت سے سواری کے لیے بھی دھیلا پاس نہ تھا بی بی نے سونے سے پہلے سارے پیسے مانگ لیتی تھی بہانے بہانے سے اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا شملہ پہاڑی کے پچھواڑے ملنے کا ......"

"بڑی دیر تک سندھی سائیں اپنے باغ بیوی اور بچوں کی باتیں کرتا رہا پھر بے سدھ ہو گیا پتہ نہیں کیا بات ہے جب اللہ کو منظور ہوتا ہے تو خود بخود سبب بن جاتا ہے پہلی بار میرے دل میں کسی کو قتل کرنے کا خیال آیا۔ اس وقت وہ مجھے آدمی لگتا ہی نہیں تھا جی میں تھی کیوں نہ اس بھیڑ کو ذبح کر دوں امیر آدمی ہے بٹوے میں ہزاروں ہوں

گے۔لیکن مجھے قتل کرنے کا کوئی درست طریقہ نہ آتا تھا۔نہ میرے پاس کوئی تیز چھری تھی نہ کبھی میں نے پستول کا لائسنس بنوایا تھا لیکن اس وقت مجھے پورا یقین تھا کہ اگر مجھے کہیں سے کند چھری بھی مل گئی تو میں اس کی شہہ رگ کاٹ دوں گی کوئی بیس مرتبہ میں پلنگ سے اٹھ کر غسل خانے گئی آخر میں نے چھری کی تلاش شروع کر دی کبھی کبھی پھلوں کی خاطر میں اپنے کمرے میں چھری رکھا کرتی تھی کبھی میں اپنا پرس اٹھا کر غسل خانے میں لے جاتی کبھی سوٹ کیس اٹھا کر غسل خانے میں لے جا کر اس کی تلاشی لیتی آخر کو میں نے سندھی نواب کے ساتھ والی سائیڈ ٹیبل کا دروازہ کھولا جس وقت میں نے دروازے کھولا نواب صاحب نے میری طرف کروٹ لی اور بولے......کیا کر رہی ہو سو جاؤ''......میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا میں نے دبی آواز میں کہا......میری طبیعت خراب ہے دوائی تلاش کر رہی ہوں۔سندھی سائیں اچھا کہہ کر سو گئے......میں نے پھر کچھ دیر بعد دروازہ کھولا......سامنے چھری اور بٹوہ ساتھ ساتھ پڑے تھے۔''

میں نے دل چسپی سے امتل کی طرف دیکھا......پھر امتل پھر؟......''

''میں نے چھری اور بٹوہ دونوں اٹھا لیے اور غسل خانے کی طرف لی......لیکن وہاں تک کا فاصلہ سارا تھل بیلا تھا میں جیسے تپتی ریت پر چل رہی تھی غسل خانے میں پہنچ کر بٹوہ میں نے اپنے ازار بند سے باندھ کر اندر اڑس لیا اور چھری کوڈ پر رکھ دی شہ نشین والے راستے سے پچھلی سیڑھیوں پر گئی بڑی احتیاط سے کنڈی کھولی اور باہر۔''

''کتنی رقم تھی بٹوے میں؟۔''

''ایک فیروزے کی انگوٹھی اور بائیس ہزار روپے تھے۔''

''پھر پہنچیں تم شملہ پہاڑی۔''

شاہی محلے سے داتا دربار تک پیدل گئی......وہ بارش وہ بارش ایسی سردی کہ

ہڈیاں تک جم گئیں لیکن میرا دل گرم تھا اس رات میں اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے والی تھی ...... بالآخر ایک رکشا مل گیا سالم پھر کبھی میں اپنا دوپٹہ نچوڑتی کبھی چادر کبھی بال جھٹکتی ...... مجھے رکشا ڈرائیور سے بھی خوف آرہا تھا لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی کہ دل میں خوشی ہی خوشی تھی جب میں شملہ پہاڑی کے سامنے پہنچی تو پتہ نہیں کیوں سرجی میرا جی چاہنے لگا کہ واپس جا کر نواب صاحب کو بٹوہ لوٹا دوں ...... اس سے پہلے کبھی میرا ضمیر نہ جاگا تھا ...... لیکن ابھی میں نے رکشا والے کو موڑنے کے لیے کہا ہی تھا کہ وہ مجھے لیمپ پوسٹ کے سامنے بھیگتا ہوا نظر آ گیا۔"

"آ گیا وہ ...... بڑی خوش نصیب ہو تم!"

"اس وقت میں بھی یہی سمجھتی تھی ہم دونوں مل کر ایک ہوٹل میں چلے گئے وہ سارے کا سارا بھیگا ہوا تھا اور بار بار چھینک رہا تھا ہم دونوں ہیٹر کے سامنے بھیگے پرندوں کی طرح بیٹھ گئے وہ پہلی دفعہ بولا ...... کہنے لگا "دیکھو نہ میں تم سے شادی کر سکتا ہوں نہ محبت / میں کسی اور کا ہوں تم اپنے آپ کو سمجھا لو۔"

میں رونے لگی بڑی دیر تک روتی رہی پھر میں نے گیلے کپڑے اتار دیئے اور بستر پر لیٹ گئی مجھے سردی لگ رہی تھی کپکپی سے میرا سارا بدن ہچکولے کھا رہا تھا

"مجھے سردی لگ رہی ہے"

"میں چائے منگواتا ہوں۔"

جب چائے آ گئی تو اس نے پیالی بنا کر مجھے دی لیکن بستر کے پاس نہیں آئے امیں کئی گھنٹے روتی رہی وہ ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر اپنے بدن کے کپڑے سکھاتا رہا آخر جب رونے سے بھی جی کا بوجھ نہ اترا تو میں نے اسے پکارا

"کیا نام تھا؟"

"آپ کو نام سے کیا لینا ہے سرجی ایسے لوگ بے نام ہوتے ہیں میں نے اسے پکارا تو وہ پاس آ کر قالین پر بیٹھ گیا اس کے کندھے پر میری چادر تھی اور وہ بارش میں

نہا کر اور بھی شفاف ہو گیا تھا میں نے بائیس ہزار روپیہ سرہانے سے اٹھا کر اس کی جھولی میں پھینکا پہلے وہ بھونچکا رہ گیا پھر روپے کو دیکھتا رہا۔"

"تمہارے لیے ہیں...... یہ سب"

"افسوس میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا احتل۔" بڑی دیر کے بعد وہ بولا "میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں اس نے بیوگی کے سارے دکھ جھیل کر مجھے پالا ہے۔ اگر میں نے تم سے شادی کر لی تو وہ مر جائے گی...... میں کبھی کسی عورت کا نہیں ہو سکتا، احتل میں صرف اپنی ماں کا ہوں...... میں اس کے دکھوں میں حل ہو چکا ہوں سارے کا سارا۔ پھر اٹھ کر اس نے روپے مجھے لوٹا دیے۔ احتل وہ کہنے لگا میرے دکھوں سے مجھے یہ روپیہ نجات دلا سکتا ہے لیکن میں تمہاری عمر بھر کی کمائی لینا نہیں چاہتا۔ اس نے روپیہ میرے سرہانے رکھ دیا میں اصرار کرتی رہی اور پھر سو گئی۔ اٹھی تو مجھے تیز بخار چڑھا ہوا تھا کھڑکی سے تیکھی روشنی آ رہی تھی میں نے سرہانے تلے ہاتھ مارا وہاں روپیہ پیسہ کچھ نہ تھا ایک پرزے پر دو شعر لکھے تھے جن میں روپے کا شکریہ ادا کیا تھا...... اس کے بعد سرجی ایک اور لمبی کہانی ہے وہ تو بیچارہ سندھی نواب شریف آدمی تھا ورنہ ہمیں تو تھانے کی شکل دیکھنا پڑتی۔"

"پھر تمہیں نہیں ملا وہ شاعر؟"

"پہلے تو میں کئی مہینے ریڈیو سٹیشن نہ گئی جانے لگی تو پتہ چلا کہ وہ کراچی چلا گیا ہے......" احتل نے لمبی سانس بھری اور چپ ہو گئی۔

اس نے اپنے اندر کنڈی لگالی تھی...... بہار کی فضا خاموشی اور خوشبو کی وجہ سے بوجھل ہو گئی...... ہم دونوں کی سوچ الگ الگ سمت میں رواں تھی۔

بڑی دیر بعد وہ بولی...... سو گئے بادشاہو۔

وہ موڈ بدلنے کی کوشش میں تھی۔

"سوئے تھے پر کسی خصماں نوں کھانے نے جگا دیا۔"

وہ چھوٹی ہنسی ہنس کر بولی ...... ''بات نہیں بنی سر جی ...... اگر مجھے پان کھانا اور بات کرنا آتا تو میں آپ کا دل بہلاتی۔''

''آج تو خوب باتیں کر رہی ہو۔''

''کچھ نہیں سر جی نہ بات کرنی آئی نہ پان کھانا آیا۔ دونوں باچھوں سے پان کی دھاری بہنے لگتی ہے بیگمات کو پان کھاتے دیکھا ہے پان کلے میں اور رنگ ہونٹوں پر ......عورت اچھا پان کھانے والی ہو اچھی بات کرتی ہو تو مرد ضرور متاثر ہوتا ہے۔''

''مجھے تو تم ویسے بھی متاثر کرتی ہو۔''

''چھوڑیے سر جی اب وہ ٹیم نہیں رہا۔ ویسے آپ بھی بہت دور نکل چکے ہیں آپ کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''پڑتا ہے اصل بہت پڑتا ہے۔''

پہلی بار دونوں ایک دوسرے کے ماضی سے متعارف ہو رہے تھے وہ مجھے اندوالی اصل سے ملا رہی تھی اور یہ اصل میرے لیے بالکل نئی تھی واقفیت بڑھنے کے باوجود حجاب بڑھ رہا تھا ہم دونوں قریب آنے کے بجائے اجنبی بنتے جا رہے تھے۔

''آپ سر جی؟......آپ نے بھی کبھی زخم کھایا ہے؟۔''

بڑی دیر تک میں اسے سیمی کے متعلق سب کچھ بتا رہا تھا اپنے دکھ اس کی حرمان نصیبی ہم دونوں کمان اور تیز کی طرح کیسے ساتھ رہے اور کیسے دور دور نکل گئے وہ چپ چاپ سنتی رہی گردن گرائے نظریں جھکائے ایک بار بھی اس نے کوئی سوال نہ کیا کوئی تفتیش نہ کی۔

شام پڑنے لگی اور ہوا میں خنکی آ گئی۔ باغ کی چہل پہل میں اضافہ ہو گیا۔ پھر شام کے جاگتے اندھیرے میں بتیاں روشن ہو گئیں اور ہم دونوں بیٹھے رہے آمنے سامنے الگ الگ وقتوں میں مقید علیحدہ گردشوں پر گھومتے ہوئے۔

''آپ کو ایک مشورہ دوں سر جی؟ قسم لے لیں کئی برسوں سے میں نے کسی کو

مشورہ نہیں دیا۔"

"ضرور دو۔"

"آپ شادی کرا لیں سر جی...... آپ جیسے لوگ صرف شادی کے قابل ہوتے ہیں حرام سے کوئی واسطہ نہ رکھیں میں بتاؤں حرام سے کچھ ہو جاتا ہے یہاں۔" اس نے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا مطلب؟۔"

"آپ جیسے لوگ کچھ کرنے کرانے جوگے نہیں ہوتے نہ کوئی دھماکہ نہ قتل نہ خودکشی۔ آپ جیسیوں کے لیے شادی بڑی اچھی رہتی ہے۔"

"مجھ جیسوں سے تمہاری کیا مراد ہے۔"

"آپ جیسے آدمی...... بند آدمی!"

"بند آدمی سے تمہاری کیا مرادی ہے امتل۔؟"

امتل نے ماتھے پر تیوری ڈالی کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی...... ایک نیک آدمی ہوتا ہے سر جی اور ایک بند آدمی...... دونوں ایک سے لگتے ہیں کچھ فاصلے سے...... پر بڑا فرق ہوتا ہے دونوں میں نیک آدمی کی سرشت نیک ہوتی ہے قدرتی طور پر...... ہو چاہے نیل لوگوں میں رہے چاہے بدلوگوں کی صحبت میں اس کی سرشت کوئی اور رنگ قبول نہیں کرتی بھوک سے مر جائے لیکن عقاب مردار نہیں کھاتا سر جی...... حرام کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

"میں تمہاری بات اچھی طرح سے سمجھا نہیں امتل......" میں نے کہا۔

"نیک آدمی کے اندر جھگڑا نہیں ہوتا...... لیکن بند آدمی کے اندر بڑے جھگڑے ہوتے ہیں سر جی...... اس کے اندر بد کی کشش ہوتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو بد کی اجازت نہیں دیتا اس کے اندر نیکی موجود نہیں ہوتی لیکن وہ نیکی کیے جاتا کئی بار سوسائیٹی کے ڈر سے کبھی کسی چاہنے والے کے خوف سے...... وہ دراصل خود پیمانہ

نہیں ہوتا دوسرے لوگوں کی رائے اس کا پیمانہ ہوتا ہے۔ بے چارہ...... کبھی آنکھوں پر پٹی باندھتا ہے کبھی سرپٹ بھاگتا ہے...... کبھی کانوں پر انگلیاں کبھی منہ پر تالا ......توبہ توبہ سرجی بڑے عذاب میں زندگی گزرتی ہے اس کی...... میرا مطلب ہے سرجی نیک آدمی بدی دل سے کرنا نہیں چاہتا اس کی بس طبعیت ہی راغب نہیں ہوتی بند آدمی سب کچھ کرنا چاہتا ہے پر خوف سے مفلوج رہتا ہے وہ بھی ایسا ہی تھا وہشاعر بھی......" آج ایک بالکل نئی اٹیل سے متعارف ہونے کا اتفاق تھا۔

"میں بھی اس کی طرح ہوں...... بائیس ہزار لے جانے والے کی طرح......؟" میں نے سوال کیا۔

"بالکل سرجی بالکل آپ بھی بند ہیں سیل بند مہر بند ہوا بند آپ کے اندر بھی کوئی روشن دان نہیں آپ کے چوبچے سے بھی کوئی موری نہیں نکلتی سرجی...... وہ بھی بند کمرہ تھا...... آپ کو بھی گولک کی طرح بند ہیں۔ ہاں کبھی کبھی کوئی شخص آپ کے اندر گھس کر چور کو ہتھکڑی پہنا دیتا ہے ایسے میں اپنے آپ کو سزا دینے سے آپ بچ جاتے ہیں ورنہ تو...... ورنہ تو......"

میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا آج میں نے اسے سیمی کے متعلق سب کچھ بتایا تھا ور پہلی بار مجھے لگ رہا تا کہ وہ اور میں ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے اور اب جاننے کا وقت نکل گیا ہے تیل اور پانی بہم رہنے کے باوجود ایک دوسرے میں حل ہونے سے قاصر رہے انسان کا بھی خواب المیہ ہے کبھی کبھی کسی شخص سے پورا رابطہ بڑھا لینے کے بعد یکدم اسے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ تو حل ہونے کے بجائے سطح پر بیٹھا رہا اور ذرا دی چھیڑ چھاڑ سے اوپر آکر کارک کی شکل میں تیرنے لگا ہر انسان کو کسی اور میں حل ہو جانے کی شدید آرزو ہوتی ہے اسی لیے وہ ساری عمر ہم جنسوں ہم زبانوں ہم وطنوں ہم مشربوں میں گھومتا ہے جھانکتا ہے اور رابطے جب بہت بڑھ

جاتا ہے تو ہر رشتے سے ایسی صدائیں آتی ہیں جیسے اندھے کنویں کی سطح سے جا کر خالی ڈول ٹکرائے اور شرمندہ ٹامک ٹوئیاں مارتا ہلکا پھلکا باہر کی طرف نکلنے لگے۔

''یہاں ہم سب کس لیے آتے ہیں سر جی ...... صرف مرنے کے لیے ناں؟۔ زندہ رہنے کے لیے بھی امتل زندہ رہنے کے لیے بھی شاید۔''

امتل نے ماتھے پر ان گنت سلوٹیں ڈالیں ...... ناں سر جی آنا صرف مرنے کے لیے ہے ...... زندہ رہنا تو ٹائم پاس کرنے کے لیے ہوتا ہے اور ٹائم پاس کرنے کے لیے شادی سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ...... جلدی سے عمر کٹ جاتی ہے اور پھر حلال رستہ ہے یہ۔

''شاید اصلی مقصد اپنے آپ کو تلاش کرنا ہو امتل۔''

''اپنے آپ کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے سر جی ...... آپ جوان ہیں صحت مند ہیں ...... بڑی عزت ہے آپ کی ریڈیو سٹیشن پر آپ سیدھی سیدھی شادی کرالیں ابھی آپ کا بیلنس ٹھیک نہیں ...... دو پٹڑیوں پر گاڑی چلے تو بیلنس ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تم ...... تم مجھ سے شادی کرالو امتل ...... ہم دونوں۔''

یکدم اس کی آنکھوں سے آنسو بے تحاشا گرنے لگے اور اس کا چہرہ بوڑھی عورت کا ہو گیا وہ بیالیس سے بھی زیادہ کی لگنے لگی۔

''ہم دونوں سر جی؟ ...... ہم دونوں؟ ...... میرے جسم کا تو ...... ہر قطرہ حرام پر پلا ہے سر جی میں اس لہو سے اب کوئی حلال زادہ پیدا نہیں کر سکتی ...... میں ...... میں نے کوشش کی تھی ایک بار شادہ کی سر جی ...... پر ...... چھوڑ دیں اس بات کو میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔''

وہ آنسو پونچھنے لگی۔

''تمہیں کبھی اپنا بیٹا یاد نہیں آتا۔''

''اپنا جو ہوا سر جی ...... یاد کیسے نہ آئے؟ پر ...... کیا کروں اسے یاد کر کے

......آپ سرجی غلط عورتوں کے پیچھے وقت ضائع نہ کریں آپ کو چاہیئے ایک باکرہ لڑکی طیب دوشیزہ...... جو آپ کو سیدھا راستہ دکھا سکے......"

"باکرہ کیوں اختل۔"

"آپ کو عورت کے دل کی تلاش ہے باکرہ جو ہوتی ہے سرجی اس کے چتن سے ابھی کسی نے پانی نہیں پیا ہوتا......وہ جسم اور دل ایک ہی جوئے میں ہارتی ہے آپ کے بڑے احسان ہیں مجھ پر خدا قسم میں اگر پہلے جیسی ہوتی تو فوراً آپ سے شادی کرا لیتی۔"

اس وقت وہ کسی مصری راہبہ کی طرح بڑی پرشکوت لگ رہی تھی۔

"یہ جسم اور دل بڑے بیری ہیں ایک دوسرے کے سرجی۔ جسم روندا جائے تو دل کو بسنے نہیں دیتا......ان دونوں کو کبھی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ جانے کیوں میرے مولا نے ان کو ایک ہی ہتھکڑی پہنا دی اُور پتہ نہیں آپ سے میں کبھی کبھی کیسی باتیں کرنے لگتی ہوں......؟ میں تو نہیں بولتی سرجی میرا تجربہ بولتا ہے مجھ کو تو باتیں کرنے کا ڈھنگ ہی نہیں۔"

باغ میں شام آ گئی...... بہار کی خوشبوؤں سے بوجھل شام۔

ہم دونوں کرگس جاتی کے شودر تھے۔ کوئی بات ہمیں اندر ہی اندر آگاہ کر رہی تھی کہ وہ رابطہ جو اتنی دیر ہمارا بھار اٹھائے رہا اب ٹوٹنے والا ہے لیکن اس شام ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان لیا اسی لیے ہمیں بچھڑنے میں مشکل پیش نہ آئی۔ یہ ایک بات ہے کہ اس شام کے بعد ہم پھر نہیں ملے لیکن اگر ہم ملتے بھی رہتے ریڈیو سٹیشن میں سڑکوں پر بازاروں میں تو اس شام کے بعد ہر ملاقات اجنبیوں کی ملاقات ہوتی ہم ایسے ہی ملتے جیسے چیونٹیاں اپنے اپنے رزق کا دانہ منہ میں لیے راستے میں ایک دوسرے سے دعا سلام کرتی ہیں اور پھر اپنی اپنی راہ چلی جاتی ہیں نہ کوئی ماضی کی یاد...... نہ کسی فردا کا وعدہ۔

جب ہم دونوں باغ سے نکلے تو امتل نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا...... "بس سر جی اب آپ جائیں۔"

"میں تمہیں گھر چھوڑ کر جاؤں گا۔"

"نہیں سر جی میں چلی جاؤں گی خود ہی۔"

"تمہیں

کہیں اور جانا ہے"

"ہاں جی۔"

"کہاں؟"

"بس پاس ہی سر جی بابا شاہ جمال کے۔"

"میں بھی چلتا ہوں...... تمہارے ساتھ"

وہ منہ پرے کر کے بولی...... "ناں سر جی میں ضعیف الاعتقاد عورت ہوں آپ اب گھر جائیں بڑی دیر ہوئی ہے پہلے ہی...... میں نے آپ کا بڑا وقت ضائع کر دیا ہے۔"

"وہاں کیا دعا مانگو گی امتل سچ سچ بتانا؟"

وہ ہونٹ چبا کر بولی...... "شاید وہی دعا مانگو شاید ہی دعا...... جو بابا ترت مراد کے مانگی تھی۔"

میں اس کی دعا بھول چکا تھا

"کون سی دعا؟۔"

"یہی سر جی...... زندگی تو کسی پیار کرنے والے کے سہارے گزری نہیں۔ اب موت تو کسی پیار کے ہاتھوں آئے...... موت تو حلال ہو میری۔"

وہ بغیر سلام دعا کے مڑ گئی اور جلدی جلدی سڑک کراس کرنے لگی میں نے اس کے پیچھے جانا چاہا لیکن پہلی بار مجھے اس سے خوف سا آ گیا۔

دوسری صبح میں سیر تک سویا رہا۔ خواب میں رات کو کئی مرتبہ میں نے ذبح کیے ہوئے مرغے، اونٹ اور بکرے دیکھے۔ رسی سے بندھے ہوئے جانور آسمان کی طرف منہ کر کے روتے نظر آئے...... کئی بار میں اٹھا السر میں شدید جلن اور تکلیف تھی پچھلے دن کا سارا فاقہ تھا منہ میں تیزابی کیفیت تھی رات کو اٹھ کر میں نے ٹھنڈا پانی پینا چاہا تو مجھے یوں لگا جیسے نلکے سے فراٹے بھرتا تازہ لہو بہہ رہا ہے سناٹے اور اندھیرے کے باوجود سارے سانده کلاں سے کتوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اعصابی سکون کی گولیاں کھا کر بہت دیر میں سویا تو صبح خلاف معمول صولت بھابھی مجھے جگانے آ گئیں پہلے انہوں نے ٹیبل پر چائے کا ٹرے رکھا پھر کرسی سے ٹکرائیں اور اندر غسلخانے میں جا کر انہوں نے نلکہ چھوڑ دیا۔ پھر اندر کھلنے والی سیڑھیوں پر کھڑی ہو کر مسعود اور فرید کو ڈانٹتی رہیں جمیں جاگ گیا تو وہ بغل میں اخبار دبائے چائے کے پاس کھڑی تھیں۔

”بڑی خراب ہے آج اخبار میں۔“

میں سمجھا ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی۔

”کیا......“ میں نے حواس مجتمع کر کے سوال کیا۔

”کسی احتل عزیز طوائف کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا کل رات۔“

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔

”کون......کیا......کس کا قتل......“

”ایک حرام کھانے والی کا......اور کس کا۔“

بھابھی نے کچھ جواب نہ دیا اخبار میرے بستر پر پھینکا اور سیڑھیوں کی طرف چلی گئیں۔

اخبار میں احتل کی پرانی تصویر چھپی تھی جس میں اس نے دو چوٹیاں کر رکھی تھیں

اس کے ساتھ اس کے بیٹے کی تصویر تھی لڑکے کی شکل ماں سے مشابہہ تھی وہی نتھنے وہی ہونٹ وہی آنکھیں چوکھٹے کے اوپر جلی حروف میں رقم تھا..... مخبوط الحواس بیٹے نے غیرت میں آ کر ماں کو قتل کر دیا۔

مجھ میں ساری خبر پڑھنے کی ہمت نہ تھی میں نے اخبار تہہ کیا اور اسے عابدہ کے سلیپر کے پاس جہاں سیمی کا خوشبودار رومال بھی پڑا تھا رکھ دیا پھر میں نیچے گیا مجھے معلوم تھا کہ بھابھی بن کہے بغیر کسی سے پوچھے سارا معاملہ جانتی ہیں وہ باورچی خانے کے سامنے کھڑی اپنے دانتوں کو برش کر رہی تھیں۔

''بھابھی!۔''

''جی۔''

''آپ میری شادی کا انتظام کر دیں۔''

بھابھی نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں

''لیکن ایک شرط ہے''

''وہ کیا''

''لڑکی باکرہ ہونی چاہیئے''

''اچھا۔''

رات کے پچھلے پہر

موت کی آگاہی

جنگل سے ایسی آوازیں آ رہی تھی جیسے تنگ سرنگ میں بڑی تیز رفتار سے ہوا داخل ہو رہی ہو۔

ٹولی ٹولی گروہ گروہ حلقہ بہ حلقہ موج در موج بھانت کے پرندے سوکھے تال کے اردگرد بڑے بڑے چھتنارے درختوں پر جمع تھے بڑے پنکھوں والے پرندے تال

کے پاس شامیانوں کی طرح تنے بیٹھے تھے اونچے اونچے ٹیلوں پر جھاڑیوں میں ڈالیوں میں گھپے دار بیلوں سے وفد اائے بیٹھے تھے الاسکا سے بھی چند پرندے سیاہ برقعے اوڑھے ہانپ رہے تھے رایو گرینڈ اور برازیل سے لمبی چونچ اور جھبرے پروں والے پرندے فیصلے کے انتظار میں تھے۔

سانپ بھی آج جرائت کر کے پاتھی دوبا گھاس میں چھپے بیٹھے تھے لیکن ان کی سئایں سائیں سے گھاس سرسرانے لگا تھا پرندوں میں بات کا چرچا تھا کہ دوسرے سب جگ کے آغاز سے پہلے ایک بار ایسا ہی اجلاس ہوا تھا لیکن اس کے بعد پرندوں کی برادری کبھی انبوہ در انبوہ اس طرح اکٹھی نہ ہوئی اس مرتبہ جب تبت کی سطح مرتفع پر پرندوں کا کٹھ ہوا تھا تو پرندے انسان سے کلی طور پر مایوس ہو کر کسی اور سیارے میں ہجرت کرنے کے لیے اکھٹے ہوئے تھے۔تب متمدن دنیا پہلی بار تباہ ہوئی تھی انسان نے اپنی مکمل دیوانگی کا ثبوت دے کر اپنی ہی نسل کو دنیا سے مٹانے کی کوشش کی تھی ...... نیویارک، ماسکو، پیرس، فرینک فرٹ لندن جیسے ہزاروں اوران گنت شہر چشم زدن میں راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے ساری دنیا پر غبار کا ایک گھومتا غلاف چڑھا تھا آتش فشاں پہاڑ اور انسانی تخلیق کا لاوا ہاتھ میں ہاتھ دئے ہر طرف بہتا تھا دور دور تک کسی براعظم پر سبزے کا نشان نہ تھا ملکوں ملکوں محشر بپا تھا تب سارے پرندے تبت کے مرتفع پر جمع ہوئے تھے اور یوں ہانپ رہے تھے جیسے دمے کے مریض ہوں۔

انسان تمدن کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر قلابازی کھا گیا تھا اس نے اپنے ہی لوگوں کے لیے ایسے بم ایجاد کیے تھے جن سے نہ صرف انسان ہلاک ہوتا ہے بلکہ عورت کا رحم بچہ بنانے اور مرد کا عضو تناسل بیج بونے سے قاصر رہ جاتا ہے اس نے شہروں پر ایسے بم بو پھینکے کہ میٹھے پانیوں کے ایٹم پھٹ کر زہر میں تبدیل ہو گئے۔پھر جس نے اس پانی سے چکھا وہ اولین گھونٹ کے ساتھ بان حق ہو نسل انسانی کے اکا دکا پانی

کی تلاش میں ننگے بوچے سرگرداں ہوئے ان کی تلاش ایسی تھکا دینے والی تھی کہ قافلے کے لوگ ہر پڑاؤ پر گھٹتے گئے اور پڑوا کم ہوتے گئے۔...... یہ دوسرے ست جگ کے آغاز کا ذکر ہے تب پرندوں نے تبت کی اونچائی پر بیٹھ کر سوچا تھا کہ آؤ یہاں سے پرواز کریں اور کسی ایسے سیارے میں چل کر گھر بنائیں جہاں انسان کی دیوانگی سے پناہ ملے...... وہ کئی روز تک مشیت ایزدی کے انتظار میں رہے اور ہجرت نہ کرسکے...... حتیٰ کہ ان کا صبر دیکھ کر اللہ کی رضا سے تمام براعظموں پر پھر سے ہاتھی دوباؤ گھاس اگ آئی۔ جنگل ہرے بھرے ہوگئے اور تال میٹھے پانیوں سے بھرنے لگے۔

اس وقت دوسری بار اس قدر تعداد میں پرندے جمع تھے اور چوتھے مسئلہ پھر وہی درپیش تھا جنگل سے ایسی ہوک اٹھ رہی تھی جیسے زرد کھیتوں سے پھیکے چاند کی طرف ٹیڑی کی آواز لپک رہی ہو پھر سیمرغ نے تین بار اپنے تن کی بتی بجھائی اور گویا ہوا ......سرخاب تو غیر جانب دار ہے کھیتوں کھلیانوں کا نگہبان رزق کی خوشخبری دینے والا تجھے خدا کی قسم مختصر الفاظ میں بیان کر کہ اصل وجہ نزاع کیا ہے تا کہ جو نئے مہمان آئے ہیں اصل حالات سے واقف ہوں۔

سرخاب نے سارا ماجرا مختصر الفاظ میں بیان کیا تو نائجیریا کی چیل ملکہ اٹھ کر بولی ......"آقا جو کچھ سرخاب نے کہا ہے درست ہے لیکن ہماری التجا ہے کہ اس بار انسان کا حوالہ درمیان میں نہ آئے وہ سیاں ہو یا نقال وہ آئینہ ہو کہ کاربن پیپر۔ اس میں گھٹنے بڑھنے کی صلاحیت چاند سے بھی بڑھ کر ہو ہم کو اس کی تہہ در تہہ سرشت سے کوئی سروکار نہیں ہم کو انسا سے کوئی غرض نہیں ہم جانوروں سے کیڑے مکوڑوں سے اس بحث کا پاک رکھنا چاہتےہیں ہمیں جل باسیوں کا حوالہ نہ دیا جائے ہم ہواؤں کے مسافر ہیں اور ہمارا اپنے رب سے معاہدہ ہے کہ ہم صرف رزق حلال کھائیں گے اور سرشت کی حد کو پار کر گئی ہے اور حرام رزق کھانے لگی ہے اس کا سارا دیوانہ پن اسی

سے نکلا ہے پیشتر اس کے کہ یہ بھی ہوا باسیوں کو جنگل سے نیست و نابود کر دے اسے جنگل بدر کر دینا چاہیئے۔"

گیدڑ نے نہایت ادب سے تین بار ماتھے کو دم سے چھوا اور بولا ...... "شاید پچھلی بار ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ باوجودیکہ رزق حرام ہی سے راجہ گدھ میں دیوانگی کے آثار پیدا ہوئے ہیں لیکن مسئلہ دراصل سرشت کا ہے ...... اگر راجہ گدھ کی سرشت میں حرام کھانا لکھا ہے تو پھر اس کے لیے حرام گناہ نہیں عین ثواب ہے ...... لیکن اگر اس نے اپنی عقل سے رزق حرام کھانا سیکھا ہے تو پھر یہ ضروری اس کے لہو پر اثر انداز ہوگا اور دیوانگی پیدا کرے گا ...... طے یہ کرنا ہے کہ کیا رزق حرام گدھ کی سرشت کا حصہ ہے کہ اس کی اپنی تجویز کا ردعمل۔"

اب چیلوں کی ملکہ برافروختہ ہو کر اٹھی اور بولی ...... دیکھ دوست گیدڑ ہم اللہ کی عطا کردہ سرشت سے جنگ نہیں کر رہے۔ اس جنگل میں جہاں ڈسنے والا سانپ رہتا ہے وہیں مٹی رنگا مینڈک بھی پھدکتا پھرتا ہے چنگھاڑنے والی شیرنی اور اس کے روغ سے بھاگنے والی نیلی گائے

بھی یہیں رہتی ہے ہم جنگل والوں کا سابدی سے کوئی بیر نہیں جو ب ہماری سر شت کا حصہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں ہماری شرست میں بدی کا عنصر ابلیس کی تخلیق نہیں روز ازل سے بنانے والے نے کسی مصلحت کے پیش نظر ہم میں کچھ ایسے وصف رکھے ہیں جو ہمیں تحفظ سے تو آشنا کرتے ہیں لیکن ظلم پر آمادہ نہیں کر سکتے جنگل میں کوئی سانپ سے نہیں لڑتا پھنکارنا ڈھنا اس کی سرشت ہے چیتے سے کسی کا بیر نہیں کیونکہ بنانے والے نے اسے اسی ڈھب سے بنایا ہے لیکن گدھ نے اپنی سرشت خود بدلی ہے پہلے یہ بھی شکار کرنے کو اپنی زندگی کا طرہ امتیاز سمجھتا تھا پھر اس نے اپنی عقل سے اپنی تجویز سے اپنی سرشت میں ترمیم کی اور حرام کھانے کا مرتکب ہوا بول اعتراف کر ہم جنوں انسانوں فرشتوں، جانوروں پرندوں کی سرشت کے

خلاف نہیں اس رزق حرام کے خلاف ہیں جو اپنی عقل سے کھایا جاتا ہے جس کی مناہی موجود ہوتی ہے اور جو زہر بن کر لہو میں پھرتا ہے اور دیوانگی باعث ہوتا ہے۔

ایک سانپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا...... ''دیکھو یہ ہمارا ذکر ہے یہ موقعہ ہے صفائی کا کچھ کہہ گزرو۔''

سانپوں کے راجہ نے آہستہ سے جواب دے۔...... ''چپ رہو پہلے ہی ہم پر بہت بڑا الزام ہے کہ ہم نے اماں حوا کے ورغلایا ان کو سوشت سے زیادہ بدی پر آمادہ کیا۔ حالانکہ ان کے نفس نے انہیں دھوکا دیا ان کی سرشت میں تو پہلے سے سوچ کی دو شکلیں موجود تھیں اگر انب کی سرشت میں شروع سے دو سراستے نہ ہوتے تو وہ میری بات کیونکہ مانتیں؟...... چپ رہو اور یہاں آنے کا راز مت کھولو۔''

سرخ برادری کو مخاطب کیا اور کڑک کر بولا...... کیا یہ شان عبودیت کے خلاف نہیں کہ کوئی ذی روح اپنی عقل و تجویز سے اپنی سرشت میں نئے رنگ کا اضافہ کرے کائنات کی ہر چیز سے گواہی لے بیٹھے کے حکم سے پہرا ہوئے اور کبھی سفر کے مرتکب نے ہوئے جانوروں کی ان کی جبلت کی پاسبانی رہنے کا حکم تھا سو وہ رہے۔ ......تو نے انسان کی نقالی کیوں کی؟ کیا یہ تیری کم عقلی نہ تھی کہ تو نے اپنی عقل سے رزق حرام کھایا؟۔

''تھی...... تھی...... '' گدھ نے زمین پر سر رکھ کر کہا۔

تیہو کی ٹولی بھاگنے والی تھی لیکن پاس ہی بیٹھے ہوئے مہرلاٹ نے ہمت دلائی اور کہا...... ''ہم کم عقل ہیں آقا ہم کو تو سمجھ نہیں آئی کہ رزق حرام سے دیوانہ پن کیونکر پیدا ہے ہم سرشت کی بات تک کیونکر پہنچیں۔''

عقاب کی ٹولی سے ایک پا پائے روم اٹھا...... ''سن مہرلاٹ! رزق دو طو کا ہوتا ہے ایک رزق وہ ہے جو جسم کا ایندھن ہے اور دوسرا رزق وہ ہے جو روح کی توانائی کا باعث بنتا ہے جیسے پانی خوراک حدت ہوا...... جسم کو پالنے کا وسیلہ ہیں اسی طرح

عبادت وشق قربانی روح کی استقامت کی غذا ہیں۔ بتا گدھ جاتی کے راجہ کہ تو نے جسم کا رزق حرام کھایا کہ روح کا...... بتا وہ رزق کون سا تھا جس سے تیرے جرثومہ ٹوٹ کر پاگل پن کا شکار ہوئے؟"

اب چیل ملکہ اٹھی اور چلا کر بولی...... "ان بیکار باتوں میں الجھنا تضیع اوات ہے فاضل جج جانتا ہے کہ جسم کا رزق بالآخر روح کو لگتا ہے اور روح کا رزق آخر کار جسم کا حصہ ہو کر رہتا ہے رزق حرام چاہے بدنی ہو یا روحی دیوانہ پن کا باعث ہوتا ہے۔"

گیدڑ یہ بات سن کر بہت متاثر ہوا اور تالی بجا کر بولا...... "خوب چیل ملکہ یہ بات طے ہے کہ رزق چاہے بیرونی ہو یا اندرونی اگر حرام ہے تو ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنتا ہے لیکن بات وہیں ہے کہ کیا گدھ اپنی شرکت کے خلاف رزق حرام کھاتا ہے۔"

مہرلاٹ نے پھر سوال کیا...... "یہ کیا بحث ہے رزق حرام کا دیوانگی سے کیا تعلق؟

"

شاہیں بچے اٹھے اور خفگی سے بولے...... "کیا تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ پاک رزق سے لہو میں ایسی مثبت لہریں ہوتی ہیں جن سے روح میں کوئی مغائرت پیدا نہیں ہوتی۔ جس وقت حلال رزق پیٹ میں پہنچتا ہے تو انسان رب کی ثنا اور اس کے احکامات کا خود بخود پابند ہو جاتا ہے لیکن جب رزق حرام جسم کے اندر داخل ہوتا ہے تو منفی لہروں ک اجال لہو میں پھیل جایا ہے اور ہر جرثومہ کی زندگی منفی طور پر متاثر ہوتی ہے اور وہ وقت سے پہلے ٹوٹنے لگتا ہے...... اس گدھ سے پوچھا جائے کہ یہ اس حقیقت سے واقف نہ تھا؟"

"تھا...... تھا...... تھا......" راجہ گدھ چلایا۔

چیل برادری سے آواز آئی ...... "لمبے بکھیڑوں میں پڑنے سے حاصل؟ ہم جانتے ہیں کہ گدھ پہلے طیب رزق کھاتا تھا پھر یہ اپنی عقل سے حرام کی طرف

راغب ہوا......"

تیہو کی ٹولی سے ایک پرندہ بولا...... "آقا! ہم بحث کو الجھانا نہیں چاہتے صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسان نے اپنی سرشت کیونکر بسلی اور وہ رزق حرام کی طرف کیسے مڑ گیا؟۔"

اب ایک مریل سے بُلبُل بولی...... "ہم کو پتہ چلا ہے کہ انسان کی سرشت ٹھہرے ہوئے پانیوں کی مانند ہے جس میں ہر قسم کا عکس پڑتا ہے درختوں میں رہے تو درختوں جیسا پہاڑوں میں رہے تو پہاڑوں جیسا اٹل مضبوط، جانوروں میں بسیرا کرے تو ان ہی کی مانند حیوان...... اچھوں کی صحبت ملے تو فرشتہ رزیلوں کا رنگ چڑھے تو شیطان!"

نیلی چونچ والا ست رنگا پرندہ اچانک بولا...... "تو انسان سیال ہوا کبھی شیر سا بہادر کبھی اونٹ سا کینہ ور...... کبھی فاختہ کی طرح معصوم کبھی پتے کی طرح چکنا اور کبھی پھول جیسا گلرنگ...... لے یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی...... لے دے کے انسا تو اردگرد کا پابند ہو گیا۔"

"انسان تلاش ہے...... وحدت کی کثرت میں تلاش۔" ایک طرف سے آواز آئی "نہیں صاحبو انسان تضاد ہے آگ پانی کے میل سے بنا ہے۔"

"آقا! انسان نہ رزق حرام کی وجہ سے دیوانہ ہوا ہے نہ اس طاقت کی وجہ سے جس کا ذکر نجد کی مینا نے کیا تھا بلکہ تضاد کے ہاتھوں دیوانہ ہوا ہے...... دن کے ساتھ رات ہے...... زندگی کے ساتھ موت...... شمال کے مخالف جنوب...... لیکن بیچارے انسان کے اندر ہر وقت نیکی بدی کی جنگ ہوتی رہتی ہے...... اگر اس کے اندر جنگ ساکت ہو گئی تو خدا ہار جائے گا۔"

یہ کفر کے کلمات سن کر سارے پرندے سناٹے میں آئے اور آواز کا تعاقب کرنے لگے۔

''بزدلوں کی طرح بات نہ کر سامنے آ''

فاسفورس کی بتی سے آواز آئی۔

ایک چھوٹا سا کھٹ بڑھی باہر نکلا اور زمین چوم کر بولا ...... ''پہلے آقا انسان کی سرشت میں بدی نہ تھی۔ وہ بھی فرشتوں کی طرح نیک اور آئینے کی طرح پاک تھا لیکن ایک روز ابلیس نے موقعہ پا کر اس میں جھانکا اس لمحے حضرت آدم کے اندر حق و باطل کی جنگ شروع ہوئی اگر اللہ اپنے اذن سے اس عکس کو نکال دیتا جو آدم کے دل میں پڑ چکا تھا تو بے انصاف کہلاتا اس لیے اس نے ابلیس کو مہلت دی اور انسان کو ترغیب دی کہ وہ اپنا آئینہ صاف کر لے اس وقت سے آج تک حق باطل کی جنگ جاری ہے جنگ کا میدان' انسان ہے ..... اللہ کی کل کائنات میں صرف انسان ایسا ہے جو اپنی سرشت بدلنے پر قادر ہے اپنے آئینے کو صاف کر سکتا ہے جیت اللہ کی ہوگی لیکن موقع ابلیس کو برابر کا فراہم کیا جائے گا آپ دیکھتے نہیں آقا اس جنگ کی وجہ سے انسان کی کیا حالت ہوئی ..... اگر وہ دیوانہ ہے تو اس تضاد کے ہاتھوں ..... فرزانہ ہے تو اسی تضاد کی وجہ سے سرخاب اٹھا اور مودب لہجے میں بولا ...... ''آقا یہ بحث لمبی ہے انسان کی سرشت کو یا تو خدا سمجھتا ہے یا ابلیس ..... انسان تو ابھی خود اپنی سرشت کو سمجھ نہیں پاتا تو جانتا ہے کہ انسان کا خمیر نیکی سے اٹھا ہے چور اچکا ڈاکو کو بدمعاش ساری عمر بدی کمائے ایک توبہ کے وضو سے اس کی بدی دھل سکتی ہے بدی اس کے آئینے میں فقط ابلیس کے عکس کی طرح رہتی ہے عکس ڈالنے والا نہ ہو تو آئینہ پاک رہتا ہے لیکن پھر یہ بات لمبی ہے۔''

اتنے میں ایک بوڑھا کوا اٹھا اور کہنے لگا ...... ''میں انسانوں کے پاس رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ ان کی دیوانگی کا ان کی سرشت بھی ایک ...... ایک انسان کو خالق نے اس طور پر بنایا ہے کہ اس کا وجود تو ایک ہے لیکن اس کی روح، سائیکی سرشت عقل قلب جانے کیا کیا کچھ کئی رنگ کے ہیں وہ کسی کے ساتھ شیر ہے کسی کے ساتھ بکری

کسی کے ساتھ سانپ بن کر رہتا ہے تو کسی کے لیے کینچوے دے بدتر ہے بدی اور نیکی روزِ ازل سے اس کے اندر دو پانیوں کی طرح رہتی ہے ساتھ ساتھ ملی جلی علیحدہ علیحدہ جیسے دل کے تیسرے خانے میں صاف اور گندہ لہو ساتھ ساتھ چلتا ہے...... وہ تو ہمیشہ ڈھلتا ہے ہمیشہ بدلتا ہے کہیں قیام نہیں کہیں قرار نہیں وہ ایک زندگی میں ایک وجود میں ایک عمر میں لاتعداد روحیں ان گنت تجربات اور بے حساب نشونما کا حامل ہوتا ہے اس لیے افراد مرتے ہیں انسان مسلسل رہتا ہے ہم جنگل والے سیدھے ہیں ہماری سرشت طے ہے ہم اس تہہ در تہہ کو نہیں سمجھ سکتے ہمیں انسان کے پرت کھولنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا...... وہ رزقِ حرام سے دیوانہ ہو کہ تضاد سے عشق لاحاصل ہے کہ تلاش بے سود ہے ہم جس کی سرشت کو نہیں سمجھ سکتے اس کی دیوانگی کا بھید ہم پر کیا کھلے گا...... بہتر ہے کہ ہم اس باب کو بند کر کے صرف راجہ گدھ کے مسئلے پر توجہ دیں۔"

اس وقت ایک مینا اٹھی اور بولی...... "انسان کے ساتھ میری پہچان بھی پرانی ہے...... اگر تضیع اوقات نہ ہو تو کچھ عرض کروں۔"

چیل ٹولی سے نفی کی آوازیں اٹھی لیکن سرخاب نے اجازت دے دی۔

مینا گویا ہوئی...... "میں جانتی ہوں آقا! انسان خود اپنی وحدت کی تلاش میں ہے اور وہ اپنی وحدت کو اس لیے تلاش نہیں کر سکتا کہ وہ ساری زندگی آرزوؤں کے جنگل میں سے گزرتا ہے آرزوؤں کے جنگل کی سرشت کا یہ عالم ہے جیسے ایک آئنیہ ٹوٹ کر ہر ٹکڑے میں ایک ہی عکس دینے لگے...... جن انسان ایسے جنگل سے گزرتا ہے آقا تو باوجودیکہ ہر ٹکڑے میں اس کا اپنا عکس ہوتا ہے لیکن ہزار ہا آئینے کے ٹکڑے اسے اپنے وحدت سے ملنے نہیں دیتے اس جنگل کا عجیب شعور ہے یہاں آرزو کی ناکامی ہو کہ آرزو کی بارآوری...... کثرت موجود رہتی ہے اسی کثرت کی وجہ سے انسان کبھی اپنی وحدت سے دوچار نہیں ہو سکتا۔

مجھے ایک واقعہ پیش آیا میں وہ بیان کرتی ہوں شاید انسان کی سرشت کا کچھ سراغ اس سے لگے آج سے دو ہزار سال پہلے سائپرس کے ملک میں ایک بادشاہ رہتا تھا وہ ہفت اقلیم کا مالک تھا صبح خیزی اس کی عادت تھی کجروم اپنے براق برق رفتار گھوڑے پر سوار ہوتا اور جنگل کے باسیوں کے ملنے چلا جاتا اسے جانوروں کی بولی سے شغف تھا دن کا وقت وہ راج پاٹ کے کاموں بسر کرتا لیکن دوپہر ڈھلتے ہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہ پھر پہاڑوں میں نکل جاتا اور پہاڑوں سے گفتگو کرتا رہتا۔ دن ڈھلے گھر آتا تو تھکا ہارا ایک ایسے کمرے میں استراحت کرتا جس کی دیواریں چھت فرش تمام چھوٹے چھوٹے آئینوں سے مزین تھے۔"

وہ حسن میں اس قدر لاثانی تھا کہ آدھی رات کو میں نے اس کے بستر کے گرد ملائکہ کو طواف کرتے دیکھا ہے۔ اسے سحر آتا تھا آرزوؤں کی تکمیل کا سحر ادھر خواہش کا بیج اس کے دل میں پڑتا ادھر وہ اس سحر کی بدولت حصول آرزو میں کامیاب ہو جاتا۔

اس کے حرم میں دس ہزار پری جمال دوشیزائیں تھیں۔

اس کے خزانے نے بارہ سالوں میں بھی نہ دیکھے جاسکتے تھے۔

اسے آنے والے واقعات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا۔

وہ چہرے سے دل کا حال معلوم کرنے میں لاجواب تھا۔

اسے جڑی بوٹیوں کا مکمل علم حاصل تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہونا چھوڑ دیا اور سحر خیزی کی عادت ترک کر دی۔ پھر اس نے اپنے برق رفتار گھوڑے کو بھی ایک اصطبل کے حوالے کر دیا اور خود اپنے آئینے خانے میں اکیلا رہنے لگا۔ چونکہ میں آئینے خانے میں مثل قطب نما رہتی تھی اس لیے سارا سارا دن اسے ملول دیکھ کر میرا دل پھٹنے لگتا میں اسے دور دراز کے ملکوں میں بسنے والی خوبصورت دوشیزاؤں کے جمال کی باتیں

سناتی لیکن وہ کروٹ بدل کر کہتا...... ''مجھ سے حسن ناپائیدار کی بات نہ کرنا مینا۔ کبھی تو نے ایسی عورت دیکھی جو بوڑھی نہ ہوئی۔؟''

میں اس سے دوسرے ملکوں کے عجائبات کی بات کرتی تو وہ کہتا...... ''عجائبات وقتی کرشمہ ہیں ان کو مسلسل دیکھو تو عجائبات نہیں رہتے!''

رفتہ رفتہ وہ ہر طرح کے عیش سے متنظر رہنے لگا ہفتے میں ایک بار جو کی روٹی کھاتا قلیل الطعام، قلیل الانام قلیل النوام اپنے پر ایسی پابندیوں کا شکنجہ کس لیا کہ اس کی رعایا کا مفلوک الحال فقیر بھی حالت میں اس سے بہتر ہو گیا۔

ایک رات جب پورا چاند چڑھا اور ہر آئینے میں بادشاہ کی صورت منعکس ہوئی۔ میں نے جرات کر کے اس سے پوچھا...... ''اے شاہ سچ بتا تجھے کیا ہوا ہے؟'' کہنے لگا...... ''اے مینا! میں اپنی رنگا رنگی سے اکتا گیا ہو آرزو کی ناکامی ایک حجاب ہے لیکن آرزو کی بار آوری دوسری قسم کا ایک پردہ ہے میں اپنے میں دو راستے دیکھنا نہیں چاہتا میں اس قدر تنہا ہونا چاہتا ہوں کہ مجھ میں صرف ایک رنگ رہ جائے دیکھتی نہیں کہ میں نے ہر ذی روح کو چھوڑ دیا نباتات جمادات مجھ سے چھوٹ گئے میں نے بدی کی ساری پنیری اکھاڑ پھینکی تا کہ نیکی کا خاکستر رنگ میری ذات کو ایک رنگ میں رنگ دے میں اپنی تنہائی کی ایسی اکائی تلاش کر رہا ہوں جہاں بنانے والے کو مجھ پر ترس آجائے اور پھر میری وحدت کی بیچارگی کو وہ اپنی وحدت میں سمو لے گا...... میں اپنی وحدت کی تلاش میں ہوں تا کہ اس کی وحدت کی پہچان سکون جو ہمیشہ تنہا رہتا ہے اور جسے زوال نہیں۔''

دوسری صبح جب اس کا برق رفتار گھوڑا کھڑکی کے پاس آ کر ہنہنایا تو میری آنکھ کھلی وہ مر چکا تھا اس نے اپنے خنجر سے خودکشی کر لی تھی ہر آئینے میں ایک خنجر کا عکس تو موجود تھا لیکن کسی شیشے میں اس صاحب جمال کا عکس نہ تھا اس کی خودکشی...... خودکشی جو دیوانگی کی دوسری شکل ہے...... کیا اس کی سرشت کی وجہ سے نہ تھی۔ کیا اس دیوانگی

کا تعلق اس تلاش سے نہ تھا جو کثرت میں وحدت کی تلاش کرتی ہے؟۔

اس وقت چیلوں کے ہراول دستے میں دھماکہ خیز شور ہوا۔

ایک بوڑھی لقوہ زدہ چیل نے اٹھ کر کہا...... ''آقا! ہم ان مباحثوں سے بددل ہو چکے ہیں جو گھوم پھر کر انسان کی سرشت کے گرد گھومتے ہیں تجھ کو اگر انصاف کرنا ہو تو کر ورنہ ہم چلے...... تمام گدھ جاتی منقار زیر پر بیٹھے تھے۔''

''بول راجی گدھ...... کیا تجھ پر جو الزام لگا ہے درست ہے۔''

''الزام درست ہے لیکن میں خود نہیں جانتا کہ مجھ میں دیوانگی کے آثار پہلے پیدا ہوئے کہ میں نے رزق حرام کی طرف پہلے قدم اٹھایا...... پتہ نہیں مردار کھانے سے میری روح ملوث ہوئی کہ میری روح کو گھن لگ چکا تھا اس لیے میں نے رزق حرام کھایا؟۔''

چیل ملکہ چلائی...... ''ہم اسے برسوں سے دیکھ رہے ہیں اس کا دیوانہ پن بڑھ رہا ہے...... تو ہمیں باتوں میں نہ بہلا ہم سب جانتے ہیں ایک دن یہ تمام پرندوں کو نیست و نابود کر دے گا۔''

گیدڑ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ صلح کے انداز میں پھرا کر کہا...... ''حضور! یہ بات طے کیجئے کہ کیا راجہ گدھ اپنی سرشت سے مجبور ہو کر رزق حرام کھاتا ہے کہ یہ اس کی اپنی اختراع ہے اپنی عقل کا کرشمہ۔؟''

''راجہ گدھ سے پوچھا جائے...... ''فاسفورس کی بتی تین بار بجھی۔

سرخاب نے راجہ گدھ کو مخاطب کر کے پوچھا...... ''کیا تو بتا سکتا ہے کہ اولاً تیری سرشت کیا تھی۔''

راجہ گدھ نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''آقا! یہ اپنی اولین سرشت کو بھول چکا ہے!'' گیدڑ نے التجا کی۔

سرخاب نے سخت لہجے میں سوال کیا...... ''تو یہ بتا کیا تجھ میں انسان کی طرح

تضاد کا خمیر موجود ہے؟''

''نہیں...... فاضل سرخاب نہیں۔''

''کیا عشق لاحاصل کے آب حیات سے تجھے گوندھا گیا۔''

''نہیں بڑی شان والے میری سرشت میں عشق کا عرفان شامل نہیں۔''

''تو کیا تو تھکا دینے والی جستجو کا حامل ہے؟ کیا تیری سرشت میں ایسی تلاش ہے جو زمان و مکان سے پرے کھینچتی ہے ایسی تلاش جو کثرت میں وحدت کی متلاشی رہتی ہے۔''

''کیا تو بے نشان منزلوں کی تلاش میں دیوانہ ہوا؟۔''

''نہیں...... کھلیانوں کے پاسبان ایسا نہیں۔ میری سرشت کو تلاش سے کوئی سروکار نہیں۔''

''پھر یہ بات طے ہے کہ تو مردار کھانے کے باعث دیوانہ گردانا گیا؟۔''

''شاید۔''

فاسفورس کی باطنی روشنی تین بار گل ہوئی اور سیمرغ کی گرجدار آواز آئی...... ''راجہ گدھ الزام تجھ پر ثابت ہوا ہی چاہتا ہے تجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہو تو کہہ۔''

گدھ مردار کھاتے ہیں

وہ جانے زیست کے کس موڑ پر رزق حرام سے شناسا ہو چکے تھے۔

ان کی اڑانیں شاہیں سے بھی زیادہ تھکا دینے والی تھیں۔ گیدڑ نے تالی بجا کر کہا...... ''اس کی صفائی میں جو کچھ کہوں گا میں کہوں گا آقا!''

لیکن گدھ نے اپنی گردن زمین پر رکھ کر عرض کی...... ''نہیں اپنی صفائی میں جو کہوں گا میں خود کہوں گا۔''

سرخاب نے زور سے سانس لے کر کہا...... ''دیکھ راجہ گدھ الزام کی نوعیت بدل چکی ہے اگر تو نے کوئی تشفی آمیز جواب دے سکا بری الذمہ ہو جائے گا اگر تیرے

جواب سے حاضرین کی تسلی نہ ہوسکی تو تجھے جنگل بدر کا حکم سننا ہوگا۔

بتا بول ...... کیا تو نے اپنے ماحول سے خائف ہو کر اپنے آپ کو بدلا ...... کیا تو نے انسان کی تقلید میں اپنی سرشت بدلی؟ ...... کیا ...... وجہ تھی کہ تو نے اللہ کی دی ہوئی سرشت پر قانع نہ رہا اور مردار کھانے پر مجبور ہوا؟۔"

گیدڑ نے راجہ گدھ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ آنکھیں بند کر کے گویا ہوا

"آقا میں بھی تمام پرندوں کی طرح یکسر معصوم تھا اور اپنی سرشت بھر نیکی اور بدی کے سہارے زندگی بسر کر رہا تھا۔ میرے اندر اپنے متعلق کوئی شبہ موجود تھا نہ اپنے گردوپیش کے متعلق کوئی تجسس لیکن جس درخت پر بیٹھ کر میں شکار کے لیے نگاہیں دوڑایا کرتا اس کے نیچے ایک جوگی نے آ کر بسیرا کر لیا اس کے تن پر بھبوت کے علاوہ کوئی لباس نہ تھا رفتہ رفتہ اس کی ڈاڑھی اس قدر لمبی ہوگئی کہ وہ برگد کی جڑوں میں بیٹھا درخت کا ایک حصہ نظر آنے لگا ...... وہ سارا دن نگاہیں آسمان پر جمائے دیکھتا رہتا میں اس کی شخصیت سے اس درجہ مغلوب ہوا کہ میں نے اپنی تھکا دینے والی اڑانیں ترک کر دیں اور پہروں اسے دیکھنے کا کسب اختیار کیا

ایک روز اس نے مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں بغیر آواز کے آپس میں باتیں کرنے لگے اب ہمارا معمول ہوگیا کہ ہم دونوں روز کچھ دیر کے لیے یکجا ہوتے۔ وہ مجھے زندگی کے کئی بھید بتاتا اور میں اسے جنگل کی زندگی کے راز سمجھاتا وہ آرزو کے جنگل سے نکل تو آیا تھا لیکن تمام آرزوؤں سے چھٹکارا پا لینے کے بعد اب وہ ابدیت کے خواب دیکھنے لگا تھا وہ خدا کی طرح مستقل ہونا چاہتا تھا ہر صبح جب موت اپنے ترشول لے کر آتی اور برگد کے درخت کے سامنے ترشول پر اپنا سرخ ہاتھ رکھ کر پوچھتی ...... چلتا ہے کل آ تو جوگی ہنسنے لگتا اور کہتا ...... جا اپنا کام کر تو مجھے کیا مارے گی۔"

جب موت بہت اصرار کرتی تو جوگی کہتا جسم لے جاتی ہے تو لے جا!

موت کچھ اور تقاضے کرتی۔

میں اس کی یہ جنگ روز دیکھتا۔

رفتہ رفتہ موت کے آنے پر جوگی چھپنے لگا۔ جب وہ چلی جاتی تو جوگی مجھے بلاتا۔ ہم دونوں بغیر آواز نکالے گھنٹوں باتیں کرتے۔ ان باتوں میں وہ مجھ سے ہر روز ایک بات ضرور کہتا کہ اس کی روح ہمیشہ رہے گی موس اس کی روح نہیں لے جاسکتی۔

ایک روز صبح کے وقت جب سورج ابھی اچھی طرح دریا سے اشنان کر کے نہ نکلا تھا جوگی برگد کے سرخت سے لٹکا ہوا تھا اس نے برگد کی لٹکتی جڑ سے پھندا لے کر جان موت کے سپرد کر دی تھی۔ میں اونچی شاخوں سے اترا اور میں نے اسے اس گرہ سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میری چونچ اور پنجے گرہ کھولنے میں مصروف تھے جب اس کے لہو کی پتلی سی دھار میرے حلق میں داخل ہوئی۔

آدام زاد کا لہو۔!

''جوگی درخت سے اپنے بوجھ سمیت زمین پر جا گرا ایسے کہ میری چونچ اس کی گردن میں پیوست تھی اس وقت میری سرشت بدلی آقا! سوائے انسان کے کوئی موت سے خائف نہیں پہلی بار میں موت سے ڈرا......اس روز کے بعد میں اونچے درختوں پر موت سے چھپ کر رہتا ہوں لیکن موت سے میرا رشتہ کچھ ایسے منسلک ہو گیا ہے کہ میرے جسم میں تمام لہو مردار جسم سے بنتا ہے میں موت کا دشمن اور موت ہی کا پروردہ ہوں۔''

''پھر؟......پھر؟......'' سارا جنگل گونجا۔

''اس وقعے کے بعد میری آنے والی نسلیں حرام کھانے لگیں میں دریائے نیل کے شمال میں آباد ہو گیا۔ مجھ سے پیدا ہونے والوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جس میں ایک بھی نر باقی نہ رہا۔ وشتے بھوگ کو انہوں نے شعوری طور پر زندگیسے نکال

دیا۔ اس علاقے میں اڑنے والی مادہ گدھ جب بچہ پیدا کرنا چاہتی تھی تو ہوا میں دور تک اڑتی اڈھی اڑان میں واپس لوٹتے وقت خود بخود اس کا رحم کھل جاتا اور وہ ہوا اسے ایسے بار آور ہوتی جیسے درخت پورے پوا سے پولن لے کر بار آور ہوتے ہیں ہماری سرشت میں اس کے بعد تبدیلیاں آتی رہیں...... کچھ کا علم رہا کچھ تبدیلیوں کو ہم نے اپنی ازلی سرشت کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ ہم پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ ہم اب موت سے گریزاں لیکن موت ہی کی تلاش میں رہتے ہیں مردار جانوروں سے زندگی کی حدت حاصل کرتے ہیں چند پرند کوئی موت سے آگاہ نہیں ...... صرف انسان موت سے خائف رہتا ہے...... موت! اس کے لیے ایک حقیقت ہے آقا...... بچپن میں وہ باقی ذی روح کی طرح موت سے آشنا نہیں ہوتا لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے اور اس میں شعور پیدا ہوتا ہے وہ موت سے شناسا ہونے لگتا ہے پہلے چھوٹی چھوٹی حقیقتیں کھلتی ہیں ناپائیداری ...... بے ثباتی ...... تبدیلی ...... موسم بدلتا ہے تو وہ اندر ہی اندر ڈرتا ہے...... بچپن گزرتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر بے چین رہتا ہے...... محبوب کا رنگ روپ گہنا جائے تو وہ تلملاتا ہے...... یہ تبدیلی ناپائیداری...... یہ احساس زیاں یہ سب چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہیں جو ایک منظر کی طرف کھلتی ہیں موت کا گھپ اندھیرا...... فنا کی آخری منزل...... جانور...... پرندے ...... سب آزاد ہیں اس آزار سے...... لیکن انسان اور میری جاتی کے لوگ صدیوں سے دیوانے ہیں آقا...... صدیوں سے...... اور اسی آگاہی کی وجہ سے انسان دیوانہ ہے وہ چھوٹی سی ناپائیدار زندگی میں ہمیشہ کی بقا چاہتا ہے...... کیا اس احساس کے ساتھ کوئی دیوانے پن سے بچ سکتا ہے......"

سارے میں خاموشی چھا گئی۔

گیدڑ نے دل ہلائی اور فخر سے بولا...... "آقا! اب بات واضح ہے موت کا احساس انسان اور گدھ کی سرشت کا حصہ ہے جو فیصلے رب اور اس کی مخلوق کے

درمیان ہوں ان فیصلوں پر ہم قادر نہیں موت سے آگاہی کا مسئلہ گدھ اور اس کے رب کے درمیان ہے ہم کو اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ کون جانے اصلی مسئلہ کیا ہے۔"

"لیکن یہ آگاہی...... یہ احساس اولاد اس کی سرشت میں نہ تھا۔؟"

راجہ گدھ نے پرنام کے انداز میں پر جوڑے اور بولے......"چیل جاتی کی ملکہ دیکھ تو اپنے آپ کو شانت رکھ! اور میرے رب اور اس کی بنائی ہوئی سرشت کو سمجھنے کی کوشش نہ کر...... ہم تو خود ہجرت کرنے والوں میں ہیں ہمارے لیے قیام اور سفر میں فرق نہیں لیکن جانے سے پہلے ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔"

گیدڑ نے اونچے اونچے رو کر کہا......"یہ تو کیا کر رہا ہے راجہ گدھ۔!"

راجہ گدھ نے نظریں جھکا کر جواب دیا......"آقا! ہم جا رہے ہیں ہرے بھرے جنگلوں کو چھوڑ کر اجڑے بنجر علاقوں کی طرف لیکن ایک غلط فہمی میں مت رہنا...... دیوانگی دو طور کی ہوتی ہے......ایک دیوانہ پن وہ ہوتا ہے جس کی مختلف وجوہات یہاں بیان کی گئیں......جن کی وجہ سے حواس مختل ہو جاتے ہیں اور انسان کائنات کی ارذل ترین مخلوق بن جاتا ہے......لیکن ایک دیوانگی وہ بھی ہے جو انسان کو ارفع و اعلٰے بلندیوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی میں تنکا اوپر اٹھتا ہے...... پھر وہ عام لوگوں سے کٹتا جاتا ہے...... دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اوپر اوپر اور اوپر چلتا جاتا ہے...... حتیٰ کہ عرفان کی آخری منزلیں طے کرتا ہے...... عام لوگ اسے بھی پاگل سمجھتے ہیں...... لیکن انسان جب بھی ترقی کرتا ہے پاگل ہوتا ہے...... اس وقت وہ ایسے زہر آگیں بم بنا رہا ہے جن سے یہ کرہ زمین تباہ ہو سکتی ہے...... یہ اس کے دیوانے پن کی دلیل ہے...... لیکن جب اس کرہ ارض کو بچانے کی ضرورت آئے گی۔ تب بھی ایک مقدس دیوانے آئے گا...... کاش ملکہ چیل کو میرے دیوانے پن پر اس قدر اعتراض نہ ہوتا تو ہم یونہی دوں کے لیے نئی سمتیں

نئے دروازے ...... نئی جہتیں کھول دیتے ہمارا دیوانہ بھی عرفان کی ایک شکل ہے ......''

راجہ گدھ نے اپنی برادری کا حکم دیا اور وہ چپ چاپ پرے باندھ کر جنگل سے نکل گئے۔ آہستہ آہستہ تمام پرندے جنگل سے کھسکنے لگے۔ برگد کے درخت میں روشنی نہ رہی صرف دیر تک چیل برادری کے لوگ چپ چاپ تال میں بیٹھے رہے اور ہاتھی ڈوباؤ گھاس سے سانپوں کی سائیں سائیں فیڈ بیک ہوتی رہی۔

☆☆☆☆☆

بظاہر افتخل کی موت کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن دفتری کام کرنے کی ...... اہلیت اچانک مجھ میں نہ رہی اور میں نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ ادھر بھابھی صولت میرے لیے لڑکی تلاش کرنے میں مصروف تھیں ادھر میں کمرے اور کوٹھے کی چھت پر گھومتا رہتا بے مصرف بے ارادہ جاگتے میں سونا اور سوتے وقت چوکس رہنا میرا معمول ہو گیا۔ پہلے مجھے انہاک سے کتابیں پڑھنے کی عادت تھی اب مطالعہ عبث خیالات کے ہیر پھیر کا باعث ہوتا پہلے میں نے کئی ناول شروع کیے لیکن تعجیل کی وجہ سے میں آخری صفحے پہلے پڑھ لیتا، پھر باقی ناول پڑھنے میں لطف باقی نہ رہتا۔ سیاست، سوچیالوجی اور سائیکالوجی کی کتابیں دل چسپ تھیں لیکن ان کے مطالعے میں دماغی توجہ کو دوڑنے پھرنے کی مہلت نہ ملتی۔ ایک ایک جملہ کئی بار پڑھنا پڑتا پھر کچھ عرصہ میں نے جاسوسی کہانیوں سائنس فکشن پر بسر کیا۔ ان کی طلسماتی فضا بھی موافق نہ آئی جنس اور شادی سدہ محبت کے متعلق کتابوں سے بازار بھرے پڑے تھے۔ ان کتابوں میں وہی بات بار بار دوہرائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے دو چار کتابوں کے بعد دلچسپی کا گراف گرنے لگا۔ سفر نامے اور یادداشتیں وقت کٹی کا باعث ہوتیں اگر میں موجود رہ سکتا مطالعے میں جو سب سے بڑی مشکل درپیش تھی وہ یہی تھی کہ کاغذ کی سطح پر الفاظ کے ساتھ ساتھ واقعات، چہرے، کیفیات، باتیں حتیٰ

کہ خوشبوئیں بھی تیرنے لگتیں دماغ کہیں کا کہیں بھٹک جاتا اور ایک ایک صفحہ کئی کئی گھنٹوں میں ختم ہوتا۔ کتابوں کی پناہ جب تمام وجود کو مرکز پر لانے سے قاصر رہتی تو میں اٹھ کر باہر شہ نشین پر جا بیٹھتا کبھی کبھی آسمان کو تکتے مجھے آدھی رات ہو جاتی چاند راتوں میں مجھے لگتا جیسے میں ثقل مہتاب کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھ رہا ہوں بالکل سمندر کی لہروں جیسی بیتابی مجھ میں پیدا ہوا جاتی۔ چاند کی روشنی میرے وجود میں شبنم کی طرح اترتی اور میں محسوس کرتا کہ میرا جسم پتھر کی طرح ٹھنڈا رہنے لگا ہے ایسے میں بار بار میں اپنے ہاتھ پوؤں دیکھتا اس روشنی میں مجھے اپنے جسم پر قلعی کیے ہوئے برتن کا شبہ ہوتا۔ میری آرزو ہوتی کہ میں کسی سارس کی طرح پہروں ایک ہی ٹانگ پر کھڑا رہوں چپ چاپ!

جسمانی طور پر بھی میں نارمل نہ تھا سارا منہ کڑوا رہتا اور زبان پر کتھئی رنگ کا لیپ چڑھا نظر آتا۔ دن کے وقت میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کچھ نہ کچھ کھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن سہ پہر کے قریب ایک غبار سا دماغ کو چڑھنے لگتا پہلے معدے میں جلن شروع ہوتی پھر جلن کا غبار بن کر سینے میں اوپر کی طرف اٹھنے لگتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ تھوڑی دیر بعد میرا دل بند ہو جائے گا کئی گولیاں اور مکسچر میرے پاس جمع ہو گئے تھے اصلی دورہ رات کو ایک اور تین کے درمیانی وقفہ میں شروع ہوتا اس وقت میرے ہاتھ پاؤں میں پہلے چیونٹیاں سی چلتیں بعد میں سارے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اس لرزے کی وجہ سے میں خﷺف زدہ رہتا دن کے وقت بھی مجھے اس لرزے کا خوف متوحش کرنے کو کافی تھا میرے آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور کان باہر کو نکلے ہوئے دکھائی پڑتے۔ ہوتھوں کو دیکھتے رہنا میرا محبوب مشغلہ تھا ان کا کھردرا پن ہیت ناخن ہاتھوں کی لکیریں میری دلچسپی کا باعث تھیں السر کی تکلیف کے باعث میں بار بار ڈاکٹر سے ملتا ایک ڈاکٹر تسلی بخش ثابت نہ ہوتا تو پھر کسی اور ماہر کے پاس منتقل ہو جاتا حالانکہ میرے اندر غالبا یہ آرزو

تھی کہیں میں ٹھیک نہ ہو جاؤں میں anxiety اور withdrawal کی وجہ سے کبھی دوست نہ بنا سکا کالج کے دوست تو چھوٹ ہی چکے تھے اب ریڈیو سٹیشن سے بھی کوئی ملنے آجاتا تو میں یہ بہانا بنا دیتا کہ میں گھر پر نہیں ہوں ...... میں اندر سے یوں یخ ہو چکا تھا جیسے کنوئیں میں اگے ہوئے خودرو پودے ......

اول تو میں ساری رات جاگ کر گزارنے کا خواہش مند رہتا۔ لیکن اگر ڈاکٹر کی دی ہوئی خواب آور دوائیوں سے نیند آجاتی تو اچانک پسینے میں شرابور آدھی رات کو آنکھ کھل جاتی جونہی آنکھ کھلتی مجھے محسوس ہوتا جیسے کمرے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی ہے اور میں آسنوگیس کے مرض میں مبتلا ہوں ایسے میں میرے پھیپھڑے شدید گھٹن محسوس کرتے لیکن مجھے کھانسی نہ آتی فقط حلق کا پردہ بند ہونے لگتا میرا منہ ایسے سوکھ جاتا جیسے میں صحرائے گوبی میں سفر کر رہا ہوں ہڑبڑا کر میں بستر چھوڑ دیتا گرمیوں کا آغاز تھا نلکے کے نیچے سر رکھ کر میں پانی کھول دیتا۔ جب ٹھنڈے پانی کی جھلار سے کچھ افاقہ ہوتا تو پھر میں باہر کوٹھے پر جا کر شہ نشین پر جا بیٹھتا یہاں بھیگے سر کی وجہ سے ایک بار بلبلا کر تھرتھری چھوٹ جاتی ایسا لرزہ طوری ہوتا کہ پاؤں کے انگوٹھے تک کانپتے نظر آتے کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ میں نیچے جا کر صولت بھابھی سے اپنی حالت کہوں اور پھر ان کے گلے لگ کر اونچے اونچے رونے لگوں ...... لیکن بھابھی صولت اور بھائی مختار گڈی کاغذ میں لپٹے رہتے تھے ایسے کہ نظر تو آتے لیکن ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔

نیند کا وقفہ گو کم تھا لیکن ان میں آنے والے خواب لاتعداد تھے۔ خوابوں میں نہ کبھی سیمی نظر آئی نہ عابدہ نہ امتل ...... بلکہ ایسی انجانی لڑکیاں جو کبھی کبھار ریڈیو سٹیشن پر نظر آتی تھیں جب بھی کوئی لڑکی مجھے خواب میں دکھائی دی اس کا دہن ہمیشہ پھٹا ہوا ہوتا جیسے ہاتھ ڈال کر مچھلی کے گلپھڑے نکال لیے جائیں ایسے ہی لڑکی کی زبان دانتوں کے اندر سے نظر آتی بے آباد ریگستان اور ریگستانوں میں گھومنے والا

چھوٹا سا خرگوش بمباری سے تباہ شہر اور شہر میں بجنے والا اکلوتا سائرن ...... اندھے کنویں میں مصلوب کتا ...... بنجر زمین میں مری ہوئی ویل مچھلی بغیر پائیلٹ کے اڑنے والا جہاز پانیوں کے بغیر کھدی ہوئی نہریں ...... انسانی ڈھانچے قبروں کے اندر اور باہر ٹن ٹا ٹن ٹوٹنے والے برتن ...... اور ان سب خوابوں میں ہر جگہ خالی براؤن گدھ ...... چپ چاپ دم سادھے ...... شانت پرانت ...... ٹولی در ٹولی ہجرت کرتے ہوئے جنگل سے کوچ کرتے ہوئے۔

جاگنے کا سماں سونے کے وقت سے بھی نرالا تھا۔

صبح شیو کرتے وقت مجھے اپنی شکل یوں نظر آئی جیسے روشنی کی سفید کرن طیف منچوری میں سے نکل کر سر رنگوں میں بدل جاتی ہے سادہ شیشے میں میری شکل کئی چکلوں میں منتقل ہو جاتی کسی عکس میں مونچھ غائب ہوتی۔ کسی حصے میں بابر بادشاہ جیسی ڈاڑھی نظر آتی کبھی کبھی اوپر والے ہونٹ پر لپ سٹک لالیپ ہوتا۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی ہوتی کبھی کسی چہرے کی آنکھیں غائب ہوتیں آئینے میں نظر آنے والی صورتوں سے میں خوفزدہ ہو جاتا۔ پھر میں الماری کھول کر اندر دیکھا مجھے یقین تھا کہ الماری میں ٹرنک کے اندر گدے کے نیچے مجھ سے مشابہ کئی بونے رہتے ہیں اور کسی دن مجھے اکیلا پا کر وہ مجھ پر اچانک حملہ آور ہو جائیں گے۔

چونکہ میرا دن زیادہ تر گھر پر گزرتا اس لئے لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکتی۔ اسی دوران ایک دو خط ڈاکٹر سہیل کے آئے۔ وہ امریکہ میں دھڑا دھڑ تجربات علمی وسعت اور مغربی کلچر سیکھ رہا تھا۔ اس کے ایک خط میں درج تھا کہ وہ ایک ٹاپ لس بار پر گیا۔ لیکن ایسی جگہیں اتنی ہلا دینے والی ہوتیں ہیں کہ دوباری جانے کی ہمت نہیں ہوئی مجھے وہاں کا کلچر اور اپنے کلچر کے تقابل؛ میں کوئی دلچسپی نہ تھی امریکہ اخلاقی طور پر تنزل کی طرف راغب تھا کہ سائنسی اعتبار سے عروج کی جانب مجھے کسی ملک کسی مذہب کسی انسان کے عروج اور زوال کی پروا نہ تھی میں نے پہلے

پروفیسر سہیل کو خط لکھنے چاہے لیکن اب میں سہیل کے مشورہ سے آگے نکل گیا تھا۔ اختل کے مرنے کے تیسرے روز بعد مجھے آفتاب کا خط بھی ملا لیکن چونکہ اس میں کوئی پتہ نہیں تھا اس لیے میں جواب دینے کے فرض سے آزاد ہو گیا۔ ہاں یہ بات اس میں قابل ذکر تھی۔

''میرا خیال تھا تم سیمی کے بہت قریب ہو لیکن سیمی کے بعد تم نے بھی مجھے خط نہیں لکھا...... کیا بات ہے کیا وطن میں کسی کو بھی پروا نہ تھی ...... وہ کیسے مری؟ ......کیوں مری ...... تمہیں تو معلوم ہوگا؟۔''

کئی دن میں یہ خط پڑھتا تہا میں نے خواب بھی لکھا پھر مجھے محسوس ہوا جیسے آفتاب نے جان بوجھ کر مجھے ایڈریس نہیں لکھا۔ وہ میرے خط کا منتظر نہ تھا۔ شاید اسے سیمی کے متعلق درست انفرمیشن بھی درکار نہ تھی۔

تنہائی بیماری، غم خوری اور بے اعتدال عادتوں کے باعث میں جلد کسی ہسپتال میں پہنچ جاتا اگر بھابھی صولت میرے لیے ایک لڑکی تلاش نہ کر لیتی۔ اس روز اچانک آسمان ابر آلود ہو گیا۔ سارے آسمان پر بھاری پستانوں کی شکل کے گول گول بادل چھائے تھے آسمان مائیکل اینجلو کی بنائی ہوئی تصویر نظر آتا تھا۔

میں چہ نشین پر بیٹھا تعجب سے آسمان کے ان ہی بادلوں میں حلول کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب بھابھی صولت اوپر آئیں وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئیں۔

''قیوم!۔''

''جی۔؟۔''

''اوپر کیا دیکھ رہے ہو۔''

''بادل دیکھ رہا تھا۔'' میں نے نظریں جھکا کر کہا

''تمہارے لیے میں نے لڑکی تلاش کر لی ہے۔''

"میں عابدہ کی بہن سے شادی نہیں کروں گا۔"

"نہیں بھئی......وہ نہیں یہ اور...... ہے۔"

وہ شہ نشین پر پہلی مرتبہ میرے قریب بیٹھ گئیں...... "ستاروں نے بھی اسے بے نقاب نہیں دیکھا صوم وصلوۃ کی پابند......سلائی کڑھائی اچھی......کھانا پکانا جانتی ہے بڑے اچھے لوگ ہیں۔"

"آپ تسلی کرلیں۔"

"بالکل باکرہ باعصمت لڑکی ہے جیسی تمہیں درکار ہے بالکل ویسی۔"

پہلی مرتبہ میں نے جرائت کے کے پوچھا......آپ کو کیا معلوم ہے کہ مجھے کیسی لڑکی چاہیئے۔

بھابھی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا...... "مجھے معلوم ہے ناں ......تم چاہتے ہو کہ...... کہ تمہیں ایسی لڑکی ملے جو پہلی نظر میں تمہاری ہو جائے۔ ہے نا؟"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"جی ایسی......کہاں......!"

"بس وہ ڈبے میں پیک ہے پوری طرح......تم ہی اس کا کاربن کھولو گے پہلی بار۔"

میں چپ ہو گیا۔

"کوئی فکر نہ کرو قیوم وہ خوبصورت بھی بہت ہے۔ پڑھی لکھی تو خیر زیادہ نہیں لیکن خوبصورت بہت ہے۔"

مجھے سردست لڑکی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے نگاہیں آسمان پر جمالیں وہاں بڑے بڑے مرور پستانوں جیسے بادل ساکت کھڑے تھے مجھے یوں لگا جیسے ابھی ان میں سے دودھ برسنے لگے گا۔

"مجھے افسوس ہے۔"

''کس بات کا بھابھی؟''

''ہر بات کا...... اماں جی کی موت کا...... ابا جی کے پاگل پن کا...... اور...... اور

......''

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے منہ پھیر لیا اور وہ چپ چاپ نیچے چلی گئی۔ میری نظروں میں چندرا گھوم گیا۔

ہمارے گاؤں کو مکمل طور پر کلر کھا گیا تھا۔ آخری بار جب بھائی مختار ابا سے ملنے گئے تو انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا...... لیکن میں اخری بار ابا سے مل چکا تھا مجھے معلوم تھا کہ ابا حویلی چھوڑ کر کبھی لاہور نہیں آئے گا پھر بھی میرے اندر ہی اندر کہیں آرزو تھی کہ ابا لاہور آجائے مجھے وہ ماں کی آخری نشانی لگتا تھا۔ میں بھائی مختار کی آمدورفت میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ لیکن جس روز انہیں شیخوپورہ سے واپس آنا تھا میں ایک موہوم امید کے ساتھ ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ وہ گاڑی سے اترے ابا ان کے ساتھ نہیں تھا مجھے سٹیشن پر پا کر لمحہ بھر کے لیے ان کی اانکھوں میں حیرانی آئی اور پھر انہوں نے مجھے بیگ ایسے پکڑا دیا جیسے انہوں اسٹیشن پر لینے جانا میرا معمول ہی ہو۔

ہم دونوں چپ چاپ ٹیکسی میں بیٹھ گئے مجھے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ تھی وہ کچھ بھی بتانے پر رضامند نہ تھے سارا راستہ میں شیشے سے باہر دیکھتا رہا اور وہ سیٹ کی پشت سے سر لگائے آنکھیں بند کیے اصل موضوع سے گریزاں رہے جب ہم دونوں کرشن نگر کی حدود سے آگے کھیتوں کھلیانوں والے حصہ میں پہنچے تو میں نے ڈرتے ڈرتے بھائی مختار پر نظر ڈالی۔

''گاؤں کیسا تھا؟''

انہوں نے بغیر آنکھیں کھولے کہا...... ''اب گاؤں کہاں؟ لوگ سب چلے گئے ڈھور ڈنگر مر کھپ گئے۔ مکان تقریباً گر گئے کنوئیں تال سب کھاری پانی سے بھر گئے

گاؤں اب کہاں؟"

"اور ابا؟"

مختار بھائی چپ ہو گئے۔

"ابا کو ساتھ نہیں لائے آپ۔"

"وہ نہیں آ سکتا اب۔"

"کیوں؟......"میرا دل دھڑکنے لگا۔

پہلی بار بھائی مختار نے اتنی لمبی بات کی......"جس روز میں رات کو پہنچا ہوں وہ اوپر والے چوبارے پر کھڑا تھا۔ میں بھی اوپر چلا گیا اس نے مجھے پہچانا نہیں ...... میں پاس گیا......سلام کیا......ابا بولا......چلو میں تیار ہوں اتنی دیر کیوں لگائی میں تو ہر روز تمہاری راہ دیکھتا تھا پھر ابا اتنی تیزی سے نیچے اترا کہ میں حیران رہ گیا چلو......سیڑھیوں سے اتر کر اس نے کہا اب کل چلیں گے ابا آج تو نہیں جا سکتے ناں کل شیخوپورہ سے روانہ ہوں گے یہ بات سن کر اس نے مجھے غور سے دیکھا دیکھتا رہا اور اچھا اچھا کہتا رہا بہت دیر کے بعد دیوار کے ساتھ لگ کر بولا لیکن میں شیخوپورہ تو جانا نہیں چاہتا مجھے وہاں کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ تم مختار بھائی کے پاس سے نہیں آئے؟......نہیں ابا لاہور چلیں گے......میں نے جواب دیا وہ چپ ہو گیا اور جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا......کون ہو تم؟......جب میں نے اپنے باپ سے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا۔ اچھا میں کچھ اور ہی سمجھا تھا تم وہ نہیں ہو جس کا مجھے انتظار ہے۔"

ڈرتے ڈرتے میں نے سوال کیا......"اسے کس کا انتظار ہے مختار بھائی۔"

"وہ......وہ موت کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید جس روز سے وہ پیدا ہوا ہے اسی روز سے اسے موت کا انتظار ہے لیکن......اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ رات کو میں اسے مناتا رہا کہ وہ میرے ساتھ لاہور چلا آئے لیکن وہ بولا نہیں مانا نہیں بس

چپ چاپ چھت کی طرف دیکھتا رہا صبح میں اٹھا تو وہ اپنے پلنگ پر نہیں تھا۔"

"کہاں گیا؟۔"

"پتہ نہیں...... تین دل مسلسل میں اس کی تلاش کرتا رہا لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملا شاید...... وہ اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔ یا شاید وہ کہیں چلا گیا سڑکوں پر مزاروں پر ...... بازاروں میں...... ایسے لوگ ہوتے ہیں ناں قیوم۔"

بھائی مختار خاموش ہو گئے ہم ساندکلاں کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ ہم دونوں میں جو سانجھا رشتہ تھا تین دن کی مسلسل کوشش کے باوجود اس رسی کو وہ ساتھ نہ لا سکا جس پر چل کر ہم نٹ بازی گروں کی طرح ایک دوسرے کی طرگ بڑھ سکتے تھے۔ ابا شاید ان لوگوں میں سے تھا جو ساری عمر موت سے محبت کرتے ہیں انہیں زندگی سے اگر پیار بھی ہوتا تو وقتی...... موت ہی کی کشش انہیں زندی رہنے پر مجبور کرتی ہے!۔

میں اور بھابھی صولت خاموشی سے ٹیکسی میں بیٹھے رہے موچی دروازے کے باہر جہاز مونگ پھلی چلغوزے اور دیگر ڈرائی فروٹ کی دوکانیں ہیں۔ بھٹیاں بھنے ہوئے چنے پھلیاں تھوک کے بھاؤ بیچتے ہیں یہاں ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل چل دیے...... گرمیوں میں یہ بازار باہر کی نسبت بہت ٹھنڈا تھا اس بازار کی اشیاء لوگ اور بولی سن کر لگتا تھا جیسے ہم کسی قصابی علاقے میں آ گئے ہیں چھوٹی اینٹوں کے مکان تین تین منزلہ اوپر کر نکلے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے اوپر جا کر ان کے ماتھے آپس میں مل جائیں گے۔

اچار والوں کی دوکان کے پاس سے جہاں سامنے ہی پتنگوں والے نے بڑے بڑے قدآدم پتنگ سجا رکھے تھے ہم ایک بغلی گلی میں مڑ گئے۔ یہاں ہی اس گلی میں روشن کا مکان تھا یہ مکان ضرور غدر سے پہلے تعمیر ہوا ہو گا اس کے چھجے شہ نشین

کھڑکیاں اندر داخل ہونے والا دروازہ سب علی بابا کے عہد کی چیزیں تھیں اندر مکان کے فرشوں میں کالی سیاہ شطرنج بچھی تھی۔ جس کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا وہ بیک وقت بیٹھک آفس اور مہمان خانہ تھا۔ ایک کونے میں ہر ٹیبل فین پڑا تھا جو ہماری آمد سے لے کر ہماری رخصتی تک بہت کوشش کے باوجود ایک بار بھی نہ چلا۔ صوفوں پر سفید چادریں اور پلنگ پر کڑھائی سے اٹا ہوا لیس لگا پلنگ پوش چھا تھا۔

ہماری آمد کے بعد روشن کی ماں آئی ماں کے بعد روشن کی دو چھوٹی بہنیں دو ممانیاں اور پھر ایک پھوپھی آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد مرد آنے شروع ہوئے آہستہ آہستہ کمرے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جس پر کوئی بیٹھا نہ تھا۔ میزوں پر کوکا کولا پھل موچی دروازے کی خاص مٹھائی شامی کباب اور جانے کیا کیا سجا دیا گیا وہ تمام لوگ نروس ہونے کی وجہ سے خاموش تھے صرف گلبرگ میں بیاہی ہوئی ایک پھوپھی اپنے رتبے کے اعتبار سے بات چیت کرتی رہی۔

''آپ ریڈیو سٹیشن پر کام کرتے ہیں ناں...... پھوپھی نے سوال کیا۔''

''جی۔''

''آج کل چھٹی پر ہیں ان کی طبعیت کچھ ٹھیک نہیں آجکل......'' بھابھی صولت نے میری طرف سے جواب دیا۔

''آپ حامد صاحب کو جانتے ہیں؟''

''کون سے حامد صاحب۔''

''وہ میرے شوہر کے کزن ہیں ریڈیو سٹیشن پر انجنیر ہیں۔''

مجھے چھوٹے سے قد کے سیاہی بکری جیسے حامد صاحب یاد آ گئے۔

''جی جانتا ہوں''

''ذکی صاحب کے گھر بھی آنا جانا ہے ہمارا۔''

''کون ذکی صاحب......؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ ڈراموں میں کام کرتے ہیں بڑی مزاحیہ طبعیت ہے ان کی ...... میرے بچے انہیں بہت پسند کرتے ہیں جب بھی ہمارے گھر میں کوئی فنکشن ہوتا ہے وہ ضرور آتے ہیں اپنے سازندے بھی لے کے آتے ہیں ریڈیو سٹیشن کے۔ انہیں بڑے فلمی گانے آتے ہیں۔''

مجھے سرے سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ ذکی صاحب کون ہے لیکنمیں نے لاعلمی ظاہری کر کے پھوپھی کو شاک کرنا مناسب نہ سمجھا

''بڑے اچھے آرٹسٹ ہیں۔''

''ان کو تو فلم میں کئی آفر آ چکی ہیں لیکن وہ جاتے نہیں کہتے ہیں فلم کا ماحول خراب ہوتا ہے ...... بڑے شریف آدمی ہیں ہم جب بھی پارٹی کرتے ہیں انہیں ضرور بلاتے ہیں کوئی مانڈ نہیں کرتا۔''

موچی دروازے کی باقی سادہ لوح عورتیں تحیر سے ہم دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ شلوار قمیضوں میں ملبوس تاجر پیشہ، دوکاندار مرد کھانے کی چیزیں لانے میں مصروف تھے پھوپھی کی معلومات کے اگے کسی کا دیا جل ہی نہیں سکتا تھا۔

بڑی دیر تک پھوپھی جان مجھ سے گلبرگ والوں کی باتیں کرتی رہیں۔ پھو انہوں نے اس سامان کا ذکر شروع کر دیا جو وہ حال ہی میں ہانگ کانگ سے لائی تھیں اس کے بعد انہوں نے اپنے بچوں کی پڑھائی کے مسئلے پر مجھ سے رائے چاہی اس موضوع کے بعد انہوں نے پاکستانی کردار کی دھجیاں بکھیریں ہم لوگ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کس قدر پست کردار ہیں اور کیوں ہیں اس کا تجزیہ کیا حالیہ سیاست پر اظہار خیال ہوا یہ ٹاپک ختم ہو تو انہوں نے مرد عورت کے باہمی تعلقات اور مرد کی فطری کمزوری اور جبلی کمینگی پر بڑی فصیح گفتگو کی اس دوران بھابھی صولت مکان کے اندر روشن سے ملنے چلی گئیں۔

بڑی دیر بعد بھابھی صولت باہر آئیں تو ان کے ساتھ روشن تھی۔

میں نے اسٹیج کے سامنے کھڑے دیکھا...... موتیا رنگت، ہلکا زرد لباس، پھیکے پھیکے ہونٹ اور بہت خوبصورت ہاتھ...... اس کے بعد میں نے اس پر نظر ڈالی۔ وہ مجھے پیلی موم کا بت نظر آئی اس کی پلکیں رخساروں سے پیوست تھیں غالباً اس نے میری طرف ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا کمرے میں شام کا اندھیرا چھایا ہوا تھا جس وقت پھوپھی نے پہلا بلب جلایا میں اور صولت بھابھی وہاں سے رخصت ہوئے۔

واپسی پر پتنگ بازار میں سے چلتے ہوئے بھابھی صولت نے پوچھا۔ ''کیسی ہے؟''

''اچھی ہے۔''

''سب سے اچھی بات بتاؤں سخت پردے میں پلی ہے۔ ماموں زاد، چچا زاد پھوپھی زاد بھائیوں سے بھی ملنے کی اجازت نہیں تمہاری طرف بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا خوش نصیب ہو قیوم...... ایسی لڑکی اب ان ہی علاقوں میں مل سکتی ہے ورنہ اگر گلبرگ ہیں ڈھونڈتے تو بڑی تیز لڑکی ملتی۔''

میرے دل میں چھوتی سے امید کرن پھوٹی۔

بقول افتل ہر انسان کے اندر ایک چھاٹا سا رب چھپا ہوا ہے جو چاہتا ہے کہ زندگی میں اسے ایک سچا پجاری ایک صادق عبد اور ایک سر ہتھیلی پر رکھنے والا عاشق مل جائے جس وقت اللہ نے حضرت آدم میں اپنی روح پھونکی۔ اسی وقت سے یہ چھوٹا خدا اس بات کا آرزومند ہوا۔ اسی لیے آدم کی خواہش کے احترام میں حضرت حوا وجود میں آئی یہ بات ہے کہ اس کے بعد حضرت آدم اللہ کے سچے عبد نہ رہے لیکن چھوٹا سا رب بننے کی تمنا ان کے ساتھ ہی زمین پر آئی۔

میں بھی کسی پجاری پر اپنی ذات کا مکمل بوجھ ڈال کر آزاد ہونا چاہتا تھا۔ انسان ساری عمر آزادی کی خواہش میں بھٹکتا رہتا ہے یہ اسکی دوسری ایسی خواہش ہے جس

کے اندر تضاد پہلے سے موجود رہتا ہے چونکہ مشیت غالباً آزادی کی خواہاں نہیں اس لیے اس نے روح کو پابند کرنے کے لیے جسم کی بیڑیاں پہنائیں جب بھی روح مکمل طور پر آزاد ہو جانا چاہتی ہے یہی جسم اس کی اڑانوں کو سست رفتار کرتا ہے جب جسم پورے طور پر کھل کھیلنا چاہتا ہے اور ہر جوا اتار کر اپنے لیے مکمل آزادی کی کوشش کرتا ہے روح جسم کے اندر کبھی احساس جرم کبھی احساس گناہ تصور خدا کبھی تخیل مابعد کے نامعلوم جال پھیلا کر جسم کو قید کر لیتی ہے بنیادی طور پر شروع سے انسان قید پیدا ہوا ہے اور اس قید سے بھاگنے کی سعی میں دیوانہ اور بھاگتا رہتا ہے شاید ابا کو بھی اسی قید کا شاید احساس تھا کچھ لوگ اسی احساس سے اس قدر بوجھل رہتے ہیں کہ زندگی بھر انہیں نیستی کے سوائے اور کسی چیز سے پیار نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اسی وقت پر سکون ہوتے ہیں جب نیند یا بیہوشی کا غلبہ ان پر ہو جائے پھر ان کے اندر جسم اور روح کی جنگ وقتی طور پر بند ہو جاتی ہے عمر رفتہ میں محبوس یادیں ان کا کٹھ بگاڑ نہیں سکتیں آنے والے مستقبل کی زنجیریں انہیں پابوس نہیں کر سکتیں اور وہ کچھ دیر کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں بالکل آزاد۔ آزادی کی اسی خواہش نے انسان کو ہمیشہ بے قرار رکھا ہے حالانکہ وہ اندر ہی اندر جانتا ہے کہ اس کے ضمیر میں ایک بہت بڑا حصہ غلامی کا بھی ہے......اور وہ مقید رہے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتا...... آگے نہیں بڑھ سکتا جس قدر وہ آزادی کا خواہاں رہتا ہے اسی شدت سے اطاعت غلامی اور انکساری اس کی ذات کے لیے ضروری ہوتی جاتی ہے۔

شادی سے پہلے کئی دن میں ان ہی دو خواہشوں میں پرو یا رہا ایک طرف یہ تسلی تھی کہ روشن جس وقت میرے گھر میں داخل ہوئی اس میں اتنی شکتی ہو گی کہ وہ میرے جسم اور روح کا تمام تر بوجھ اپنی محبت کے جیک پر اٹھا لے گی اور سچا پجاری پا کر آئندہ میرے تجربات میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے میں اپنے آپ میں نہیں اس کے وجود میں زندہ رہنے لگوں گا دوسری طرف مکمل آزادی کی خواہش تھی مجھے لگتا تھا اگر وہ

روزن ثابت نہ ہو سکی تو پھر میں شادی میں محصور ہو جاؤں گا جیسے کبھی کبھی ندی رستہ پا کر ایک گہری جھیل میں جا گرتی ہے اور پھر اس کے پانی نشیب کی تلاش میں نہیں رہتے صرف پاتال کی طرف اترتے جاتے ہیں اندھیرے کی طرف گرم لاوے کی طرف۔

شادی سے دو ایک دن پہلے میرے دل دماغ اور جسم بالکل سن ہو گیا۔ سارا دن میری کھوپڑی پر ڈھولک بجتی رہتی نیچے کی رونق سے گو میرا تعلق کم تھا پھر بھی یہ شادی والا گھر تھا اور میں سارا سارا دن اکیلا نہ بیٹھا رہ سکتا تھا جس وقت میں سہرا پہن کر کار میں بیٹھا آخری بار رسہ تڑوا کر آزاد ہونے کی خواہش دل میں جاگی اور جب قبول ہے قبول کے مرحلے سے گزر کر سب طرف چھوہارے اچھلے مبارک مبارک کی صدائیں اٹھیں اس وقت میں نے جانا میرے اندر کے چھوٹے سے رب نے گواہی دی کہ آج مجھے ایک سچا عاشق ملے گا جو میرے بوجھل وجود کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈال لے گا۔ اب اس خواہش کے ساتھ ہی میرے دل میں عجیب قسم کی خوشی بیدار ہوئی ایک خاص قسم کی ecstasy جیسے بہار کے دنوں میں خوشبو سے بوجھل ہوا ہوتی ہے۔

رات گئے تک میں نیچے بھابھی صولت اور بھائی محتاط کے مہمانوں میں گھر ابیٹھا رہا کچھ ریڈیو سٹیشن کے ساتھی بھی موجود تھے کچھ آرٹسٹ برادری بھی آن پہنچی تھی۔ ان لوگوں کے بے تکلف لطیفوں نے مجھمیں اور بھی خوش اعتمادی پیدا کر دی اور مجھے ان سلیم شاہی جوتیوں نے کاٹنا بند کر دیا جو میرے پیروں میں کچھ کچھ تنگ تھیں آدھی رات کے قریب میں اوپر گیا...... یہ وہی کمرہ تھا جہاں عابدہ چائے کی ٹرے اور مونگ پھلیوں کا لفافہ لے کر آیا کرتی تھی اسے بیک وقت مونگ پھلیاں کھانے اور باتیں کرنے کا کس قدر شوق تھا...... عابدہ کہاں تھی؟...... جس نے بچے کی آرزو میں اپنے آپ کو تنتر ا یوگا پر آمادہ کیا تھا......شاید وہ بھی مہمانوں میں تھی لیکن آج میں

سارا دن اسے پہچاننے سے بھی قاصر رہا۔

کمرے کی صورت پھولاور ہاروں کی وجہ سے بدلی ہوئی تھی ہر جگہ نئے سوٹ کیس سرخ کسہری کاغزوں میں لپٹے ہوئے ڈبے پڑے تھے کمرے میں باسی چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ ساتھ دلہن کی خوشبو تھی ہم دونوں اکیلے تھے اور شادی شدہ تھے۔۔۔۔۔۔ بڑی آرزوؤں کے ساتھ اور بڑے عہد و پیمان کر کے ہم دونوں کو باقی کی زندگی کا سفر کاٹنا تھا۔

''میرا نام قیوم ہے۔۔۔۔۔۔'' میں نے پلنگ پر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔'' میں نے سوشیالوجی میں ایم اے کیا ہے۔۔۔۔۔۔ ریڈیو سٹیشن میں ملازم ہوں السر کا مریض ہوں، سالن میں مرچیں نہیں کھا سکتا۔۔۔۔۔۔ آپ کو اس کی طرف سے احتیاط کرنا ہوگی۔۔۔۔۔۔ مجھے ایم اے سوشیالوجی کی تعارفی کلاس یاد آ گئی۔۔۔۔۔۔ کیا انسان ساری عمر اپنا تعارف ہی کراتا رہتا ہے۔''

روشن نے بغیر تکلف کے منہ سے گھونگھٹ اتار دیا۔۔۔۔۔۔ ایسا زرد سورج مکھی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی ساری زندگی آپ کو دوں۔۔۔۔۔۔ بمع اس کی تلخ یادوں کے۔۔۔۔۔۔ کیا آپ میں اتنی ہمت ہے کہ آپ میری یادوں کا بوجھ بھی اٹھا لیں اپنے دل پر؟۔۔۔۔۔۔ اور مجھے ہلکا پھلکا کر دیں۔۔۔۔۔۔؟ میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے پیلے رنگ کے آنسو زرد گالوں پر بہنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں اس لیے غالباً وہ میری بات کی تاب نہیں لا سکی میں نے جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے اس نے مدافعت نہ کی اور چپ رہی۔

''کیا آپ میری تلخیوں کو جذب کر لیں گی؟۔۔۔۔۔۔ میں اتنا کچھ سہہ چکا ہوں کہ اگر آپ نے وعدہ نہ کیا تو میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ مینٹل ہسپتال سے مجھے صرف

آپ ہی بچا سکتی ہیں۔"

پہلی بار روشن بولی ...... چھوٹی سی کم عمر آواز جیسے کوئی نوعمر کبوتری بولے "اگر آپ نے میری تلخیوں کو جذب نہ کیا تو میں تباہ ہو جاؤں گی پوری طرح ...... پوری طرح ...... پوری طرح ......"

میرے اندر کے مرد نے بیچاری عورت کو سہارا دینے کے لیے کہا ...... "تم میرے ہوتے ہوئے تباہ نہیں ہو سکتیں روشن ...... تمہاری تمام تلخیوں کو میں جذب کرلوں گا جیسے ...... جیسے بارش کو ریت جذب کرتی ہے۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے مجھے لگا جیسے میں ٹاس ہار گیا ہوں میں نے سگریٹ سلگا لیا اور کتنی ہی دیر تک سگریٹ پیتا رہا۔

"پھر ......؟" بڑی دیر بعد میں نے سوال کیا۔

"جی ......" وہ اب ہولے ہولے رو رہی تھی اور کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر بتا رہی تھی کہ میں اسے چپ کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

"پھر ...... بتاؤ ناں ......؟"

"بتانے والی بات نہیں ہے ...... میں اچھی طرح سے بتا بھی نہیں سکتی۔"

"ہم ریڈیو والے بہت کچھ جانتے ہیں ہمارے لیے کچھ نیا نہیں ہوتا، تم بتاؤ تو سہی! ......"

دو تین گھنٹوں کے دم دلاسے کے بعد وہ اپنی تلخی کی طرف آئی۔

"جی مجھے بچہ ہونے والا ہے۔"

یکدم مجھے یوں لگا جیسے کوئی بھاری چیز میرے ماتھے سے اندھیرے میں ٹکرائی میں بھنا گیا۔ بظاہر میں نے جرات سے کہا ...... "اچھا پھر تو ...... پھر ...... تو ایک دوسری بات ہے۔"

اب وہ اونچے اونچے رونے لگی ...... "میں نے اماں جی سے بہت کہا ...... ہاتھ

جوڑے خدا قسم...... بہت منتیں کیں لیکن وہ تو کہتی ہیں میں کسی قصائی کو بیچ دوں گی اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی تیری۔"

"کون ہے وہ؟...... بچے کا باپ؟"

"ہماری گلی میں پتنگوں کی دوکان ہے اس کے باپ کی) پہلے وہ باپ کی دوکان پر بیٹھا کرتا تھا اب...... اب تو وہ جدے چلا گیا...... میرے گھر والوں نے اسے ٹکنے ہی نہیں دیا۔"

"بڑا افسوس ہے......" یہ بات میرے منہ سے بڑی فروعی لگی

"ایک روز وہ فلم دیکھنے گیا تو...... تو میرے بھائیوں نے اسے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے پکڑ لیا کالرسے...... اتنا مارا...... اتنا مارا...... بھلا اسے کیوں مارتے تھے یہ لوگ قیوم صاحب...... قصور تو سارا میرا تھا...... سارا میرا...... اس نے کئی بار میری منتیں کیں ہاتھ جوڑے لیکن...... لیکن میں اسے چھوڑ ہی نہیں سکتی نہ اس زندگی میں نہ......" یکدم وہ میرا چہرہ دیکھ کر چپ ہوگئی۔

"آپ کو میری باتیں بری لگ رہی ہیں؟...... روشن نے اٹک اٹک کر سوال کیا

"تم نے...... تو پھر تم نے یہ شادی کیوں کی روشن؟...... جب تم اس حد تک بیاہی جا چکی ہو تو اس شادی کی کیا ضرورت تھی؟"

اب اس کی آواز دھیمی پڑ گئی...... "مجھے تو ضرورت نہیں تھی جی...... یہ میرے گھر والے اگر اسے جان سے مارنے کی دھمکی نہ دیتے تو...... تو میں کبھی رضامند نہ ہوتی میرا خدا گواہ ہے۔"

اتنے زرد معصوم چہرے پر اتنی وثوق کی باتیں کچھ اوپری معلوم ہو رہی تھیں۔

"اب کیا کریں روشن؟"

وہ چپ ہوگئی پھر چپ چاپ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

"جیسی آپ کی مرضی؟۔"

''تم جدے خط لکھو کہ......وہ تمہیں آ کر لے جائے......میں تمہیں اس کی امانت سمجھوں گا۔''

یکدم اس کی آنسو خشک ہو گئے اور وہ ہکا بکا میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ دیکھتی گئی اس کی آنکھوں میں تحیر خوف کی حد تک منجمند ہو گیا تھا۔

''آپ......آپ جی؟''

''چاہو تو میں ابھی تمہیں طلاق دے دوں......چاہو تو اس کی آمد پر......فیصلہ کر دوں گا......'' میں نے جیب سے ایک خوبصورت گھڑی نکالی۔ اس گھڑی میں دن وقت مہینہ چاند رات سب کچھ نظر آتا تھا۔ یہ گھڑی میں نے اس امید پر خریدی تھی کہ جس وقت میں یہ گھڑی روشن کی کلائی پر باندھوں گا۔ اس لمحے کے بعد میں اپنی زندگی کا پیٹرن مکمل طور پر بدل دوں گا اس کے بعد میرے وجود کی تمام سوئیاں اس کی تابع چلیں گی اور اس طرح میں اپنے بوجھ سے آزاد ہو جاؤں گا میں نے گھڑی اس کے پاس رکھ کر کہا......''وقت دیکھ لو روشن......اس وقت میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ......کہ تم یہاں مہمان ہو۔ جب تک تمہارے حالات اجازت دیں یہیں رہو اپنے آپ کو میری بیوی ظاہر کرنے میں سہولت ہو تو ایسے ہی......میری بیوی کا رتبہ ناپسند ہو تو کھلم کھلا اظہار کر سکتی ہو کہ تمہارا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔'' اس کی آنکھیں بالکل ساکت مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

''آپ جی......آپ کو......'' وہ چپ ہو گئی۔

ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے پھر میں نے گلے سے پھولوں کے سنہری تاروں والے روپے کے کئی ہار اتار کر اس کے پاس پلنگ پر رکھے۔ اپنی زری کی اچکن اتار دی عین صاف کی اور وہ سلیم شاہی جوتا جو صبح سے پاؤں دبا رہا تھا اتار دیا۔

''شکر ہے تمہارے ماں باپ ماڈرن نہیں ورنہ جہیز میں ڈبل بیڈ دے دیتے......'' میں نے ہنس کر کہا......''اس صورت میں مشکل پیدا ہو سکتی تھی......آرام سے سو جاؤ

جب میں آؤں گا تو یہاں اس پلنگ پر لیٹ رہوں گا۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں اس وقت؟۔"

"کوئی خاص جگہ نہیں.....بس ایسے ہی۔"

وہ گھبرا گئی۔

"آپ بھابھی صولت کو بتانے چلے ہیں؟.....ڈر کر اس نے سوال کیا۔"

"نہیں!۔"

"اگر آپ نے کسی سے ذکر کیا.....تو میں مر جاؤں گی۔"

مجھ میں عجیب قسم کی قوت آ گئی تھی..... میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔روشن۔ .....لیکن اگر جدے والا کسی وجہ سے نہ آ سکا.....اور بچے کی آمد ہو گئی تو.....تو تم اسے میرا بچہ ظاہر کرنا۔"

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن آنکھوں سے مسلسل آنسو بہنے کی وجہ سے مجھے اس کی آنکھوں دکھائی نہ دیتی تھیں۔

"وہ ضرور آئے گا.....ضرور آئے گا.....وہ ایسا نہیں ہے جیسا اماں سمجھتی ہیں۔"

میں روشن کے قریب ہو گیا اور آہستہ سے میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر کہا....."انشا اللہ.....وہ ضرور آئے گا.....ہم دونوں دعا کریں گے۔"

یکدم روشن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا بلبلا کر بولی....."آپ کو بھی تو کچھ بتانا تھا مجھے .....آپ کو بھی تو۔"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا روشن.....بتاؤں گا کسی روز۔"

جس وقت میں سیڑھیوں سے اترا سارا گھر خاموش تھا آنگین میں بریانی اور قورمے کی خوشبو تھی سب ٹوٹے ہوئے پھول بکھرے تھے برآمدے میں قالین پر ڈھولک کے ساتھ دو تین باکری لڑکیاں بے سدھ سوئی ہوئی تھیں ان کے پاس بھابھی کے دونوں توام بیٹے مسعود اور فرید گتھم گتھا بے سدھ پڑے تھے۔اندر باہر بجلی

کے پنکھوں کی گھو کر جاگی ہوئی تھی ۔میں نے سیڑھیوں کے نیچے سے اپنا موٹر سائیکل دبے پاؤں باہر نکالا اور دور تک موٹر سائیکل کو پیدل چلاتا نکل گیا پھر یکدم اس پر سوار ہو کر میں نے ریس دی رات کے پچھلے پہر موٹر سائیکل کی آواز چنگھاڑ کر دور دور پھیل گئی یکدم مجھے یوں لگا جیسے دکھائی نہیں دے رہا میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا......خدا جانے کب سے میرے آنسو بہہ رہے تھے ۔

میں مال روڈ کی طرف سے جناح باغ میں داخل ہوا رات کے وقت منٹگمری ہال جنات کا محل لگ رہا تھا میں نے باغ میں جانے سے بہت پہلے موٹر سائیکل کا انجن بند کر دیا اور کینٹین کے قریب اسے پارک کرنے کے بعد میں بائیں جانب مڑ گیا کافور کا درخت تلے عجیب قسم کی خوشبو تھی ۔سارے باغ میں جھینگروں کی آواز اور جگنوؤں کی ٹمٹماہٹ تھی ۔باغ سے ایک خاص قسم کا خوف پھوٹ پھوٹ کر ساری طرف پھیل رہا تھا۔

میں چھتنکارے کا کافور کے سرخت تلے لیٹ گیا۔ہوا میں موت کی خوشبو تھی ۔میرے معدے میں تیزاب پھنیٹا جا رہا تھا اور منہ کڑوے کھیرے کی مانند تھا میں کچھ بھی سوچنا نہ چاہتا تھا پھر بھی یادوں کی چیونٹیاں میرے جسم پر تیر رہی تھیں ۔آہستہ آہستہ......میرے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے اور مجھے لگا جیسے میری نکسیر بہہ رہی ہے۔

شادی سے چند دن پہلے مجھ میں دو خواہشیں آگاہی کے ساتھ ابھری تھیں ۔اب مجھ پر یہ حقیقت بھی کھل رہی تھی کہ انسان جب تک چاہے جانے کی رب بننے کی آرزو رکھتا ہے وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتا ۔۔چاہا جانا اور آزاد رہنا صلیب کے بازو ہیں جن پر آدمی مصلوب ہو جاتا ہے پہلی مرتبہ مجھے مہاتما بدھ کی سمجھ آئی کہ وہ کیوں خواہشات کو ختم کر کے اپنی مکتی چاہتا تھا جب تک انسان میں ہلکی سی خواہش بھی ہو وہ

تابع رہتا ہے خواہش کی وجہ سے قیدی ہوتا ہے کبھی حاکم نہیں ہوسکتا۔ خواہش سے آزادی کیونکر ممکن ہے؟

کیونکر کیسے؟

موت سے پہلے موت ...... زندگی کے ساتھ زندگی کی نفی ...... آخر نجات سے پہلے کلی فرار۔

نجات کی آرزو تک سے ...... ہر مسلک سے ہر بت سے چھٹکارا حاصل کرنے ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان ہر قسم کے بت توڑ دے ہر مسلک سے آزاد ہو جائے۔ کسی ملت میں شامل نہ ہو۔ کسی ملک کا باشندہ نہ ہو ...... کسی معاشرہ کا فرد نہ ہو کسی۔ کلچر سے وابستہ نہ ہو۔ کسی خاندان کا فرد نہ ہو ...... نہ کسی کا عاشق ہو نہ محبوب ...... ہر کیفیت سے آزاد ...... ایسی حالت میں وہ سوائے موت کے اور کسی کا مرہون منت نہیں ہوگا کسی اور کا عاشق نہ ہوگا۔

موت جو یقینی ہے ...... موت سے پہلے موت۔

کیا انسان پیدائش کے لمحے سے لے کر موت کی گھڑی تک صرف اسی کوشش میں رہتا ہے کہ وہ کسی طرح اس محسن کو پہچان سکے جو اسے زندگی کے ہر احسان سے نجات دلا سکتا ہے کبھی کبھی اچانک کسی کے چہرے پر خاموشی اور غم کی دبیز لہریں چھا جاتی ہیں۔ کیا اس لمحے اسے مراجعت کی فکر ہوتی ہے کیا موت کا مہربان سایہ اس پر پڑتا ہے؟ کیا آبائی وطن کی طرف لوٹ جانے کی آرزو ہر ذی روح کو یہاں کی لذتوں میں بھینا آسودہ رکھتی ہے؟ کبھی کبھی بھری محفلوں میں شام کے وقت سب خاموش ہو جاتے ہیں کیونکہ موت کا فرشتہ وہاں سے گزرتا ہے اور سب کی سائیکی جانتی ہے کہ انسان موت کی مدد کے بغیر مکمل طور پر کبھی آزاد نہیں ہوسکتا خواہشات کا تمام بوجھ انسان کے کندھوں سے اتارنے والی صرف موت ہے۔

سیمی زندگی میں کتنی کرب ناک تھی ...... وہ کیسے تلملاتی رہتی تھی اور موت سے

ہمکنار ہوتے ہی اس کا چہرہ کتنا شانت ...... کیسا آزاد ہو گیا۔

اس دن کے بعد میری زندگی کا ہر لمحہ موت کے متعلق سوچنے میں گزرنے لگا۔ موت کے ساتھ ہمکلامی کے بعد مجھ میں ایسا خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ جاتا۔ مجھے گرد و پیش کی سدھ بدھ نہ رہتی اور کئی بار ایک ہی پوزیشن میں کتنی کتنی دیر بیٹھا یا کھڑا رہتا مجھے لگتا تھا جیسے میں اسی لیے پیدا ہوا ہوں کہ موت کا منتظر ہوں۔ میں جیتے جی کسی عورت کے عشق کا سہارا لے کر آزاد نہیں ہو سکتا۔ خواہشات کے خوش رنگ اور عطر بیز جنگل سے اگر کوئی چیز مجھے نکال سکتی ہے تو وہ صرف موت ہے...... اور اگر میں جسمانی طور پر نہ بھی مر سکوں تو بھی اندر مجھے مر ہی جانا چاہیے۔

اس وقت ایک گھنی جھاڑی سے ایک نوگزے آدمی برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کئی آدمی تھے۔ کسی کے سر پر بال نہ تھے اور چار ابروؤں کا بھی صفایا تھا ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی روشن مشعلیں تھیں اور وہ دائرے میں ایسے چل رہے تھے کہ نوگز آدمی درمیان میں آٹھ نمبر بناتا آگے بڑھتا اور باقی تمام بالیشے اس آٹھ کے گرد واٹر بال کی طرح گول گول چکر لگاتے آتے اس نوگزے کو میں ان دنوں بھی دیکھا تھا جب سیمی موت سے ہمکنار تھی اس وقت مجھے یقین تھا کہ اب وہ میرے خیر مقدم کے لیے آیا ہے مشعلوں کی روشنیاں کبھی تابناک ہو جاتیں کبھی بھک سے جل کر واپس مشعلوں میں گھس جاتیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے بالیشے ساری مشعلیں چاٹ جاتے، اب وہ تمام کے تمام خود مشعلوں کی طرح بھڑک رہے تھے لیکن ختم نہ ہوتے تھے کبھی کبھی جگنو سا ں بجھ جاتے لیکن پھر لحظہ دو لحظہ بعد ان کا دائرہ بھڑک اٹھتا نوگزے کو البتہ نہ ان کی فکر تھی نہ آگاہی وہ آٹھ کا ہندسہ بناتا دائرے میں آگے بڑھتا آرہا تھا۔

اپنی طرف اسے بڑھتے دیکھ کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا میں اٹھ کر بھاگنا چاہا۔

لیکن اس کی نظروں میں ایک مقناطیسی کشش تھی اس نے مجھے ایسے باندھ تکھا تھا جیسے سانپ کو بین مسحور کر لیتی ہے۔اس کا سارا تن سفید چادر میں چھپا ہوا تھا یہ چادر نہ سلی ہوئی تھی نہ کھلی...... نہ جبے کی شکل کی تھی نہ تہمد جیسی بس ایک لبادہ تھا جیسے روئی میں نگندے ڈال کر پہنی ہوئی ہے وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا لیکن ہم دونوں میں عجیب طور پر بغیر بولے گفتگو جاری ہو گئی۔

''تم مجھ سے موت کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں......ہاں...... میں جاننا چاہتا ہوں...... انسان کہاں سے آیا ہے اور کہاں چلا جائے گا......وہ...... جہاں سے آیا ہے کیا وہیں لوٹے گا کہ کہیں اور...... یہ سارا وقفہ......یہ ساری دیوانگی......اس سے چھٹکارا......کیا موت سے پہلے نہیں ہو سکتا؟......کیا آزاد ہونے کے لیے صرف اس سوئی کے ناکے سے گزرنا ہو گا؟''

وہ خاموش تھا اور میری طرف سرچ لائٹ جیسی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''بتاؤ تم بتا سکتے ہو......؟ کیا موت کی آرزو نے انسان کو دیوانہ بنا رکھا ہے......کیا ہر انسان شروع دن سے صرف موت کی آرزو کرتا ہے...... بولو بتاؤ......کیا نسل انسانی صرف تصور موت کے ہاتھوں پاگل ہوتی ہے؟ بتاؤ ناں۔''

اس کی نظروں میں جلا دینے اور بھسم کرنے کی قوت تھی۔

میں دیر تک سوال ٹکرتا رہا وہ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا صرف اس کے ارد گرد بالیشے روشنی کے گولے بناتے رہے۔

''بتاؤ......بتاؤ موت کیا ہے؟ یہ اسرار یہ بھید کیا ہے...... فنا کا ذائقہ کیا ہے؟ مر کر آدمی پر کیا بیت جاتی ہے؟''

اس نے تین مرتبہ بغیر پلکوں کے پپوٹے جھپکائے اور بغیر آواز کے گویا ہوا۔سن! جب انسن مرتا ہے تو دو آدمی مردے کے پاس آتے ہیں۔غالباً ان ہی کو منکر نکیر کہا جاتا ہے ان دونوں کا مقصد تمہیں الجھانا ہوتا ہے......ایک آدمی جھوٹا ہوتا ہے اور

ایک سچا...... جھوٹے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں اس فریب میں مبتلا رکھے کہ تم زندہ ہو۔ اور ابھی تمہاری روح واپس جسد خاکی میں چلی جائے گی سچے آدمی کو یہ مشکل درپیش ہوتی ہے کہ کس طرح آپ کو یہ یقین دلائے کہ آپ مر چکے ہیں اور اب آپ کی روح جسد خاکی میں کبھی نہ جاسکے گی...... اس مرحلے میں تین دن لگتے ہیں۔"

"پھر...... پھر؟...... پھر؟"

"بڑی رد و کد کے بعد انسان بالآخر سچے آدمی کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ وہ مر گیا ہے اب جھوٹا ساتھی رخصت ہو جاتا ہے اور سچا آدمی کئی سائز کے نیم شفاف ڈبے لے کر پہنچتا ہے...... یہ ڈبے بڑے ریفریجریٹر کے کھوکھلے سے لے کر دوائی کے کیپسول جتنے ہوتے ہیں ان سب کا رنگ ہلکا گلابی ہوتا ہے اب سچا آدمی مرے ہوئے آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان ڈبوں میں سے کسی کو منتخب کرے جس قدر بڑی روح ہوگی اسی جتنا بڑا ڈبہ تلاش کرنا پڑتا ہے کئی بار مرنے والا ل چھوٹا ہوتا ہے لیکن بڑے کھوکھے میں جا بیٹھتا ہے اور سچے آدمی کو منتوں سے منانا پڑتا ہے کہ وہ یہ کھوکھا چھوڑ دے۔ درست ڈبے کے انتخاب اور اس میں بند ہونے میں قریباً چالیس دن لگ جاتے ہیں لیکن ایک بار جب روح ڈبے میں بند ہو جاتی ہے تو پھر سچا آدمی جلدی سے ڈبہ لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔"

"کہاں...... کہاں؟"

وہ خاموش رہا اس کی ٹکٹکی سے شعاعیں نکل رہی تھی۔

"دریائے نیستاں پر...... اس سریا میں سچا آدمی وہ سارے ڈبے پھینک دیتا ہے جن میں روحیں مقید ہوتی ہیں...... ہولے ہولے تمام ڈبے اپنے اپنے بوجھ سے دریا کی تہہ میں اترنے لگتے ہیں اور ڈبوں میں روحیں بند روحیں باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں یہ ڈبے عجیب طرح سے بند ہوتے ہیں نہ کہیں زپ نہ بٹن...... نہ کنڈا...... صرف کسی ایک جنگی مناسب بوجھ پڑ جاتا ہے تو ڈبہ خود بخود کھل جاتا ہے کئی

لوگ سالوں میں قرنوں میں صدیوں میں یہ ڈبہ نہیں کھول سکتے کئی پہلے غوطے میں کچھ ایسے اطمینان سے بوجھ ڈالتے ہیں کہ کھٹاک سے ڈبے کا منہ کھل جاتا ہے اور روح تیر کر باہر نکلتی ہے۔اور کائی جمی سطح کو کاٹ کر باہر نکل جاتی ہے۔ان کے لیئے زندگی ہوتی ہے۔''

''کچھ ایسے بدنصیب بھی ہوں گے جو...... جو باہر نہیں نکل سکتے ...... وہ لوگ وہ روحیں؟۔''

''ایسے بدنصیب نیچے سطح پر جا پہنچتے ہیں یہ روحوں کا قبرستان ہے ...... یہ روحیں قیامت تک وہیں رہیں گی۔روز جزا تک ...... یہ وہیں بند سیپیوں کی طرح منتظر رہیں گی کوشش کرتی رہیں گی لیکن باہر نہ نکل سکیں گی۔''

پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ میں کافور کے درخت تلے سے اٹھا اور بھاگنے لگا۔گول داوروں میں ...... کبھی گراؤنڈ کے اندر ...... کبھی سڑکوں پر ...... کبھی درختوں کے گرد ...... کہتے ہیں کہ جب گدھ کی موت آتی ہے تو وہ مردار سے بھی منہ پھیر لیتا ہے پھر وہ ایک ٹانگ پر دور دور بنجر علاقوں میں یوں بھاگتا ہے جیسے مدتوں کا پیاسا ہو مردار جانور کا تعفن اس کے نتھنوں میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ آتا رہتا ہے لیکن اس تعفن سے اشتہا بڑھنے کے بجائے اسے متلی ہونے لگتی ہے اس کے جسم میں مردار کھانے کے خلاف احتجاج ہونے لگتا ہے ایسے میں وہ گم ہیضے کا شکار ہو جاتا ہے اشتہا عروج کو پہنچ جاتی ہے لیکن جبڑے نہیں کھلتے معدہ کچھ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے وہ بنجر زمین پر پڑے ہوئے مردار لاشوں کو دیکھ کر بھاگتا ہے اور آخر کو خاردار جھاڑیوں الجھ کر دم توڑ دیتا ہے مرے ہوئے گدھ کے لاشے کو ٹھکانے لگانے فطرت کے خاکروب نہیں آتے۔اس لاشے کو سورج کی کرنیں ...... ریت کے سوکھے انبار، خشک پتے ...... بارش اور ہوا کے تھپیڑے توڑ پھوڑ کر پھر مٹی کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

کہتے ہیں ایسی مٹی میں جو بھی بیج ڈالو ...... کبھی بار آور نہیں ہوتا ...... کبھی زمین

سے سر نکال ہی نہیں سکتا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا!

کچھ دیر تک میں اپنے اردگرد کا صحیح جائزہ نہ لے سکا دھوپ بہت تھی ماحول نیا تھا میرے بازو میں گلوکوز کی ڈرپ لگی تھی اور سامنے کرسی پر روشن بیٹھی تھی ......روشن سے کوئی یقینی تعارف نہ تھا شاید میں اسے پہچان ہی نہ سکتا......اگر اس کے ساتھ دائیں بائیں بھائی مختار کے دونوں بچے کھڑے نہ ہوتے۔ بھابھی صولت میرے پائنتی بیٹھی تھیں اور منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔

''اب طبعیت کیسی ہے......'' روشن نے سوال کرتے ہی نظریں جھکا لیں۔

''باتیں نہ کرو......'' بھابھی صولت نے خفگی کے ساتھ کہا...... ''پتہ نہیں ڈاکٹر نے منع کیا ہے......اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

''چچا جی آپ جناح باغ کیوں گئے تھے؟......'' مسعود نے پوچھا۔

''آپ چڑیا گھر گئے تھے نا...... چاچا جی نیا زیبرا دیکھنے......؟'' فرید نے سوال کیا۔

''چپ کرو......اور باہر چلے جاؤ......'' بھائی مختار نے جھڑکا۔

''آپ بیہوش کیوں پڑے تھے جناح باغ میں چاچا جی......'' مسعود نے پھر پوچھا

''چلو نکلو یہاں سے جاؤ......'' بھابھی صولت نے بچوں کو پانچ روپے کا نوٹ پکڑا کر کہا...... ''باہر جا کر آئس کریم کھاؤ۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں دن کی روشنی ہسپتال کا کمرہ، کمبل، ڈرپ، روشن کا چہرہ سب میرے لیے بے حقیقت چیزیں تھیں میں ابھی تک نوگزے کے ساتھ تھا اور میرے نتھنوں میں کافور کی خوشبو تھی۔ ڈاکٹر کے آنے تک میں دم سادھے آنکھیں

بند کیے لیٹے رہا روشن اور بھابھی صولت سے کوئی بات کرنے کو نہ تھی۔

''وہ کہاں ہے......؟......وہ......''میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

بلڈ پریشر کا آلہ میرے بازو پر فٹ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے تعجب سے میری جانب دیکھا اور بولا......وہ کون حضرت!...... یہاں تو ہم سب ہیں آپ کی خدمت کے لیے۔

''وہ نوگزے کا آدمی...... جو مشعل لے کر چلتا تھا جو......جس نے مجھ سے باتیں کی تھیں

ڈاکٹر بے معزز تھکا ہوا، عینکو، زمینی شخصیت کا آدمی تھا ڈاکٹری اس کا صرف پیشہ تھا......وہ بناوٹی بے تکلفی اور خوش دلی سے بولا...... ''حضور آپ تو پانچ دن سے بے ہوش پڑے ہیں خدا کا شکر کریں جان بچ گئی ورنہ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔''

میں نے آنکھیں بند کرلیں مجھے معلوم تھا کہ وہ میری باتیں سمجھ نہیں سکتا۔

پھر بھابھی صولت اور ڈاکٹر کھسر پھسر کرنے لگے۔

''بے ہوش ہو گیا ہے پھر......؟''

''بس آرام کی ضرورت ہے ہم Tranqulizers دے رہے ہیں''

''ابھی تو ٹھیک تھے'' روشن کی آواز آئی

''بس جی باڈر لائن کیفیت ہوتی ہے کبھی مریض ہمارے پاس واپس آجاتا ہے کبھی ادھر چلا جاتا ہے ایب نارمل لوگوں میں''

''آپ ان کی مدد نہیں کر سکتے؟......'' روشن نے سوال کیا۔

''کر رہے ہیں بی بی......ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن ایسا کیس ہمارا نہیں ہوتا۔ انہیں کسی سائیکوتھراپسٹ کی ضرورت ہے......سر دست جو کچھ بھی ممکن ہے کر رہے ہیں''

اس کے بعد کسی نے میرے بازو میں انجکشن لگایا بھابھی صولت کے رونے کی

آواز آئی اور رفتہ رفتہ مجھے یوں لگا جیسے میں کھسک رہا ہوں چارپائی سے بستر سے ...... میرا سر بوجھل تھا میں بازو اٹھا کر ناک کھجلانا چاہتا تھا آنکھیں کھول کر دیکھنے کی آرزو تھی۔ لیکن نہ میری آنکھیں کھلتی تھیں نہ بازو اٹھتا تھا۔

''یہ ...... یہ ٹھیک تو ہو جائیں گے ......'' روشن کی آواز تھی اور اسی آواز کے ساتھ میں دوباری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

ہسپتال سے واپسی پر سب سے پہلے میں نے اپنے سر کے سارے بال منڈا دیے سر منڈوانے سے میں نے وہ ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ اور بڑھا لیا جو روشن اور میرے پلنگ کے درمیان تھا میں ابھی تک چھٹی پر تھا لیکن اب ریڈیو سٹیشن سے کبھی کبھی کوئی واقف میری طبیعت کا پوچھنے آ جاتا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے تعلق ریڈیو پر کیسی باتیں ہوتی ہوں گی۔ کچھ آرٹسٹ اور افسر مل کر مجھے دیوانہ سمجھتے ہوں گے شروع سے نیچے بھابھی صولت اور بھائی مختار بھی مجھے دیکھ کر شرمندہ ہو جاتے ان کی شکلیں دیکھ کر مجھے لگتا جیسے وہ مجھے نہیں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے تھے ادھر روشن کی عجیب مصیبت تھی وہ دن بدن پیلی ہوتی چلی جا رہی تھی پہلے اس کی رنگت زرد ساٹن جیسی تھی اب وہ پیلے کھدر جیسی نظر آتی۔ میرا سارا کام وہ کرتی اس کی ضروریات کا میں خیال رکھتا اس کے باوجود ہم دونوں میں کم ہی بات ہوتی۔ کمرے میں ترتیب آ گئی تھی۔ یا تو میرے آنے سے پہلے وہ سو جاتی لیکن اگر وہ جاگتی نظر آتی تو میں نیچے چلا جاتا اور بے مصرف سڑکوں پہ گھومتا رہتا۔ یہ عجیب دن تھے جیسے پانی کی سطح ہولے ہولے کائی جمتی چلی جائے میرے اندر بھی ہر خواہش آہستہ آہستہ شٹر بند ہو رہی تھی اور میں عجیب طرح سے آزاد ہوتا چلا جا رہا تھا موت سے اس قدر گہرا رابطہ قائم کرنے کی وجہ سے زندگی یکدم بے معنی ہو گئی تھی ...... میں دوکانوں کے سامنے کھڑا سوچتا رہتا ...... لوگ یہ سارا سامان کیوں خریدتے ہیں کیمرے ...... کپڑے ...... قالین، برتن

......گیس کا سامان ......فریج کاریں ......سارے بازاروں میں بے ہودہ سامان دیکھ کر میں جان بچا کر کسی فلم ہاؤس کے سامنے جا کھڑا ہو جاتا فلموں کے پوسٹر اب جاذب نظر نہ رہے تھے ......میں کوشش کرتا کہ ان فلموں میں مجھے دل چسپی پیدا ہو جائے لیکن جن وجوہات کی بناء پر فلمیں دیکھی جاتی ہیں وہ باقی نہ رہی تھیں۔

باغوں میں سڑکوں پر سب جگہ مجھے بے مصرف لوگ نظر آتے۔

یہ وہ دور تھا جب میں مکمل آزادی یا......تمام تر فنا کے بالکل مقابل تھا۔

گھر پر میرا کوئی کام نہ تھا۔ روشن مجھے دبی زبان میں آرام کرنے کو کہتی۔ لیکن مجھے گھر سے وحشت ہوتی تھی۔ باہر چلا جاتا تو بھی کوئی کام میرے کا نہ تھا۔ میں فٹ بال کی طرح کبھی اس کورٹ میں کبھی اس کورٹ میں بھاگتا رہتا ایک صبح مجھے روشن نے کہا......''اگر آپ چاہیں تو میں موچی چلی جاؤں اماں کے پاس......''

''تمہاری مرضی ہے۔''

''آپ بتائیں۔؟''

''میں کیا بتاؤں اگر تم کو یہاں آرام ہے تو یہاں رہو ورنہ وہاں چلی جاؤ۔''

وہ رونے لگی۔

''آرام تو مجھے یہاں زیادہ ہے لیکن......لیکن میری وجہ سے آپ کو آرام نہیں ہے۔''

میں اس کے مقابل پلنگ پر بیٹھ گیا......''دیکھو روشن تمہاری وجہ سے مجھے کوئی تکلیف نہیں اس وجہ سے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

ہم دونوں چپ ہو گئے۔

''اس کا کیا جواب آیا ہے؟۔''

روشن اٹھی اور نئے سوٹ کیس کی جیب میں سے پی آئی اے کی ٹکٹ والا لفافہ نکال لائی۔

یہ خط اس کا تھا۔ روشن کے افتخار کا۔

''کیا لکھا ہے۔؟''

''آپ پڑھ لیں۔''

میں نے بڑی دیر میں خط پڑھا...... پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں جالے سے آرہے تھے تحریر معمولی تھی۔ پتنگ فروش کے بیٹے کی سیدھی سادی تحریر۔ لیکن تحریر میں حدت خلوص محبت سب کچھ تھا اس نے اصرار سے لکھا تھا کہ جتنی جلدی میں اسے آزاد کردوں گا۔ وہ آجائے گا اور پھر دونوں واپس جاسکیں گے۔

''تم اسے لکھو کہ تم آزاد ہو اور ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''سب کچھ جلدی ہونا چاہئیے...... میں...... میری حالت زیادہ انتظار نہیں کرسکتی۔

''

''یہ تو افتخار پر منحصر ہے جتنی جلدی وہ آجائے گا معاملہ طے ہو جائے گا۔''

وہ چپ ہوگئی...... بڑی دیر چپ رہی۔

''میں جی پھر چلی جاؤں موچی دروازے۔''

''جیسا تمہارا جی چاہتا ہے روشن...... میں...... تمہاری زندگی میں کسی قسم کے فیصلے نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ اٹھی اور میرے پاس آکر بیٹھ گئی اس کے عورت پن کی خوشبو میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اس خوشبو کی وجہ سے ہی اپنے فیصلے بدل سکتا تھا۔

''آپ قانونی طور پر میرے شوہر ہیں آپ کا حق ہے میرے فیصلے بدلنے کا۔''

میں اٹھ کر سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ پھر میں زور سے کھانسا اور تھوک دور پھینک کر عجیب لذت محسوس کی۔

''دیکھو اگر تمہارے خط آسانی سے موچی دروازے آسکتے ہیں تو وہی جگہ اچھی ہے...... ورنہ......''

’’میں پھوپھی جان کے جا سکتی ہوں گلبرگ میں وہ ......وہ ماڈرن ہیں اور ......افتخار کو پسند کرتی ہیں۔‘‘

’’جیسی تمہاری مرضی۔‘‘

شام کو میں روشن کو لے کر پھوپھی جان کے گھر پہنچا وہاں روشن اور میرے لیے ڈبل بیڈ والا کمرہ مخصوص تھا اس ڈبل بیڈ کو دیکھ کر میں بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح باہر کو بھاگا۔ میں روشن سے مل کر بھی نہ آیا۔ بلکہ پھوپھی جان پینٹری میں ٹرولی سجاتی وہ گئیں اور میں باہر نکل گیا۔ عین کوٹھی کے باہر جس وقت میں موٹر سائیکل موڑنے کی کوشش میں تھا ایک لمبی سفید کار رکی اور ہارن بجا۔ گو میں حاضر نہیں تھا۔ پھر بھی وہیل پر دونوں بازو رکھنے والا مجھے جانا پہچانا نظر آیا۔

’’سہیل!......سر۔‘‘

پروفیسر نے دروازہ کھولا میں نے موٹر سائیکل چھوڑی اور پھر ہم دونوں شدت سے بغل گیر ہو گئے۔

سہیل نے فرنچ کٹ داڑھی اور موٹے شیشوں کی ڈگ عینک پہن رکھی تھی اس کے جسم پر سرخ چیک کی قمیض تھی جس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں اور قمیض کے تین بٹن کھلے تھے اس کی جینز موری بند تھی اور کلائی پر ڈیجٹل گھڑی تھی۔ جس کا سیکنڈ کا پھول ہر سیکنڈ کے بعد بدلتا جاتا تھا وہ سارا کا سارا تمبا کو کولون اور آفٹر شیو لوشن سے مہکا ہوا تھا۔

’’یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے کوجیک؟......‘‘اس نے امریکہ کے مشہور گنجے ایکٹر کے نام سے مجھے پکارا۔

’’بس ایسے ہی؟......سر۔‘‘

یہاں کہاں پھر رہے ہو میری چچی کے گھر۔؟

’’اپنی بیوی جمع کروانے آیا تھا۔‘‘

''تو ہو گیا پڑا...... ختم ہو گئی تلاش...... کچھ نہ ملا زندگی میں......؟''

یں نے اپنا موٹر سائیکل وہیں پورچ میں رکھا اور ہم دونوں وارث روڈ چلے گئے بڑی دیر سہیل مجھے امریکہ کے متعلق بتاتا رہا۔

''وہ ملک بھی کھوکھلا ہو گیا ہے...... انسانوں کی طرح ملک اور قومیں بھی ہمیشہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی خوبیوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں......'' ہمیشہ کی طرح وہ بہت چمک دار اور ذہین تھا اس کے چہرے پر تمام تر امریکی چھاپ تھی۔

''کیسے؟......سر۔''

''خوبی وہ چیز ہے جس پر انسان خود اعتماد کرتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے لوگ اس کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ خوبی اس کی اصلی اچھائیوں کو کھانے لگتی ہے اسی خوبی کی وجہ سے اس میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اسی خوبی کے باعث وہ انسانیت سے گرنے لگتا ہے...... فرد...... قومیں سب اپنی خوبیوں کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔''

ہم دونوں وارث روڈ کی ایک بہت پرانی کوٹھی میں بیٹھے تھے اس کی چھتیں اینٹوں کی تھیں اور باہر لال گیرو رنگ پھرا ہوا تھا گیٹ پر بوگن ویلا کی بیل کاسنی پھولوں سے لدی تھی۔گھر کے پچھواڑے بے مسلسل کوئی نلکہ چل رہا تھا جس کی مدھم آواز آئے جا رہی تھی۔کمرے میں پرانا فرنیچر، بوسیدہ پردے اور کین کا صوفہ تھا ایک قالین جو کبھی ایرانی ہو گا۔اب فرش سے چپکی ہوئی دری نظر آ رہا تھا کھڑکیوں میں دھول سے اٹے کاغذی پھول تھے۔سہیل کے خالو کا گھر تھا اور وہ امریکہ سے ایک مہینے کی چھٹی پر صرف رشتہ داروں سے ملنے آیا تھا۔

بہت ٹھہر ٹھہر کر سوچتے ہوئے میں نے پرفیسر سہیل سے اپنے موجودہ حالات کہے وہ چپ رہا۔

''پھر؟......''

''پھر کیا؟......'' میں نے جواب دیا

''پھر کیا ارادہ کیا ہے؟''

میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا...... اس نے کوئی مشورہ نہ دیا۔

''میں...... میں سارا وقت سوچتا رہتا ہوں سر...... کہ انسان کی روح کہاں جاتی ہے؟......موت کیا ہے؟ کیا موت سے ہمکنار ہوئے بغیر آدمی کبھی آزاد ہو سکتا ہے؟ ...... مکمل آزاد......''

سہیل ایک ماڈرن کیپسول سائز ولی تھا۔ اس کی آنکھوں میں توجہ کی ایسی شعاعیں تھیں جو ماڈرن تعلیم یافتہ آدمی کا سینہ شق کر کے اس پر اثر انداز ہو سکتی تھیں اور اس کے باوجود اپنے گریڈ اپنے...... اپنے مستقبل کے لیے بڑی جدوجہد کرتا رہتا تھا۔

''آپ تو امریکہ سے آ رہے ہیں وہ لوگ تو آج کل E.S.P پر بہت ریسرچ کر رہے ہیں آپ کا کیا خیال ہے کیا روح واقعی کوئی چیز ہے؟...... کیا...... کیا...... انسان واقعی موت کے دروازے سے نکل کر کہیں جاتا ہے کیا مابعد واقعی ہے؟''

''مغرب والے ابھی ابتدائی کوششوں میں ہیں مسمرازم ہپناٹزم اور سپر چولزم جیسی کچھ میں نے وہاں دیکھی ہے یہ ایک طرح سے Conseutration کے کرشمے ہیں تصور اور خیال کی مشق سے بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے لیکن عالم ناسوت سے یہ لوگ آگے نہیں بڑھتے ...... تمہیں اگر شوق ہو تو ایک بزرگ سے ملا دوں گا وہ تصور اسم ذات سے اگلی دنیا کھولتے ہیں جس سے انسان عالم ناسوت سے پرواز کرتا عالم ملکوت جبروت اور لاہوت میں جا داخل ہوتا ہے...... دراصل عالم ناسوت میں جن رہتے ہیں خبیث روحیں رہتی ہیں...... اس لیے یہاں بہت خطرات ہوتے ہیں کئی بار شیاطین یہیں نفس کے رفیق بن جاتے ہیں اور روح آگے نہیں بڑھ سکتی۔''

میں فرنچ کٹ داڑھی والے ماڈرن پروفیسر کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ میری مدد کر سکتے ہیں سر...... روح کے سفر میں۔''

''میں تو تمہاری مدد نہیں کرسکتا ہاں کسی ایسے شخص کی تلاش کی جاسکتہ ہے جو تمہاری اعانت کرسکے یہ جو آسٹرل باڈی کے سفر ہیں ار جادوگروں کی ساحری ہے یہ سب ہمزاد کے کرشمے ہیں ان کا روح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہمزاد چونکی ساری عمر انسان کے ساتھ رہتا ہے انسان کی کوئی بات اس سے چھپی نہیں ہوتی جب حاضرات بلائے جاتے ہیں یا روحیں حاضر کی جاتی ہیں تو یہی ہمزاد حاضر ہوتا ہے۔ یہی ماضی۔کے واقعات بیان کرتا ہے۔

،میں نے سوالوں کا طور مار باندھ دیا۔''

''میں زیادہ نہیں جانتا قیوم...... میں خود تلاش میں ہوں تمہاری طرح راہرو ہوں ......دیکھو اگر تمہیں کوئی راستہ مل جائے تو مجھے اطلاع دے دینا...... مجھے خبر ہوگئ تو میں تمہیں انگلی پکڑ کرلے چلوں گا...... وہاں بھی بہت چھان بین کی میں نے لیکن کوئی راستہ نہیں ملا وہ لوگ بھی تلاش میں ہیں بہت صوفی سنٹر کھل گئے ہیں کئی بھگتی آشرم ہیں ان گنت ادارے ہیں Protetant,baptist لیکن ابھی کامل یقین کا وقت نہیں آیا...... نہ یہاں نہ وہاں......''

میں بہت پریشان تھا میرے اندر کی آگ اب بہت بھڑک گئ تھی۔

''کسی طرح...... آپ میری ملاقات کسی روح سے نہیں کرا سکتے...... میرے ابا کی روح سے...... میری ماں کی روح...... وہ...... وہ...... وہ مجھے اس کرب سے نجات دلا سکتے ہیں۔''

پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''میں کچھ نہیں جانتا قیوم...... کچھ تھوڑی سے سوجھ بوجھ آگئی ہے......لیکن صرف کتابوں سے مجھے عینی یقین حاصل نہیں۔بس میرے تمام علم کی طرح یہ بھی ایک Academic research ہے لیکن میں تلاش میں ہوں۔''

اس وقت پروفیسر سہیل سے ملنے تین جوان یونیورسٹی سے آگئے انہوں نے رسما

تھوڑی سی باتیں کیں پھر تینوں نے سگریٹ بجھا دیے۔ایک میز پر ایک بڑا شیشہ رکھا گیا۔درمیان میں گلاس پر سہیل اور دولڑکوں نے انگلیاں رکھ دیں اور کمرے کے پردے برابر کر کے صرف ایک موم بتی روشن کر دی گئی۔

اب روحیں بلانے کا عمل شروع ہوا۔

''کوئی روح جو ادھر سے گزر رہی ہو۔گلاس میں آ جائے اور گلاس ہلا کر اپنے وجود کا یقین دلائے......''انگریزی میں سہیل نے کہا۔

ابھی سہیل کا استدعا کرتے ایک آدھ منٹ ہی گزرا تھا کہ گلاس ادھر ادھر سرکنے لگا۔

''آپ کس کی روح ہیں۔''

''میں رائیو گرینڈ کے کنارے رہنے والا ایک برو جوہوں......''روح نے مختلف الفاظ پر ہجے کیے۔

''آپ کو مرے کتنے سال ہوئے ہیں۔''

''جب راپ پورٹ کے قریب اپاشی قبیلے کی جنگ ہوئی تھی تو میں ایک انگریز کی گولی سے مارا گیا تھا۔''

''دنیا کا مستقبل کیسا ہے؟''

''تاریک!......''

''کیوں؟......''

''ہوپی قبیلے کی پیش گوئی کے مطابق شمال مشرق سے آنے والے ایک ایسا کدو ایجاد کریں گے جس میں راکھ ہوگی جب وہ کدو ہوا میں اچھالیں گے تو دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔''

سہیل نے گلاس میز سے اٹھا کر اس میں پھونک ماردی اور پھر ایک نئی روح کو بلایا۔

''ہم سینٹ فرانسس آف اسسی کو بلانا چاہتے ہیں......'' سہیل نے کہا

''کیوں؟......'' نئی روح نے سوال کیا۔

''ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔انسان کی فلاح کس میں ہے۔''

''غریبی، عصمت اور اطاعتمیں......'' روح نے جواب دیا۔

''ہمیں سینٹ فاسس بلادو۔''

''وہ نہیں آسکتے۔''

''کیوں کیوں؟۔'' سب چلائے۔

''وہ جس عالم میں ہیں وہاں سے آیا نہیں جاتا۔''

مجھ پر اس مشغلے کا عجیب اثر ہوا۔ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ گیا۔ اور میرے معدے میں شدید جلن اٹھی۔

''سہیل میرے ابا جی کو......میرے ابا جی کو......بلاؤ......''

سہیل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا......''وہ نہیں آسکتے قیوم......میں تمہیں بتا چکا ہوں یہاں صرف عالم ناسوت سے پیغامبر آتے ہیں۔''

نوجوانوں نے شیشہ اور گلاس ایک طرف رکھ دیے اور سگریٹ پینے لگے۔اب گفتگو امریکہ کی جنسی زندگی کی طرف مڑ گئی۔ابھی چند لمحے پہلے جو لوگ ارواح سے ناطہ جوڑنے میں مگن تھے بڑے تپاک سے مغرب کی جنسی زندگی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔سہیل انہیں گروپ شادیوں کے متعلق کی رنگ سوسائیٹی وائف سوپینگ۔سیکس شاپ اور بلو فلموں کے متعلق تفصیل سے بتا رہا تھا اس وقت وہ اس قدر چسکے لے کر باتیں کر رہا تھا کہ مجھے شبہ ہوا وہ امریکہ میں سٹڈی تو نہیں کر رہا بلکہ امریکہ کی انڈر ورلڈ میں مافیا کا جیتا جاگتا حصہ ہے۔وہ امریکی لڑکیوں کے متعلق

ایسی انفرمیشن دے رہا تھا جو پلے بوائے رسالوں میں بھی ملنی مشکل ہے اس کی باتوں میں پوری اشتعال انگیزی تھی اور وہ اس وقت مجھے ایسا شیطان لگ رہا تھا جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے خرگوش جیسے کان ہوتے ہیں رات گئے تک وہ تینوں نوجوان بیٹھے رہے پاکستان کی ملکی سیاسی حالات روس اور امریکہ کی خارجی پالیسی خاص کر تھرڈ ورلڈ میں ان کی حیثیت اور خود ساختہ ایمپائیر کے فرائض کی تشریح اسلامی اخوت اور ملت کا مستقبل تعلیمی مسائل ابلاغ کی حالت دریا غیر میں اور مقامی پالیٹکس میں، لڑکیوں کی آزادی اور پیشہ طلبی ملازمتوں میں گریڈ کی اونچ نیچ مہنگائی موسم فیشن بہت کچھ زیر بحث رہا۔ پروفیسر سہیل بے تکان اور بڑے سلیقے سے بات کرنے کا عادی تھا وہ جب بھی بات کرتا ایسے جیسے لکڑی میں ایک ہی ہتھوڑے سے کیل اندر دھنس جائے، وہ پہلے موضوع کو دوسرے آدمی کے سامنے پھینک دیتا چھوڑنے کے بعد جب موضوع اس تک پہنچتا تو وہ اسے غلیل کے ربڑ کی طرح کھینچ کر تان کر نشانہ باندھتا اس میں دوسرے کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی اہلیت تھی...... بلکہ قائل...... کرنے کا مادہ تھا وہ بحث میں الجھے بغیر گفتگو کو مناظرے کی شکل نہ دیتے ہوئے اپنا مطلب منوانے میں کامیاب ہو جاتا اور یہی اس کی گفتگو کا خوبصورت ڈھنگ تھا جس کی بدولت وہ مختلف محفلوں میں اچانک چمکنے لگتا اور رفتہ رفتہ چھا جاتا رات گئے جب وہ مجھے لے کے باہر نکلا تو پورا چاند چمک رہا تھا۔

''آؤ چلیں۔''

''میں چلا جاؤں گا...... سر'' میں نے اصرار کیا۔

''کیسے جاؤ گے تمہاری موٹر سائیکل تو وہیں رہ گئی۔''

پہلی بار مجھے خیال آیا کہ اپنی موٹر سائیکل کو ساتھ نہ لانا بہت بڑی حماقت پن تھا۔

''بیٹھو...... اور اندر سے اس قدر کسمسایا کرو۔ relax relax'' رات کے ڈھائی بجے میں پھوپھی کے گھر پہنچا۔ کار جس وقت پھاٹک تک پہنچی دو بڑے بڑے

السیشن کتے اندلان سے بھونکتے اور بھاگتے ہوئے آئے اور پھاٹک کے اوپر پاؤں رکھ کر بھونکنے لگے۔ کافی دیر تک اندر سے کوئی نہ آیا۔ ہم دونوں بھی کتوں کی وجہ سے کار کے اندر ہی بیٹھے رہے پھر بوڑھا خانساماں اور روشن برآمدے میں آئے پہلے پورچ کی دو بتیاں روشنہوئیں پھر خانساماں اور روشن گھر کے پھاٹک کی طرف آئے خانساماں نے دونوں کتوں کو گلے کے پٹکے سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ روشن میری طرف بڑھتی آئی میں نے پروفیسر سوہیل سے خدا حافظ کہا اور اندر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''افسوس میں موٹر سائیکل یہیں چھوڑ گیا ورنہ یہاں نہ آتا۔''

''اچھا ہوا کہ...... کہ آپ آ گئے پھوپھی جان بار بار پوچھ رہی تھیں۔''

''کیا۔؟''

''کچھ نہیں جی...... بس یہی......''

ہم دونوں چپ چاپ اندر کی طرف چلے۔

ڈبل بیڈ پر لیٹنے سے پہلے اس نے اونچی آواز میں کہا

''افتخار کا خط ہے...... آپ دیکھ لیں۔''

میں غسل خانے کے اندر روشن کے برش سے دانت صاف کر رہا تھا۔

''اسے رکھو......'' میں نے اندر سے کہا۔

''آپ پڑھ لیں جی۔''

باہر آ کر میں نے سعودی عرب کا نیلا ایروگرام کھولا لکھا تھا۔

ہم دونوں چپ ہو گئے پھر کچھ دیر بعد وہ ڈبل بیڈ کے ایک کنارے اور میں دوسرے کنارے پر لیٹ گئے۔ اب بھی ہم میں دو بازو بھر فاصلہ تھا بتیاں بجھا دی گئیں تو پچھلی کھڑکی سے پوری چاند کی روشنی اند آنے لگی۔

''آپ کو روشنی بری لگتی ہو تو کھڑکی کے آگے پردہ کر دوں......؟ روشن نے بڑی

دیر کے بعد پوچھا۔‘‘

’’نہیں ٹھیک ہے۔‘‘

ہم دونوں ہمیشہ ایک ہی کمرے میں رہے تھے لیکن ہمارے پلنگ ہمیشہ علیحدہ تھے اس ڈبل بیڈ نے دوری اور نزدیکی کا ایک اور بکھیڑا کھڑا کر دیا۔

بڑی دیر بعد میں نے سوال کیا...... تمہارا پاسپورٹ تیار ہے؟‘‘

’’ہاں جی...... وہ تو...... وہ تو افتخار نے جانے سے پہلے بنوا دیا تھا۔‘‘

’’اچھا۔‘‘

پھر ہم دونوں میں خاموشی چھا گئی۔

’’اگر تم کو کوئی خرید و فروخت کرنا ہو تو پیسے مجھ سے لے لینا۔‘‘

’’نہیں جی۔‘‘

بڑی دیر تک وہ آنکھیں کھولے چھت کو دیکھتی رہی میں نے کروٹ بدل لی۔

’’اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں غسل خانے کی بتی جلا لوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔‘‘

’’ضرور۔‘‘

اس کے بعد میں نے سر کے نیچے سے تکیہ اٹھایا اور اپنے چہرہ پر لے لیا مجھے معلوم نہیں وہ چاندرات میں غسل خانے کی بتی جلا کر جاگتی رہی کہ سو گئی۔

پکی سڑک کے کنارے فروپیسر سہیل نے گاڑی پارک کر دی اور ہم سائیں جی کے ڈیرے کی طرف پیدل چلنے لگے۔ یہ ڈیرہ پکی سڑک سے قریباً پونے دو میل دور تھا راستے میں ایک نہر کئی کھیت کیکر کے درختوں کے جھنڈ پرانے بے آباد بھٹے مٹی کے ٹیلے اور جھاڑیوں آئیں۔ سارا راستہ سائیں جی کے کشف و کرامات کے متعلق بتاتا رہا امریکہ پلٹ سہیل پوری عقیدت سے سائیں جی کا متعرف ہو رہا تھا۔

’’وہ چاہیں تو موت کا جہاز اٹھا کر تمہیں ادھر کی دنیا کا رخ دکھا سکتے ہیں۔‘‘

''تمہاری پریشانی کا حل کتابوں سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ مجھے کتابوں سے کوئی راستہ مل سکتا ہے لیکن جب تک سائیں جی کے ڈیرے پر نہیں پہنچتا میری پریشانیوں کا حل نہیں ملا۔''

''تو کیا اب آپ Anxiety سے آزاد ہو چکے ہیں سر؟''

''نہیں......''

''تو پھر حاصل؟......''

''انسان کو دنیا میں ایک سب سے بڑی پریشانی ہے قیوم...... وہ پائیدار ہونا چاہتا ہے اور موت کے ہوتے ہوئے وہ کبھی مستقل نہیں ہوسکتا۔ انسان کی ہر پریشانی کا تجزیہ کرو اصل میں پریشانی موت سے پیدا ہوتی ہے......آرزو کی موت راحت و خوشی کی مرگ...... دیکھو تو آدمی ہر وقت مرتا رہتا ہے بدن کی موت تو آخری فل ستاپ ہے موت کی جھلکیاں چھوٹی موٹی ملاقات تو روز ہوتی ہے موت سے۔''

''مجھے اب فلسفہ نہیں چاہیے پروفیسر سہیل......میرا خیال ہے زیادہ سوچ نے میری زندگی میں بارود بھر دیا ہے۔''

''سائیں جی سے ملو گے تو پتہ چلے گا موت کچھ نہیں ہے......وہ پردہ اٹھا کر دکھا دیں گے کہ کیسے انسان اس جسم کو چھوڑنے کے بعد پھر ابدی زندگی پالیتا ہے...... جنت وہ جگہ ہے جہاں خوشیاں کی موت نہیں آرزو کی مرگ نہیں......موت نہ ہوتی موت کا شعور نہ ہوتا تو آدمی کبھی غم سے آشنا نہ ہوتا......دیوانہ نہ ہوتا!''

''وہ مجھے ابا کی روح سے ملا دیں گے۔''

وہ پتہ نہیں کیوں مجھ سے نظریں چرانے لگا۔

ڈیرے پر مکمل خاموشی تھی کھلا احاطہ تھا جس میں ایک طرف چھوٹی سی کچی مسجد تھی مسجد کے احاطے میں چٹائیوں پر دو سفید ریش بزرگ بیٹھے کھجور کی گٹھلیاں ہاتھوں میں لیے ذکر میں مشغول تھے۔ ایک ہرا جھنڈا سائیں جی کے کوٹھے پر لہرا رہا تھا

سارے میں گرمیوں کی دوپہر چھائی تھی۔ ڈیرے پر کوئی درخت نہ تھا پھر بھی کہیں سے کوئل کی آواز گرد آلود آسمان کو چیر کر پہنچ رہی تھی۔ سائیں جی کے کچے کوٹھے میں ٹھنڈک اور شانتی تھی وہ کھجور صف پر کہنی کے بل نیم دراز نہ تھے اور ان کا ایک مرید کھجور پنکھے سے انہیں جھل دے رہا تھا کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے چند لمحے تک کچھ نظر نہ آیا۔ سائیں جی کا مشفق چہرہ اور لمبی سفید ریش بہت بعد میں نظر آئی۔

''آؤ بیٹھو بیٹھو آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔''

سائیں جی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، اب کے جسم پر تہمد کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ چھاتی کے سفید بال سینے کو ڈھانچے چمک رہے تھے۔

''جا بھائی ان کے لیے چائے لا۔''

مرید نے پنکھا چھوڑا اور حق سائیں کہہ کر ڈیرے سے نکل گیا پتہ نہیں چائے کہاں پکتی تھی کیونکہ بظاہر نہ کہیں دھواں تھا نہ چولہا۔ مجھے لگا جیسے ڈیرے پر ہمزاد پکی پکائی چیزیں اتارتے ہوں۔

''آرام سے کھلے ہو کر بیٹھیں......'' سائیں جی نے مجھے کہا اور پھر کتنی ہی دیر اللہ اللہ کرتے رہے۔ گجراتی پیالوں میں گرم گرم چائے آ گئی۔ کچھ عرصہ بعد تندوری روٹیاں مکھن اور مچھلی کا طشت لے کر ایک اور مرید حاضر ہو گیا۔

''لنگر کریں......لنگر میں برکت ہوتی ہے۔''

ہم مودب انداز میں کھانا کھانے لگے۔ میں خاموش تھا لیکن ڈاکٹر سہیل سلوک کی مختلف منزلوں پر سائیں جی سے تبادلہ خیال کر رہا تھا گفتگو میں خاص ٹیکنیکل توجیہات کی وجہ سے بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

''اچھا تو آپ کے دوست دعوت الارواح کی مجالس میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی میں اپنے باپ کی روح سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''بیٹا اگر یہ فقط تجسس کے لیے ہے تو باز رہو اگر باطنی فتح کی خاطر مطلوبہ روح کی رویت چاہتے ہو تو ہم راستہ بتا دیں گے۔''

''کیسے؟ حضور کیسے؟ سائیں جی میں بہت بے قرار رہتا ہوں۔''

''خواب میں چاہو تو خواب میں...... مراقبے میں استغراق میں چاہو تو ویسے عالم بیدار میں روح کو مجسم دیکھنا چاہو تو اس طرح۔''

''کیا روح دوبارہ جسم میں آسکتی ہے سائیں جی۔''

''روح دوبارہ جسم میں نہیں آتی۔ لیکن جس صورت میں متشکل۔ ہونا چاہے ہوسکتی ہے۔ ملائکہ جنات بھی یہ قدرت رکھتے ہیں...... لیکن بیٹا یکسوئی شرط ہے۔''

''یکسوئی کی کوشش کروں گا تو سائیں جی......'' میں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''ہم تم کو ایک طریقہ بتاتے ہیں...... اسم ذات کسی کاغذ پر لکھ پر دیوار پر ٹانگ لینا ایسے کہ تمہاری نظریں اس کے متوازی ہوں پھر آرام دہ تکیے سے ٹیک لگا کر اس کر دیکھنا اور پاس انفاس جاری رکھنا...... روز...... بلا ناغہ پہلے پانچ منٹ پھر ہر دن کے ساتھ ساتھ ایک منٹ اور...... ظلمات بحری جب دور ہونے لگیں گے تو خود بخود عالم ملکوت کا راستہ کھلے گا۔''

میں نے اس سے پاس انفاس کا طریقہ سیکھا بڑی دیر تک اس عمل کا تجزیہ ہوتا رہا کہ لا کیسے کہا جائے اور الا اللہ کی ضرب کیسے قلب پر جاری کی جائے۔

کچھ دیر کے لیے سائیں جی نے مجھے پاس انفاس کا ورد پریکٹیکل شکل میں کر کے دکھایا۔

''کتنے دن یہ عمل جاری رکھنا ہوگا سائیں جی۔''

سائیں جی ہلکا مسکرائے۔ کڑی دھوپ میں جیسے نیم کی گھنی چھاؤں۔

''بیٹا یہ تو سالک کی اپنی لگن پر منحصر ہے کچھ لوگ دنوں کی منزل سالوں میں طے کرتے ہیں کچھ سالوں کو لمحوں میں پار کر جاتے ہیں اونگھنے سونے یا سستی کرنے سے

راستہ کھوٹا ہوتا ہے...... جب یہ مشق ہو گی تو اندھیرے میں بھی اسم ذات نظر آنے لگے گا۔اس وقت تم کسی چیز کو بھی متوجہ کر کے اسے اپنی طرف کھینچنے کی قوت اپنے میں پاؤ گے۔"

یکدم روشن کا شر د چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا

"جب یکسوئی کا مرحلہ طے ہو گیا تو پھر قوت ارادی کا عمل بتائیں گے۔جب یکسوئی تصور اور قوت ارادی مظبوط ہو گئے تو پھر لطیفہ خفی کا مقام کھلے گا۔"

"لطیفہ خفی کا مقام؟......" میں نے لجاجت سے سوال کیا۔

"دو ابروؤں کے درمیان لطیفہ خفی کا مقام ہے جس طرح ناسوتی چیزوں کو دیکھنے کے لیے آنکھ کام دیتی ہے جب باطنی آنکھ کھلے گی تو روح ملایکہ اور دیگر باطنی اشیاء خود نبی علیہ ﷺ نظر آنے لگیں گی۔"

"کیا میری باطنی آنکھ کھل سکے گی؟۔"

"ہاں بھئی کیوں نہیں...... بچہ جو دیکھے ہے سمجھتا ہے؟ ارد گرد کے لوگ بتاتے ہیں یہ گھوڑا ہے یہ بلی ہے ایسے ہی ہر آدمی اپنی باطنی آنکھ سے کچھ نہ کچھ کبھی نہ دیکھتا ہے لیکن سمجھ نہیں سکتا۔رہنمائی شرط ہے جب یہ مرحلے طے ہو جائیں گے تو ہم تم کو ایسا رود بتا دینگے جس سے روح عالم شکل میں آ کر تم سے خود ملے گی ان کی زیارت کے وقت اگر فیض چاہو گے تو کئی منزلیں طے ہو جائیں گی۔دنیاوی رہنمائی کی آرزو کھو گے تو وہاں اعانت کریں گے۔لیکن بہتر یہی ہے روحانی فیض حاصل کرو۔"

میں خوفزدہ ہو کر سہیل کی طرف دیکھا...... "یہ تو بہت لمبا کام ہے سر......کون جانے یکسوئی نصیب ہو نہ ہو......قوت ارادی مظبوط ہو سکے نہ سکے۔سائیں جی کوئی چھانٹا راستہ نہیں ہے......کوئی شارٹ کٹ۔"

"ہے!۔"

"بتایئے خدا کے لیے بتایئے۔"

''بزدل ہو؟''

''جی کوئی خاص نہیں'' شاید ہوں بھی''

''اندھیرے سے تو ڈر نہیں آتا''

''نہیں جی۔''

''شیطانی آوازوں سے تو نہیں گھبراتے؟''

پروفیسر سہیل نے میری طرف نظر ڈالی جیسے وہ مجھے روکنا چاہتا تھا۔

''جی نہیں۔''

''تو آؤ میرے ساتھ۔''

ہم دونوں اٹھ کر سائیں جی کے پیچھے پیچھے چلے، وہ ہمیں ڈیرے سے کوئی دو فرلانگ دور لے گئے یہاں مٹی کے اونچے نیچے تودے اور بکائن کی جھاڑیاں تھیں۔ ان ہی ٹیلوں کی راٹ میں ایک پکی قبر بنی تھی۔ جب ہم قبر کے قریب پہنچے تو نظر آیا کہ قبر کے اندر جانے والی سیڑھیاں صاف نظر آرہی ہیں جس وقت سائیں جی قبر میں داخل ہوئے اس لمحے پروفیسر سہیل نے خوف سے میری جانب دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن میں دور تک فیصلہ کر چکا تھا اس لیے آہستہ آہستہ سائیں جی کے پیچھے پیچھے اترنے لگا آٹھ سات سیڑھیاں اتر کر ہم قبر کے اندر پہنچے تو گھپ اندھیرا تھا نم مٹی کی خوشبو آرہی تھی اور باہر کی نسبت اندر ٹھنڈک تھی۔

سائیں جی نے اندر جا کر ماچس جلائی اندھی کھوہ میں لپائی بڑی نفاست سے کی ہوئی تھی اور ایک طاقچے میں قرآن کریم ریشمی کپڑے میں ملفوف دھرا تھا سائیں جی نے موم بتی روشن کر کے طاقچے میں رکھ دی کیونکہ قبر کے اندر کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی اس لیے ہم کمریں جھکا کر ایستادہ تھے۔

''بیٹھ جاؤ۔''

ہم دونوں لیٹے ہوئے فرش پر سائیں جی کے پاس بیٹھ گئے۔

''یہ ہماری قبر ہے یہاں ہر رات ہم قرآن کریم کی تلاوت کرنے کے لیے آتے ہیں اور اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں۔''

آپ کے پیرو مرشد بھی یہاں آتے ہیں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ان کے وصال کو چالیس سال ہو چکے ہیں لیکن یہاں وہ باقاعدگی کے ساتھ ہمیں ہدایت دینے آتے ہیں۔''

''سائیں جی...... آپ کو یہاں ڈر نہیں لگتا......'' پروفیسر سہیل نے سوال کیا۔

''جس بشر کے ساتھ ظلمات بشری ہوا سے ڈر لگتا ہے جس اس جہالت سے نکل جاتا ہے وہ نور ہدایت سے منور رہتا ہے خوف اور بزدلی اسے چھو نہیں سکتی۔''

قبر کی چھت سے نامعلوم سی مٹی چھن چھن کر گر رہی تھی۔

''برخوردار اگر تم کو اپنے والد کی روح سے ملنا ہو تو یہاں مل سکتے...... ہو۔''

''جانے دو یار......'' آہستہ سے سہیل نے کہا۔

''ہاں میں تیار ہوں۔''

''پہلے چار ہفتے تم میرے ساتھ یہاں آؤ گے۔ پھر ایک جمعرات ہم باہر ہوں گے تم اندر ہو گے۔ تم کو اپنے والد کی روح ملنے آئے گی یاد رکھو روح گزند نہیں پہچانتی۔ لیکن اس کی ہیبت بہت ہوتی ہے ہم باہر ہوں گے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔''

''ٹھیک ہے سائیں جی میں تیار ہوں......'' میں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

''تم کو اپنے والد کی قبر کا نقشہ یاد ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔

چندرا کا سارا گاؤں میری نظروں میں گھوم گیا۔...... کلر کھائی زمینیں، دو منزلہ چھوٹا اینٹ کی حویلی...... اماں کا کھلا صحن جس کے ایک طرف دیمک زدہ تخت پوش پڑا تھا۔ اوپر چڑھنے والی گول سیڑھیاں اور چوتھی سیڑھی کی ٹوٹی ہوئی اینٹ مٹی کے ساتھ

بوڑھے گدھ جیسا میرا باپ...... مجھے تو یہ معلوم نہ تھا کہ ابا زندہ تھا کہ مر گیا؟ اس کی قبر کہیں تھی بھی کہ نہیں؟

''سائیں جی مجھے اپنے والد کی قبر کا نقشہ یاد نہیں''

سائیں جی نے دونوں ابرو اٹھا کر پوچھا...... ''بیٹا پھر زیارت کیسے کرو گے باپ کی قبر کو ہی تو یہاں بیٹھ کر یاد کرنا ہوگا۔''

سہیل نے مجھے کہنی مار کر کہا...... ''کس بکھیڑے میں پڑ گئے ہو...... چلو......''

''بیٹا ملاقات صرف اسی کی ہو سکتی ہے جس کی قبر کا نقشہ ذہن میں ہو۔''

یکدم سیمی میری نظروں میں گھوم گئی پتہ نہیں اتنی دیر میں نے باپ کی رٹ کیوں لگا رکھی تھی؟ مجھے سیمی سے ملنے کی آرزو تھی میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ دنیا کے جھنجھٹ سے نکل کر کیا اب وہ شانتی سے ہے کہ اب بھی اس کی روح لندن کی سڑکوں پر آفتاب کے تعاقب میں بھٹکتی ہے؟ کبھی اسے میرا خیال بھی آیا ہے کہ مرنے کے بعد فروعی تعلقات یاد نہیں رہتے۔؟

''کسی لڑکی کے بارے میں سوچ رہے ہو برخوردار۔؟''

میں نے گھبرا کر سائیں جی کی طرف دیکھا۔

''جی...... میں اس سے ملنا چاہتا ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں وہ کہاں دفن ہے؟''

''ہم تمہیں بتا چکے ہیں قبر کے تصور کے بغیر یہ عمل بیکار ہوگا۔''

افضل؟

افضل کہاں دفن تھی کیا وہ میانی صاحب کے نشیبی علاقے میں دفن تھی کیا راوی کے آس پاس اس کا استانہ تھا۔

میری ماں؟

ماں کی قبر کا نقشہ بھی مجھے یاد نہ تھا...... پتہ نہیں اس کی قبر کو کلر چاٹ گیا یا شاید وہ مائی تو بتے کے پتلوں کی طرح مٹی پر بے آسرا ہی پڑی ہو کہیں؟

''سائیں جی کیا سیمی مجھے مل سکتی ہے۔''

پروفیسر سہیل نے مجھے کہنی مار کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''مل تو سکتی ہے بیٹا لیکن اس کی قبر کا تصور تو لانا پڑے گا ذہن میں۔''

میں نے سر جھکا لیا آخری بار جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ ہسپتال کے لال کمبل میں لیٹی ہوئی تھی۔

''اچھا سائیں جی اجازت دیں؟''

پروفیسر سہیل اٹھ کھڑا ہوا اور ہم دونوں قبر سے باہر نکلنے لگے۔

''اچھا بیٹا تم کل آنا...... ہم تمہارے لیے کچھ سوچیں گے۔''

واپسی پر پروفیسر سہیل نے کار بہت تیز چلائی اور کئی جگہوں پر بریکیں لگائیں۔ وہ بہت مضطرب تھا، وارث روڈ کی کوٹھی میں داخل ہونے کے بجائے اس نے گیٹ کے سامنے کار پارک کر لی پارکنگ لائٹز کی وجہ سے سڑک پر ہلکا سا چانن ہو گیا۔ پھر اچانک ایک بوسیدہ عمارت کے پیچھے سے پورا چاند رسی ٹاپتا سامنے آ گیا ہمیں دیکھتے ہی اس نے اپنی رسی دائرے کی شکل میں اپنے گرد پھیلاتی اور ساکت ہو گیا۔

''یہ تم بار بار سیمی سے ملنے کی آرزو کیوں کر رہے تھے؟''

میرے پاس اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔

''میں تمہیں بہت لیکچر دیتا رہا ہوں لیکن ابھی تک بہت احمق ہو سٹوڈنٹ ......سائیں جی برگزیدہ ہستی ہیں کشف و کرامات سے آگے نکلے ہوئے ہےں ایسے بزرگان دین سے سیمی و یمی کا ذکر نہیں کرتے۔''

پھر ان سیمیوں کا ذکر کن سے کرتے ہیں سر؟ کن سے۔

''مجھ جیسے فری سٹائل پروفیسر سے جو تمہیں دنیا کے علم کے مطابق ایسی باتوں کا حل بتائیں۔''

''پھر بتائیں حل۔؟''

وہ سر کھجانے لگا...... ''گو میں خود بہرا الجھا ہوں اس سیمی کے ٹاپک میں...... لیکن مجھےبغلی راستے ملتے رہے ہیں تم میں وہ صلاحیت نہیں ہے۔''

مجھے کوثریاد آ گئی اسی نے مجھے بتایا تھا کہ پروفیسر سہیل بھی سیمی کا گرفتہ رہ چکا ہے۔

''یار...... یہ لڑکیاں بڑی لعنتی چیز ہیں پتہ نہیں چلتا کہ کہاں اتر چکی ہیں...... تمہارے اندر...... خاص کر سیمی شاہ تو بہت ہی دور تک اترنے والی تھی...... تھی نا؟''

''تھی جی...... بہت''

''بیچارے پروفیسر بھی کیا کریں وہ بھی جب کہ وہ عمر میں اپنے طالب علموں سے کچھ ہی سال بڑے ہوں۔''

میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''پروفیسر کی شان یہ ہے کہ باپ بن کر رہے گرو بن کر رہے...... اور...... لڑکی...... یہ چاہتی ہے کہ پروفیسر سر پر راکھ ڈال کر پیچھے پیچھے چلے...... لعنت ہے اس مخلوط تعلیم پر!''

''سہیل اور میں بہت دیر کار میں بیٹھے باتیں کرتے رہے امریکہ سے واپسی پر وہ میرا پروفیسر نہیں رہا تھا دوست بن گیا تھا۔ ایک طرح سے دوست تو وہ شروع دن سے تھا لیکن اب وہ مراتب کا لحاظ بھی جاتا رہا تھا۔ جب ہم دونوں نے تیسری ڈبیا سگریٹ کی شروع کی تو سہیل بولا...... یار لڑکی آخر چیز کیا ہے...... کچھ سمجھنے نہیں دیتی۔ کہیں پہنچنے نہیں دیتی۔ ہمیشہ ہر سوال کے سامنے اور ہر جواب کے پیچھے آ کھڑی ہوتی ہے۔''

میں حیرانی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ فرنچ کٹ داڑھی اور سرخ چیک کی بش شرٹ میں یہ نوجوان مجھے کچھ اجنبی سا لگا کبھی اس نے کسی ٹاپک پر ہار نہیں مانی تھی۔

''آج تک ہمیشہ تم نے اپنی مشکلات کا مجھ سے ذکر کیا ہے آج میں تمہیں اپنے اندر کی زندگی کے متعلق کچھ بتاؤں گا۔''

بڑے تعجب کی بات تھی کہ ابھی تک میں نے کبھی ڈاکٹر سہیل کی زندگی میں دلچسپی نہ لی تھی۔ وہ میرے لیے فقط علم کا Bionic Man تھا بغیر جذبات کے علم اگلنے والا۔

''جب تم لوگ کالج میں داخل ہوئے ہو......اس وقت میں اونچی اڑانوں میں تھا سٹاف روم میں میری باتیں سن کر Extension سے چمٹے ہوئے پروفیسر دنگ رہ جاتے میں علم کے بل بوتے پر ایک بڑا حسین وجمیل فرعون بن گیا تھا اندر سے مجھے کسی کی پروانہ تھی۔''

''اب ہے......سر۔''

''ہاں ہے......اپنی تھیوری کی......یاد ہے رزق حرام کی تھیوری۔''

''خدا کے لیے اسے دوبارہ نہ دوہرانے لگ پڑیں۔''

''نہیں اسکی چندراں ضرورت نہیں میں اپنی کتاب چھاپنے کے لیے امریکہ کے ایک پبلیشر سے بات کر رہا ہوں رزق حرام کی تھیوری پر تم سے بات ہوگی لیکن بزبان انگریزی ہوگی۔''

''پھر سر جب ہم داخل ہوئے تب؟''

چاندنی عادت ہے جب کبھی رازو نیاز کی باتیں ہو رہی ہوں وہ کسی نہ کسی درخت کی اوٹ سے نکل آتا ہے۔ اور کسی پھاپھا کٹنی کی طرح ساری باتیں چوری چوری سنتا رہتا ہے اس وقت بھی پورا چاند وارث روڈ پر نہ جانے کیوں اطلا ہو گیا تھا اور ایک کوٹھی کی تیسری منزل سے پورا نکلا ہوا ہماری باتیں سنے جا رہا تھا۔ ایسی لڑکی کی طرح جو اپنے باپ کی موجودگی میں اپنے منگیتر کی رنگین Slides نہیں دیکھ سکتی اور آدھا دروازہ کھول کر اندھیرے میں اپنے چندرماں کو دیوار کی سطح سے ٹمٹا دیکھتی ہے۔

''اتنے سارے علم کے باوجود...... اتنی بے اعتنائی دکھانے پر بھی وہ سیمی شاہ میرے دل میں گھستی چلی گئی میرے دل میں اگر علم کا تکبر اتنا نہ ہوتا تو شاید میں اسے لے اڑتا لیکن علم خود ایک حجاب ہے میرا خیال تھا کہ وہ میرے سامنے زانو ٹیک دے گی لیکن ابھی میں اپنے علم کو آگ نہیں لگا سکا تھا کہ آفتاب درمیان میں کود آیا۔ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کوئی عورت پسند کرتی ہے...... تھا نا......''

''تھا...... سر......'' میں ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم سب حیران تھے کہ...... کہ سیمی شاہ اچانک کالج کیوں چھوڑ گئی اور آفتاب نے اس سے شادی کیوں کہ کی...... یہ بات تمہارے لیے معمہ تھی......؟''

''اب بھی ہے۔''

''وجہ میں تھا...... میں برا آدمی نہیں ہوں۔ devil نہیں ہوں مائی ڈیر سٹوڈنٹ لیکن اتنے سارے علم کے باوجود میں اپنے Emotions پر قابو نہ پا سکا...... ان دنوں میں اس قدر شدید حسد کا شکار ہو گیا کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے...... آفتاب مجھ سے بہت متاثر تھا میں طالب علموں کو متاثر کیے بغیر اپنی نوکری کو حلال ہی نہیں سمجھتا۔''

''مجھے یاد ہے سر...... وہ سارا وقت آپ کی مالا جپتا تھا۔''

''جیسے تم...... مجھ سے متاثر ہو...... سہیل نے دھواں چھوڑ کر کہا...... لیکن تم دونوں مجھ سے نہیں میرے علم سے متاثر تھے۔''

''بس دو شامیں آفتاب نے میرے ساتھ ہوٹل میں گزاریں اور پھر اسے سیمی سے محبت ہو رہی ہو گی لیکن وہ سیمی سے شادی پر رضامند نہ رہا...... میں نے اسے بددل کر دیا سیمی سے۔''

''آپ نے...... آپ وجہ تھے......'' مجھے وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو شادی کے دن آفتاب نے مجھ سے تالاب کنارے کی تھیں وہ ساری گفتگو پروفیسر سہیل

سے......تھی

''ہاں میں ہی وجہ بنا......میں......سیمی میری طرف چڑھ وع چڑع میں مائل تھی لیکن آفتاب کو میں نے یقین دلا دیا کہ وہ کسی ایک مرد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی سیمی میں محبت تو تھی وفا نہیں تھی۔''

''یہ آپ نے کیا کیا؟......وہ تو سر سے پاؤں تک وفا تھی سر......اس نے تو آفتاب کے لیے جان دے دی۔''

سہیل نے بالوں میں ہاتھ پھیر کر کہا......''ہاں یہ میں نے کیا کیا قیوم......بہت دیر میں اس guilt میں مبتلا رہا لیکن اب نہیں......بہت سے راستے کھلے ہیں مجھ پر اس احساس جرم کا دروازہ کھلنے کی وجہ سے......بہت کچھ عطا کیا ہے مجھے اس guilt نے۔اب میں علم کا تعاقب حکم اور انکساری سے کرتا ہوں پہلے میں اسے تلوار کی طرح استعمال کرتا تھا۔میں کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا مجھے طبقاتی احساس کمتری نہ تھا چہرہ مہرہ بھی قابل قبول تھا......اس لیے یہ احساس کمتری پیدا نہ ہو سکا......شکر ہے جوانی میں guilt کا زہر رگوں میں اتر گیا ورنہ اپنے عہد کا پورا شیطان ہوتا مجھے بھی اس guilt نے بڑی مار دی ہے۔''

ہم دونوں چپ ہو گئے بہت دیر چپ رہے۔

''

پتہ نہیں آفتاب کا کیا حال ہے؟ وہ کہا پہنچا ہے اگر کبھی وہ تمہیں مل جائے تو مجھے امریکہ خط ضرور لکھنا میں چاہتا ہوں کہ وہ خوش رہے اتنے علم کی وجہ سےہم تو خوش نہیں رہ سکے۔''

''کب جا رہے ہیں آپ واپس؟''

''پرسوں ایک مہینے کی تو چھٹی تھی۔''

''اتنی جلدی۔''

اس نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا...... ''یار وقت کی حیثیت کیا ہے؟...... نہ گزرنا چاہے تو گزارا نہیں جا سکتا گزرنا چاہے تو یوں...... جاتا ہے یوں۔''

میں آخری بار ان کا چہرہ دیکھا اور بولا...... ''کیا آپ کو علم نہ تھا کہ آپ دو زندگیوں سے کھیل رہے ہیں؟ اتنے سارے فلسفے ...... اتنے سارے علم کے باوجود۔''

''ہاں اتنے سارے علم کے باوجود میں اپنے فعل پر قادر نہ تھا...... یہ علم کا سب سے بڑا المیہ ہے میرا نہیں''

میں کار سے اترا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا...... قیوم ہاتھ نہیں ملاؤ دے آخری بار......؟''

میں گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا...... ''سر...... سر...... سرمائی ڈارلنگ سر۔''

''یقین ماننا اس گناہ کے علاوہ میری سلیٹ بالکل پاک ہے...... اور اب مجھے اس گناہ پر افسوس بھی نہیں...... شاخیں جب تک کاٹی نہ جائیں درخت تن آور نہیں ہوتا......''

ہم دونوں دیر تک ہاتھ ملائے ٹھہرے رہے پھر اس نے پورے زور سے Accelerator کو دبایا اور چاندنی رات میں گرد اڑاتا وارث روڈ سے باہر نکل گیا۔ اس وقت گاڑی تیز چلانے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔!

جس وقت میں روشن کی پھوپھی کے گھر سے نکلا روشن میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

''پھر جی؟۔''

''تم فکر نہ کرو میں خود افتخار کو لینے ایئر پورٹ جاؤں گا۔''

''اچھا جی۔''

میں کئی دنوں بعد روشن سے ملنے پھوپھی کے گھر گیا تھا۔

وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی اور میں پیچھے دیکھے بغیر اینگل آئرن کے سفید پھاٹک کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''میں سوچتی تھی جی کہ...... کہ میں بھی چلتی ائر پورٹ آپ افتخار کو کیسے پہچان سکیں گے۔''

یکدم مجھے خیال آیا کہ واقعی میں افتخار کو کیسے پہچان سکوں گا؟

''آپ تکلیف نہ کریں میں پھوپھی جان کی کار میں وہاں پہنچ جاؤں گی وقت پر۔''

افتخار اپنے گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر پندرہ دنوں کی چھٹی پر آ رہا تھا خطوں میں اتنی بات طے پا گئی تھی کہ وہ اچانک آئے گا اور کراچی سے ہمیں ٹیکس دے کر مطلع کر دے گا۔ اس کے بعد کچھ قانونی کام تھے۔ یعنی افتخار کا روشن کے ساتھ نکاح اور میرا روشن کو طلاق دینا یہ سارے کام نپٹانے کے بعد افتخار کو اپنے گھر موچی دروازے چلے جانا تھا مجھے اپنے گھر سانده کلاں میں اور افتخار کی روانگی تک روشن کو وہیں پھوپھی کے گھر ٹھہرنا تھا۔ ساری سکیم میں گھر کی پھوپھی شامل تھی لیکن بار بار اس کا تقاضا ہوتا کہ کہیں بات نکل نہ جائے وہ روشن کی مدد کرنے کو تیار تھی بلکہ مغربی فلمیں دیکھ دیکھ کر اسے حالات میں بڑا مزا اور excitement کا موقع مل رہا تھا لیکن وہ موچی دروازے والے رشتے داروں سے ڈرتی بھی تھی۔ اس لیے تمام معاملے کو چوری چھپے نپٹانے کے درپے تھی۔

جس وقت افتخار کو لینے ایئر پورٹ پہنچا کراچی جانے والی سواریاں انکوائری سے لے کر اندر جانے والے چھوٹے دروازے تک بھری پڑی تھیں گوٹے کے ہار پہنے ہوئے پردیسی اور ان کی برقعہ پوش دار عورتیں...... کراچی سے آنے والی سواریوں کو

خوش آمدید کہنے اور ساتھ لے جانے والے لوگ ...... گرمی کے باوجود سمر سوٹ پہنے ہوئے بزنس مین فیشن ایبل لڑکیاں اور فینٹی بکس اٹھائے ہوئے عورتیں بیورو کریٹ اور ان کے سمسونائیٹ کے بیگ شلوار قمیض کے عوامی لباس میں نوجوانوں کا سر پھر ا ایک طبقہ ...... یونیفارم میں ٹاکی پھیرنے والی عورتیں سیکوریٹی کے افسر، سفید وردیوں والے پائیلٹ ہری شلوار آتشی گلابی قمیض اور پرنٹ کے دوپٹوں میں اترتی ہوئی ائیر ہوسٹیس، ائرپورٹ دیکھنے کا شوق رکھنے والے بچے نمائشی جسم دکھانے والی ذبلپتلی لڑکیاں سب جگہ لوگ ہی لوگ تھے۔

ائیر ہوسٹس لڑکیاں ان شہروں کے متعلق سوچتی نظر آتی تھیں جہاں سے وہ ابھی آئی تھیں اور جہاں کے لیے انہیں ابھی روانہ ہونا تھا بیوروکریٹ حسب عادت بار بار گھڑی دیکھ کر سامان کے tags کے متعلق سوچ رہے تھے فائلیں، گھریلو الجھنیں سفر کا شیڈول ان کے ذہن اور چہرے پر سوار تھا پائیلٹ سفید موروں کی طرح اترا ہٹ سے چل رہے تھے انہیں اپنی اہمیت کا احساس تھا کہ ان کے بغیر کوئی جہاز کہیں جانے کا اہل نہیں عورتوں کو گرمی لگ رہی تھی میک اپ کی تہہ تلے برقعوں کے اندر بیلٹ والی شلواروں میں پیڈ والی باڈسوں کے اندر مردوں کو تھری پیس سوٹوں کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی پھنسی ہوئی ٹائی اور رلاسٹک والے انڈرویئر کی وجہ سے کوٹ کی بغلوں کے نیچے اور کلائی پر بندھی ہوئی سٹین لیس سٹیل کی گھڑی تلے پسینہ آرہا تھا سب جگہ لوگ تھے۔ ہر انسان کے ساتھ کچھ وقتی کچھ طبقاتی کچھ اس کی عمر کے حساب سے جکڑنے والے مسائل تھے کوئی آدمی آزاد نہ تھا۔

ان ہی میں ایک روشن بھی تھی جس جنگلے کے پار مسافروں کے سوائے اور کوئی نہیں جاتا وہاں روشن بھی تھی جنگلے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اس نے بڑھے ہوئے پیٹ کو چھپانے کے لیے ٹانسے کی سفید چادر ایسے اوڑھ رکھی تھی کہ پیٹ اور بھی نمایاں ہو گیا تھا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ زرد تھا اور اب دونوں گالوں پر چھائیاں دھبوں کی

صورت نظر آتی تھیں۔

''میں نے پتہ کرلیا ہے فلائیٹ وقت پر آ رہی ہے۔'' میں نے روشن کے قریب آ کر کہا۔

وہ چپ رہی۔

''مبارک ہو۔''

اس نے نظریں جھکا لیں۔

''اب کیا ہوگا۔''

کچھ دیر کے بعد اس نے بغیر نگاہیں اٹھائے کہا۔

''تم باہر چل کر ہوائی جہاز اترتے دیکھنا چاہتی ہو۔''

''نہیں جی باہر بہت گرمی ہے......'' اس نے رومال سے اپنے ہونٹوں کے بالائی والا حصہ کو پونچھا۔

''اچھا تو یہیں انتظار کر لیں......''

اس وقت اناؤنسمنٹ ہوئی کہ کراچی سے آنے والا ڈی سی ٹن لینڈ کر گیا ہے ہم دونوں عمارت سے باہر نکلنے لگے۔

''اب کیا ہوگا جی؟......'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر پھر کہا۔

میں نے سگریٹ سلگایا لمبا کش لیا اور کہا...... ''تمہارا نکاح ہوگا اور کیا ہوگا۔''

''ہاں جی وہ تو ٹھیک ہے پر......''

ہم دونوں آہستہ آہستہ بیرونی راستے کی طرف چلنے لگے۔ وہ بار بار چہرہ پونچھ رہی تھی۔

''آپ کئی دن سے آئے نہیں......؟'' روشن نے سوال کیا۔

''صبح میں ریڈیو سٹیشن چلا جاتا ہوں اور شام کو......'' میں چپ ہوگیا۔

''اور شام کو؟۔''

''شام کو سائیں جی کی طرف۔''

میں نے روشنکو یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ میں ہر روز باقاعدگی کے ساتھ سائیں جی کے پاس جاتا ہوں پھر سائیں جی مجھے ساتھ لیکر ٹیلوں کی اوٹ میں چلے جاتے ہیں وہاں سائیں جی کی قبر میں بیٹھ کر ہم دونوں گھنٹہ بھر پاس انفاس کرتے رہتے ہیں۔ پھر عشاء کی نماز کے بعد سائیں جی قبر میں بیٹھ کر تلاوت شروع کر دیتے ہیں اس وقت میں ان کے پاس نہیں ہوتا۔ لیکن قبر کے دہانے پر بیٹھا رہتا ہوں مجھے آخری سیڑھی پر بیٹھ کر خالی الذہن ہونے کی پریکٹس کرنی پڑتی ہے...... تہجد کے وقت تک مجھے جنگل کی طرف سے لاکھوں آوازیں آتی ہیں پھر فجر کے بعد اتنی خاموشی ہونے لگتی ہے کہ اپنے دل کی دھڑکن بھی گھڑی کی ٹک ٹک جیسی سنائی دیتی ہے سارے مسام کھڑے رہتے ہیں نتھنوں میں کئی قسم کی خوشبو آتی ہے اور لگتا ہے کہ عین گدی کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ اپنے پھڑ پھڑا رہا ہے میں نے ان پروں کا ذکر سائیں جی سے کیا تو وہ بولے...... ''دیکھو بیٹا پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ دیوانے ہو جاؤ گے عموماً یہ موت کے پروں کی آواز ہوتی ہے اگر تم موت کے حضور خوف زدہ نہ ہو تو وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔''

''لیکن سائیں جی پروں کی آواز مجھے ذکر کرنے نہیں دیتی۔''

''تم کو معلوم نہیں اس وقت فرشتے آسمانوں سے اترتے ہیں کچھ فرشتوں کو رزق تقسیم کرنا ہوتا ہے...... کچھ فرشتے خوشیاں بانٹنے نکلتے ہیں کچھ اسرار و رموز سکھانے آتے ہیں نسل انسانی کو حکمت الٰہی سے شناسا کرنے بھی کئی یہاں آتے ہیں موت کا فرشتہ اپنی سواریوں کو تکنے کے لیے نکلتا ہے تم کو مڑ کر نہیں دیکھنا ورنہ ختم ہو جاؤ گے۔''

''اچھا سائیں جی......'' ان باتوں کا ملاقاتوں کا ذکر روشن سے بالکل بیکار ہے وہ مجھ سے ایک قدم پیچھے چل رہی تھی۔

ہم دونوں ادھر آ گئے جہاں ٹیکسی سٹینڈ ہے اور کراچی آنے والی سواریاں اترتی

ہیں چونکہ ڈی سی ٹن آیا تھا اس لیے سواریاں میلے کی طرح اتریں بہت انتظار کے بعد سامان پہنچا اور لوگ لدے پھندے رخصت ہونے لگے۔ دوبئی مسقط کویت اور سعودی عرب سے آنے والے کماؤ لوگوں کا عجیب عالم تھا ان کے ہاتھوں میں ریڈیو ٹیپ ریکارڈر گلے میں کیمرے جسم پر فرنگی جیکٹیں، بازوؤں سے لٹکتی ترمیس اور خوبصورت کمبل کلائی پر کئی گھڑیاں تھیں وہ باہر کے ملکوں میں کام کرنے کی وجہ سے خود اعتمادی کا ڈھیر نظر آتے تھے اور انہیں اپنے رشتہ دار خوشامدیوں کی طرح آگے بڑھ بڑھ کر سلام کر رہے تھے۔

بہت بعد میں افتخار آیا۔ وہ بھی جلد پلٹ لوگوں کی طرح سامان سے لدا ہوا تھا۔ جب وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے اس کے ہاتھ سے تھرموس پکڑ لی اور کیمرہ اس نے روشن کے گلے میں لٹکا دیا وہ بہت خوش تھا۔

''آپ نے بہت تکلیف کی...... میں خود پہنچ جاتا۔''

''کوئی بات نہیں۔''

روشن اور میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور وہ ہم دونوں سے کچھ ہٹ کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا جس وقت میں ٹیکسی والے سے جھگڑا کرنے لگا تو افتخار نے فوراً مدافعت کی...... ''کتنے پیسے مانگ رہا ہے۔؟''

''یہ ساتھ گلبرگ ہے اور یہ بیس روپے مانگ رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں سر کل چھ سات ریال کی تو بات ہے چلیں۔''

میں شرمندہ ہو گیا۔ ہم تینوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے وہ میرے اور روشن کے قانونی رشتے کو مدنظر رکھ کر آگے بیٹھا...... سارے راستے ایک بار بھی اس نے روشن کی طرف نہیں دیکھا۔ بلکہ پیچھے منہ کر کے صرف مجھ سے باتیں کرتا رہا۔

''ٹیپ ریکارڈ میں اپنے چھوٹے بھائی کے لیے لایا ہوں اس نے مجھے کئی خط لکھے تھے...... یہ دیکھئے بالکل Latest فیشن ہے Stero ہے میں نے کہا ایک بار لے

جانا ہے اچھا لے جانا چاہئیے قیمت کی میں نے کبھی پروانہیں کی...... یہاں ترموس کی کیا قیمت ہے۔"

میں نے اندازے سے ترموس کی قیمت بتائی۔

"مجھے تو اسی ریال میں ملی...... یہ دیکھئے...... ایسے پانی نکلتا ہے" اس کے کہنے پر میں نے تھرموس کی مکینکل ٹوٹنی دبا کر دیکھی۔

"پہلے میں یوشیکا کا کیمرہ لانے لگا تھا۔ پھر خیال آیا پولورائیڈ ٹھیک ہے فٹ تصویر کھینچو فٹ تیار ہو جائے۔ آپ ایسے ہی رہیں میں آپ کو دیکھاتا ہوں ابھی۔"

اس نے روشن کے گلے سے کیمرہ اتار کر چلتی گاڑی میں تصویر کھینچی۔ تصویر کیمرہ سے نکلتے ہی تیار تھی آہستہ آہستہ اس کے رنگ گہرے ہونے لگے۔ پھر اس نے وہ تصویر مجھے پکڑادی۔

شادی کے بعد روشن کے ساتھ یہ میری پہلی فوٹو تھی۔

تصویر میں روشن گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔

"کمال ہے......" میں نے حیرت سے کہا...... "ابھی تصویر کھینچی اور فوراً کیمرے میں ہی Develop بھی ہو گئی۔"

"اب تو جی جدے سارے لوگ Instant کیمرہ خریدتے ہیں یہاں پر اس کا نیگو مل جائے گا۔"

"معلوم کرنا پڑے گا...... شاید ملتا ہو...... شاید نہ ملتا ہو......" میں نے لجاجت سے کہا۔

گھر پہنچ کر ہم دونوں سعودی عرب کی دولت، بیرونی ممالک سے اس کے سیاسی تعلقات، پاکستان کی اور جدہ کی قیمتوں کا موازنہ مغربی کلچر کا اسلامی ممالک میں انتراج اسلامی قدروں کی بے حرمتی اسرائیل کی ویسٹ بنک کے معاملے میں ڈھٹائی اور پی ایل او کی باتیں دیر تک کرتے رہے۔ پھوپھی جان خصوصاً گلبرگ

خاتون تھیں اور چٹی ان پڑھ تھیں محض اپنی دولت کی وجہ سے گفتگو میں شریک رہیں روشن سارا وقت خاموش تھی۔

شام کی چائے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو سب چپ ہو گئے۔

''پھر اب؟......''نوجوان پلی پلائی پھوپھی نے سوال کیا۔

روشن نے لحظہ بھر کو نگاہیں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

''اب تو مجھے فاروق صاحب سے بات کرنا پڑے گی......''پھوپھی بولی۔

''تو ابھی تک آپ نے ان سے بات نہیں کی......''افتخار نے خوفزدہ ہو کر سوال کیا۔

'' نہیں کی تو ہے ......کی تو ہے ......لیکن اب پوری طرح arrangemant کرنی پڑے گی ناں؟''

''اگر کسی نے مجھے ایئر پورٹ پر دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی......''افتخار نے ناک میں انگلی پھیر کر کہا۔

''نہیں کل ہی سب کچھ ہو جانا چاہیئے......پھوپھی نے اپنے سونے کے چوڑے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا......کیوں قیوم؟''

''جیسے آپ کہیں۔''

میں کئی دنوں سے جانتا تھا کہ افتخار روشن کو لے جانے کے لیے آرہا ہے لیکن پھر بھی مجھے محسوس ہوا کہ سب کچھ بہت آناً فاناً ہو رہا ہے۔

''آپ کسی وکیل سے مل کر طلاق کے قانونی کاغذ تیار کروالیں۔ ایک دو دن میں۔''

یکدم روشن کا چہرہ پہلے سے زیادہ پیلا ہو گیا اور اس کی چھائیاں نمایاں ہو کر چہرے پر پھیل گئیں۔

''دیکھئے ناں قیوم صاحب......یہ بہت بڑا قدم اٹھا رہی ہے روشن......ہمارے

خاندان میں پہلے ایسے کبھی نہیں ہوا اگر موچی دروازے یہ خبر پہنچ گئی تو کہرام مچ جائے گا روشن کی ماں تو زہر کھا لے گی۔"

"اس وقت میں روشن کا ضامن ہوں ...... میرا خیال ہے کوئی اور صورت ممکن نہیں"

"پھر بھی بھائی مختار بات نہ نکلے......" اس نے افتخار کو مخاطب کر کے کہا۔

"دیکھئے میں تو آپ کے پاس ہوں آپ چاہے زنجے پاؤں میں ڈال کر مجھے باندھ رکھیں باقی قیوم صاحب مالک ہیں ...... یہ اگر کسی سے بات کرنا چاہیں تو میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔"

"آپ ان کی طرف سے بے فکر رہیں" پہلی بار روشن نے جواب دیا۔

جب نکاح کی تفصیلات طے پا گئیں تو یکدم روشن کی پھوپھی بولیں ...... لیکن روشن ایک الجھن میری بھی ہے...... میں نے تمہاری دل و جان سے مدد کی ہے تم تو جدہ میں آرام کرو گی عیش کرو گی گھر والوں سے مجھے ہی بھگتنا پڑے گا...... تمہارے بعد۔

روشن کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔

"آپ فرمائیں آپ کی کیا الجھن ہے...... آپ کی الجھن کو بھی ہم خلاص کریں گے۔" افتخار نے کہا۔

"بس جس وقت نکاح ہو جائے افتخار اپنے گھر چلا جائے اور روشن قیوم کے ساتھ چلی جائے کسی کو علم نہ ہو کہ نکاح میرے گھر میں ہوا ہے ......" پھوپھی نے چہرے کو کاغذی رومال سے پونچھ کر کہا۔

"لیکن کبھی نہ کبھی تو یہ بھید کھلے گا......" افتخار بولا۔

"ہاں کبھی نہ کبھی تو ٹھیک ہے لیکن جب تک روشن پاکستان میں ہے یہ بات نہیں کھلنی چاہیے۔"

''میں قیوم صاحب کے ساتھ چلی جاؤں گی......'' روشن نے مری ہوئی آواز میں کہا...... ''کیوں قیوم صاحب؟''

''ٹھیک ہے......بالکل۔''

''خلاص......خلاص......اب کل تک یہ ٹاپک بند......'' افتخار نے خوش دلی سے کہا۔

ساتھ ہی اس نے اپنی کلائی سے بندھی ہوئی چھ گھڑیوں میں سے ایک گھڑی اتار کر میری طرف بڑھائی...... ''قیوم صاحب یہ گھڑی باندلیں Digital گھڑی ہے سر بالکل نیو ڈیزائن کی۔''

''مجھے گھڑی کی ضرورت نہیں......یہ دیکھئے یہ بندھی ہوئی ہے......شکریہ''

میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر جدہ ایئر پورٹ کی باتیں سنتا رہا......اور پھر رخصت ہو گیا۔

سائیں جی اس روز ڈیرے پر موجود نہیں تھے۔ میں بھی جانتا تھا کہ مغرب کے بعد وہ کہاں ہوتے ہیں کئی دن سے میں ٹوٹا ٹوٹا بکھرا ہوا ان کے پاس پہنچتا قبر میں بیٹھ کر پاس انفاس کے وقت مجھ سے کئی غلطیاں ہو جاتیں لیکن سائیں جی جھڑکنے والے آدمی نہ تھے وہ مجھے ساید مابعد کا سچا مالک سمجھ کر میری رہبری کر رہے تھے لیکن میں تمام تر موت کے شکنجے میں تھا میرے......تمام خواب جاگتے کی سوچیں میرے خیالی خواب موت کے متعلق ہوتے کبھی کبھیمیں موت سے اس درجی خائف یو جاتا کہ بیٹھے بیٹھے میرا سارا وجود پسینے میں بھیگ جاتا اور میری پتلیاں خوف سے گھومنے لگتیں میں نے ریڈیو سٹیشن پر اچانک استعفے داخل کرا دیا تھا۔ اب مجھ سے موٹر سائیکل نہ چلتی تھی مجھے لگتا تھا کہ اگلے موڑ پر اچانک میں کسی بس ٹیکسی یا کار سے بھڑ جاؤں گا روشن کو لاق سینے کے بعد بھی اس کا تمام سامان میرے گھر میں موجود تھا

بھائی مختار اور صولت بھابھی کچھ نہ جانتے تھے روشن کے گھر والوں کو معلوم نہ تھا کہ ان کی بیٹی کو طلاق ہو گئی ہے

اس روز سائیں جی کے پاس پہنچتے پہنچتے میرا سانس اکھڑا ہوا تھا۔

''آ جاؤ اندر......'' قبر میں سے آواز آئی۔

سیڑھیوں کے باہر جوتیاں اتار کر میں اندر چلا گیا اگر بتی کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک اور باریش بزرگ سائیں کے پاس بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے اس نورانی بزرگ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

آج سائیں جی جسم اور روح کے اعتبار سے بہت چھوٹے لگ رہے تھے۔

موت سے بہت ڈرتے ہو؟...... نئے باریش بزرگ نے سوال کیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''فنا کے بغیر بقا کے آرزو مند ہو؟......''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''موت انسان کی محسن ہے...... نہ تو اس زندگی کو کتنی پائیداری ہوتی جس میں حزن وملال کے سوا کچھ نہیں......'' نورانی بزرگ بولے

''جی......''

سفید ریش والے بزرگ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''ہمارے ساتھ چلو گے؟''

میں نے اپنے سائیں جی کی طرف دیکھا وہ آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔

''کہاں جی؟......'' میں نے سوال کیا۔

''کہاں پوچھنے والا تیار نہیں ہوتا...... باہر چل کر بیٹھو......''

''جاؤ......'' سائیں جی نے آہستہ آہستہ سے کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں عشاء کی نماز تک باہر بیٹھا رہا لیکن قبر کے اندر سے کوئی آواز نہ آئی پھر جنگل

کی طرف سے گیدڑوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔اور جب آسمان پر تیتری بولی تو قبر سے آواز آئی۔

''یہاں آؤ۔''

میں ڈرتا اندر چلا گیا۔

سائیں جی اکیلے بیٹھے تھے قبر میں سوندھی مٹی کی خوشبو تھی اور اکلوتی موم بتی میں سائیں جی کے تین سائے دیوار پر پڑ رہے تھے۔

''بیٹھو......''

میں دوزانو بیٹھ گیا۔

''آج تم نے بہت بڑا موقع گنوا دیا پیر و مرشد کے ساتھ چلے جاتے تو عاقبت سنور جاتی۔''

''میں ڈر گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے......اب اگلی جمعرات کو یہیں اس لڑکی کا دیدار ہو گا جس کا تم نے ذکر کیا ہے اگر چوک گئے تو ساری عمر کے لیے مجذب ہو جاؤں گے حواس قائم رکھے تو اس سے فیض حاصل ہو گا......تیار ہو......''

''جی تیار ہوں۔''

''دیکھو عرفان اور دیوانگی میں بس ایک حواس کا فرق ہوتا ہے......حواس قائم رہیں تو عرفان نہ رہیں تو دیوانگی تیرہو۔''

''جی تیار ہوں۔''

نکاح بہت خاموشی کے ساتھ ہوا اس کے بعد افتخار اپنے گھر موچی چلا گیا۔اور روشن میرے ساتھ سانده کلاں آ گئی۔وہ اور میں سارا رستہ خاموش رہے۔گھر پہنچتے ہی اسے قے شروع ہو گئی بار بار وہ غسل خانے جاتی اور واپس آ کر نڈھال لیٹ

جاتی۔ میں بھابھی صولت کو اس کی حالت کی متعلق کچھ بتانا چاہتا تھا۔ میں روشن کو بتائے بغیر ڈاکٹر سے دوا لینے چلا گیا۔

پھر ہم دونوں فروعی کے علاوہ کوئی بات نہ ہوئی۔ کچھ ویزے اور پاسپورٹ کی باتیں سامان چھوڑنے اور رکھنے کے امور کچھ بدنامی کے خدشات کبھی کبھی ماں باپ اور پاکستان چھوڑنے کا غم زیرہ ذکر رہا۔ لیکن قفل دونوں طرف سخت لگا تھا۔ دوسرے دن مغرب کے وقت روشن کو افتخار کے ساتھ جدہ روانہ ہونا تھا اپنے گھر والوں سے افتخار نے جدہ واپس جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میرے گھر میں سوائے میرے اس حقیقت سے کوئی آگاہ نہیں تھا۔

یہ روشن کی میرے گھر میں آخری رات تھی ہم دونوں کے پلنگوں میں ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا لیکن وہ اور میں دم سادھ چپ لیٹے تھے پتہ نہیں کیا سوچتے ہوئے مجھے نیند آگئی پھر مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے بازو پر برف کی قاش رکھ دی۔ میں نے آنکھیں کھولیں روشن میرے پلنگ پر بیٹھی تھی اس کا بھاری پیٹ اس کی گود میں تھا اور ٹھنڈی انگلیاں میرے بازو پر تھیں۔

''کیا بات ہے روشن؟۔''

''میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی......شاید کل وقت نہ ملے۔''

آنسو اس کی آنکھوں سے بلا تکان گر رہے تھے۔

''آپ بڑے اچھے آدمی ہیں اگر آپ میرے بچے کو قبول کر لیتے تو......تو میں یہاں سے کبھی نہ جاتی۔''

زندگی میں پہلی بار ایک ٹھنڈا جھونکا میرے بند دل میں گھس آیا۔

''تم......تم یہاں رہنا چاہتی ہو میرے پاس۔''

''آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں۔ آپ نے مجھے سب کچھ دیا اور پلٹ کر کچھ بھی نہیں مانگا......؟''

''صرف احسانات؟......''میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

یکدم اس کی آنکھوں کے جھرنے بند ہوئے۔

''اگر......اگر میں تم کو نہ جانے دوں روشن تو......تو افتخار کو بھلا سکو گی؟''

اس نے نظریں جھکا لیں......''جی نہیں......یہ ممکن نہیں۔''

میں نے آخری بار کسی کو زخم عطا کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔

''پھر یہاں رہنے کا فائدہ؟ حاصل یہاں رہنے سے۔''

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟......دیکھئے نا......دیکھیے ناں میں یہاں رہ سکتی ہوں ساری عمر آپ کے پاس......لیکن افتخار کو نہیں بھلا سکتی حالانکہ......وہ آپ کی جوتیاں جیسا بھی نہیں۔''

میں نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی گندے نالے کی متعفن ہوا مکے کی طرح میرے جبڑے پر پڑی اور گزر گئی۔

''سو جاؤ......یہ باتیں فضول ہیں......ایسی باتوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

کچھ سڑکیں جب شہر سے باہر نکلتی ہیں تو کافی فاصلے تک پکی اور مضبوط نظر آتی ہیں۔ پھر ان کے کنارے بھرے بھرے ہونے لگتے ہیں جا بجا گڑھے نظر آتے ہیں اور پکی سڑک کچے راستے بدل جاتی ہے ایسا راستہ جو بارش میں کیچڑ اور دلدل میں بدل جاتا ہے کچھ دور جا کر یہ کچا راستہ جھاڑیوں میں کھیتوں کے دہانے پر ختم ہو جاتا ہے یہ سڑکیں کسی گھر کسی شہر کسی محلے کو نہیں جاتیں بس یوں ہی شہر چھوڑ کر دم سا چھوڑ دیتی ہیں۔

میں بھی ایک ایسی ہی سڑک تھا۔ شادی سے نکل کر نہ جانے مجھے کہاں جانا تھا؟ اس وقت مجھے روشن میں سیمی، عابدہ، امتل اور جانے کون کون نظر آ رہا تھا سامنے بیٹھی ہوئی گابھن عورت سے میری کوئی جان پہچان نہ تھی ساری عمر میں نے عورتوں کے ادھ کھلے دروازوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندر والوں نے کبھی آواز دے

کرنہ بلایا۔

''آپ کیا سوچتے ہوں گے۔'' روشن بالآخر بولی۔

''میں کچھ نہیں سوچتا روشن...... کبھی کبھی صرف اتنا کہ کاش تم نے مجھے ایک رات دھوکے میں رہنے دیا ہوتا...... کاش صرف ایک رات کے لیے کسی کا جسم کسی کا دل ایک وقت میں میرا ہوتا۔''

''آپ رو رہے ہیں جی؟''

روشن نے اپنا دوپٹہ اٹھا کر میری گال سے لگا دیا۔

''میں کیا کرتی جی میرا دل کا ہے۔ میرا جسم میں اس کی روح پل رہی ہے میں آپ سے کیسے جھوٹ بولتی۔''

مجھے احتل نے یہ نہیں بتایا تھا کہ باکرہ لڑکی ذہنی قلبی طور پر باعصمت ہی نہیں ہوتی۔ سچی بھی ہوتی ہے کاش اس نے صرف ایک رات کے لیے مجھے جھوٹ کی زندگی بسر کرنے دی ہوتی۔

''میں...... آپ جیسے اچھے انسان کو کیسے اتنا بڑا...... فریب دے سکتی تھی؟......''

وہ چپ ہو کر اپنے پلنگ پر جا بیٹھی۔

میں نے تکیے پر سر ڈال دیا لیکن نہ میں ساری رات سویا نہ اس نے آنکھ بند کی چونکہ ہم میں قانوناً اور شرعاً کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے ہم انسانی کشش کے تحت ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ جیسے کسی جہاز کے باسی جہاز برو ہونے کے بعد کسی جزیرے میں رہنے لگیں اور نسل قوم مذہب کی تمام زنجیریں ٹوٹ کر انہیں نئے رشتوں میں پرونے لگیں۔

میں نے اسے آہستہ آہستہ اپنے گاؤں کے متعلق بتایا کیسے چندرا کی آبادی کلر کے ہاتھوں بے آباد ہوئی کیتوں کھلیانوں کی سفیدی کیسے ہریاول چاٹ گئی۔ اور ڈھور ڈنگر انسان سب چندرا چھوڑ کر چلے گئے پھر میں...... اسے عزیز گا تن کے متعلق

اس کی ماں کی زندگی کے متعلق ایسی تفصیل سے باتیں سنانے لگا کہ میں خود حیران رہ گیا۔میرا خیال تھا کہ مجھے وہ تفصیلات معلوم ہیں۔

''تمہارا کیا خیال ہے روشن...... کیا بد دعا سے بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔''

''ہاں جی...... اجڑ جاتی ہیں۔''

پہلی بار روشن سے بات کرنا بہت آسان تھا وہ پہلو کے بل کہنی ٹیک کر اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کا پیٹ تہہ کیے ہوئے تکیے کی طرح اس کے سینے کی طرف چڑھا ہوا تھا۔

''میں ایک دفعہ سکول سے لوٹی تو میری باجی ایک خط پڑھ رہی تھیں۔ میں نے خط کے متعلق پوچھا تو انہوں نے مجھے نہ بتایا بلکہ خط چھپا دیا...... کبھی کبھی کتنا تجسس پیدا ہو جاتا ہے انسان میں...... بھلا مجھے کیا ملنا تھا خط سے...... لیکن آخر میں نے خط تلاش کیا اور پڑھا...... وہ خط میرے خالو کا تھا...... وہ خط ایسا تھا جو انہیں باجی کو لکھنا نہیں چاہیے تھا...... مجھے خط پڑھنے کے بعد اسے وہیں چھپانا چاہیے تھا...... باجی جانتی اس کا کام جانتا...... لیکن میں نے خط پکڑ کر امی کو دے دیا...... امی نے ابو کو بتایا...... ابو نے خالو کو طلب کیا...... باجی بے چاری کا کوئی قصور نہیں تھا۔پھر بھی وہ دھری گئی...... دیکھتے دیکھتے اس کا نکاح کر دیا گیا۔جس روز وہ رخصت ہوئی ہے مجھے کبھی وہ دن نہیں بھولتا...... باجی میرے کمرے میں آئی اور بولی...... کاش کبھی تیرے ساتھ بھی ایسا ہو...... تو بھی شادی کہیں کرنا چاہے ہو کہیں جائے...... میں نے ڈرتے ڈرتے کہا تو کیا آپ خالو جان سے شادی کرنا چاہتی تھیں؟''

''خالو جان گئے بھاڑ میں...... مجھے ان سے کیا لینا ہے؟...... جہاں بھی میں چاہتی تھی وہاں تو تو نے نہیں ہونے دی ناں کم بخت!...... اللہ تجھے بدلہ دے...... آپ کا کیا خیال ہے...... دولہن کی بد دعا زیادہ لگتی ہے کہ کنواری کی......؟''

ہم دونوں کافی دیر تک ایسے ہی سوال ایک دوسرے سے پوچھتے رہے پھر میں

نے اسے اپنی ماں کی موت کے متعلق بتایا...... سیمی کا سرا واقعہ سنایا، افتی کے قتل کی داستان سنائی...... لیکن ابا کے متعلق میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا...... میں اپنے بابا گدھ کی یادوں کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا تھا...... مجھے لگتا کہ اس کی گمشدگی یا موت میری اپنی گمشدگی ہے میں اس کے ساتھ ہی کہیں کھو گیا تھا کہیں ختم ہو گیا تھا۔

آخری بار جب میں نے ابا کو دیکھا وہ تیسری منزل پر اس ممٹی کے پاس کھڑا تھا جس میں سے کبھی دھواں نکلا کرتا تھا۔

کیا وہ عشق لاحاصل سے دیوانہ ہوا؟...... کیا وہ چاچا غلام کے ساتھ مل کر رزق حرام کھانے کا مرتکب ہوا؟...... کیا اسے موت کے انتظار نے پاگل کیا؟

ائیرپورٹ پر افتخار موجود تھا روشن کا سوٹ کیس اٹھائے ہم دونوں اس کے پاس پہنچے۔ اس وقت اس نے سادہ شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور اس کے جسم پر کوئی سامان نہ تھا اناؤنسمنٹ سے پہلے ہی وہ دونوں اندر چلے جانا چاہتے تھے۔ کیونکہ کسی نہ کسی واقف کے مل کانے کا خطرہ تھا۔

جنگلے کے پاس پہنچ کر افتخار نے سادگی اور خلوص سے ہاتھ ملایا اور بولا

''آپ نے میری بہت مدد کی ہے سر...... میں آپ کا شکر گزار ہوں...... کوئی اور ہوتا تو......''

وہ چپ ہو گیا سعودی عرب کی کمائیاں جدے کے بازار پردیس کی ایک اور Frequency کی اندگی اس کے دل کو مکمل طور پر مجبور نہ کر سکی تھی۔

''اگر آپ...... عمرہ کرنا چاہئیں تو جی خادم کے پاس رہیں ڈیڑھ گھنٹے کا تو راستہ ہے جدہ سے...... بڑی اچھی ائیر کنڈیشنڈ بس چلتی ہے الشرکیۃ العربیہ النقل راستے میں صرف ایک بار رکتی ہے میں ٹکٹ بھیج دوں گا آپ ٹکٹ کی فکر نہ کریں آپ بس آنے کا ارادہ کریں۔''

روشن چپ تھی اس کا چہرہ آج سوجا ہوا تھا اور چھائیاں گہری لگ رہی تھیں

''انشاءاللہ......''بہت آہستہ روشن بولی۔

''انشاءاللہ......''میں نے اس سے بھی آہستہ کہا۔

''میں تو مہینے میں ایک دو عمرے کھڑکا لیتا ہوں......آپ ضرور آئیں یہ میرا ایڈریس ہے......آپ صرف مجھے لکھ دیں......کب آنا چاہتے ہیں ٹکٹ پہنچ جائے گی۔ میرے پاس دو کمروں کا گھر ہے غسل خانہ سادی زندگی ہے آپ enjoy کریں گے۔''

''اچھا۔''

اندر جانے سے پہلے افتخار نے مجھے جپھی ڈالی اور میرے کندھے کر چوم کر بولا'' مجھے بڑا افسوس ہے سر لیکن......''

اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ روشن کا بیگ اٹھا کر جلدی سے جنگلے کے اس پار چلا گیا۔

روشن کھڑکی رہی کچھ لمحے کچھ سیکنڈ متذبذب حیران......دکھ میں بھیگی ہوئی۔

ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہمیں کیسے ایک دوسرے کو الوداع کہنی چاہیئے پھر وہ اندر کی طرف مڑی اور پلٹی......یکدم ہم دونوں بغل گیر ہو گئے اس کا پیٹ درمیان میں حائل نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے ہونٹ اس کے سر پر پیوست کر دیے اور اس کے آنسو میری قمیض میں جذب ہونے لگے۔

یہ کل دس بارہ سیکنڈ کا واقعہ ہوگا۔ لیکن اس کے جسم کا قرب عرصہ تم کیرے ساتھ رہا میرے ہونٹ اس کے سر کو کتنی ہی دیر چومتے رہے شاید میں بھی ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر اس کے ساتھ تھا۔

پھر اس نے آخری بار ہاتھ ہلایا ہوئی جہاز کے پیٹ میں گھس گئی۔ اس کے بعد افتخار نے اپنی اور اس کی سیٹ تلاش کی ہوگی اسے کھڑکی کی جانب بٹھایا ہوگا۔ اس

کے پیٹ کا خیال کر کے بلٹ باندھی ہوگی۔شاید اس کی کھڑکی سے جنگلے کے ساتھ کھڑے لوگوں کا ہجوم بھی نظر آرہا ہوگا۔لیکن اب افتخار کا بالوں بھرا بازو ایئر ہوسٹس کی اناؤنسمینٹ کے بعد آخری سگریٹ بجھاتے ہوئے اسے چھو رہا ہوگا۔پلین کے اندر سندھی فوک میوزک سنتے ہوئے تمام مسافر ہوا کے لیے بنائے ہوئے Setducts کر رہے ہوں گے۔افتخار نے بھی ہوا کا رخ روشن کی طرف کر دیا ہوگا۔

ٹھنڈی ہوا......افتخار نئی منزل......ہمیشہ ٹھنڈی ہوا کا تازہ جھونکا......ایک نئی منزل کی ایئر ٹکٹ......زخم کتنی جلدی مندمل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟اور پھر یہ تو کوئی زخم نہ تھا!

ایئر پورٹ سے مجھے سیدھے سائیں جی طرف جانا تھا......طے تھا کہ اس جمعرات کو میں سیمی سے ملوں گا......سائیں جی دو دن پہلے سارا معاملہ طے کر چکے تھے اور وہ مجھ سے ملنے پر رضامند تھی مجھے اس سے ملنے پر صرف ایک سوال پوچھنا تھا اس سوال کو میں کئی طور پر ذہن میں ترتیب دے چکا تھا......''سیمی!اب تو تم مجھے اور آفتاب کو بہتر طور پر جانتی ہو بتاؤ اگر اب تمہیں ہم دونوں میں سے کسی کو پسند کرنا ہو تو کسے منتخب کرو گی؟''

جس وقت میں سائیں جی کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا اندر ہی اندر میں سیمی کے جواب سے خوفزدہ تھا کیا وہ اسی طرح نیلی جینز پہن کر بازو پر کینوس کا تھیلا لٹکائے آئے گی؟کیا اب اس کا جواب وہی ہوگا جو زندگی میں تھا کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ شاید مصری عورتوں کے احرام کی طرح وہ ایک سفید لبادے میں ہو گی سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی اور چہ......شاید وہ میرے سوال کا جواب دینا پسند نہ کرے؟

سائیں جی کے ڈیرے پر مکمل خاموشی تھی اندر باہر کوئی نہ تھا صرف مغرب کی نماز کے بعد کا اندھیرا ساری جگہ چھایا تھا ڈیرے سے پار سائیں جی کی قبر اب مجھے بلا

رہی تھی میں آہستہ آہستہ ادھر چلنے لگا ایک بات بار بار دل میں آ رہی تھی جسے میں دبانا چاہتا تھا۔ اگر سیمی نے وہی جواب دیا جو وہ زندگی بھر دیتی ائی تھی پھر؟

جس وقت میں سائیں جی کی قبر سے کچھ فرلانگ دور پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ اس طرف سے کچھ لوگ اا رہے ہیں یہ لوگ ٹکڑیوں میں چپ چاپ میرے پاس سے گزرتے گئے میں نے کسی کو سلام نہ کیا، نہ ہی کوئی مجھ سے مخاطب ہوا ......اندھیرے میں کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ سب کون ہیں سائیں جی کی قبر سے کوئی ادھا فرلانگ ادھر بالکل خاموشی چھاگئی یہ جگہ ہمیشہ سے ایسی تھی لیکن تب مجھے اسی کاموشی سے خوف آنے لگا اونچے اونچے ٹیلے پرانے زمانے کے ایسے جانوروں سے مشابہ نظر آئے جواب صفحہ ہستی پر موجود نہیں ہیں۔

جس وقر میں قبر کے پاس پہنچا تو ایک کتے نے اسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہیں دور بین کیا۔

قبر کے اندکو دھنسی ہوئی تھی اور نیچے اترنے والی سیڑھیاں غائب تھیں قبر کے اوپر تازہ مٹی کا ڈھیر تھا میں نے قبر کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ اندر جانے کے تمام راستے مسدود تھے اور قبر ایسے لگتی تھی جیسے ابھی بنائی گئی ہو۔ پھر قریب ہی سے کہیں سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے غور سے دیکھا ایک جھاڑی کے پاس سائیں جی کا کاص مرید منہ پر ہاتھ رکھے رونے کی آواز روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ...... یہ قبر کو کیا ہوا اللہ دتے؟......'' میں نے پاس جا کر پوچھا۔

''بند ہو گئی......''

''کیسے کیسے؟......''

''سائیں جی کل شام اندر عصر کی نماز پڑھ رہے تھے......قبر دھنس گئی...... ہم نے ......ہم نے اسے کھولا نہیں غائبانہ نماز جنازہ پڑھا دی یہی حکم تھا سائیں جی کا ......ایسے ہی فرما دیا تھا پیر مرشد نے ...... انہیں تو وصال ہو گیا......لیکن ہم کہاں

جائیں ہم کہاں جائیں سائیں جی...... کہاں جی کہاں۔"

مرید دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

مجھے یوں لگا تازہ قبر کی مٹی ایک بار پھر اندر کی طرف دھنسنے لگی۔

"دیکھو...... قبر دھنس رہی ہے دھنس رہی ہے قبر......"

مرید نے چیخ ماری اور ڈیرے کے طرف بھاگنے لگا۔

میں چپ چاپ جھاڑی کے پاس بیٹھا رہا قبر آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگی پھر مٹی اندر کی طرف دھنسنے لگی اور تھوڑی دیر بعد جہاں پہلے قبر تھی وہاں ایک گڑھا پڑ گیا...... میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ اتنے میں اسمان پر ایک کالی گدھ تاروں بھرے اسمان پر لمبے لمبے چکر لگانے لگی آہستہ آہستہ...... پہلے وہ دائروں میں ارتی رہی پھر اس نے آٹھ کے ہندسے جیسی اڑانیں اختیار کر لیں اندھیرا بہت ہو چکا تھا لیکن کالی گدھ صاف نظر آ رہی تھی دھنسی ہوئی قبر سے نگاہیں اٹھا کر میں نے غور سے اس کو دیکھنا شروع کیا۔

دور دور تک پھیلا ہوا تاروں بھرا آسمان اور ایک کالی گدھ جو پرواز میں نیچے اتر رہی تھی آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں فاسفورس جل رہی تھی دو ننھے ننھے بلب بغیر پر پھڑ پھڑائے چہرہ نیچے کیے کالی گدھ دھنسی ہوئی قبر کی طرح اتر رہی تھی...... انچ انچ ملی میٹر...... آہستہ آہستہ۔

میں شہر کے مشہور سکائی ٹرسٹ کے کلنک سے باہر نکل رہا تھا کہ مجھے آفتاب سڑک پر نظر آیا وہ لمبی سیاہ کار سے اتر رہا تھا ہم دونوں بے ساختگی سے بغلگیر ہوئے...... اور درکت کے نیچے کھڑا ہو کر باتیں کرنے لگے۔ پھر یکدم جیسے آفتاب کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ بھاگ کر کار تک گیا پچھلا دروازہ کھول کر اس نے ایک دس سال کے بچے کو باہر نکالا بچہ سہا ہوا اور کمزور تھا اس کا سر باقی دھڑ سے اور آنکھیں چہرے سے بہت بری

تھیں آفتاب نے اسے بازو سے پکڑ کر سڑک کراس کرائی اور پھر مجھ سے مکاطب ہو کر بولا..... ''میں ذرا اسے ویٹنگ روم میں بٹھا آؤں تم مت جانا..... پلیز۔''

جن آفتاب واپس لوٹا تو اس کا چہرہ پہلے سے بھی پریشان تھا۔

''کیا تم مستقل طور پر پاکستان آ گئے ہو؟......'' میں نے سوال کیا۔

''وہاں یار وہاں Hsndicaped بچے کے ساتھ گزارا مشکل تھا۔''

''کیا مطلب؟''

اس کے بیٹے میں کچھ ایسی بات تھی جسے دیکھ کر میں پہلے سے ہی گھبرا گیا تھا۔

''میرا بیٹا افراہیم ذہنی طور پر کچھ نارمل نہیں ہے..... وہاں لندن میں میڈیکل سہولتیں تو بہت تھیں لیکن وہاں کی تعلیم کلچر..... رنگ و نسل کا امتیاز..... وہاں اتنی ساری Adjustment ایکل بچہ کیسے کر سکتا ہے۔''

''ہوا کیا ہے بچے کو.....''

''اسے کواب آتے ہیں..... یہ..... عجیب عجیب کواب دیکھتا ہے پہلے یہ موٹا تازہ تھا پھر..... ان خوابوں کی وجہ سے اس کا وزن گھٹنے لگا..... آدھا آدھا گھنٹہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا رہتا..... ہے ڈاکٹر کہتے تھے کہ یہ Catatonic حالت ہے۔''

آفتاب کی آواز اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

''افراہیم کہا ہے کہ اس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے..... وہ اپنے آپ کو..... دنیا کا نجات دہندہ سمجھتا ہے کبھی کبھی وہ فر فر عربی بولنے لگتا ہے..... کبھی..... عبرانی میں باتیں کرتا ہے..... میں..... اس کے خوابوں سے تنگ آ گیا ہون قیوم..... وہ کہتا ہے کوئی فرشتہ اسے پھل کھلانے آتا ہے۔''

تنے کے ساتھ آفتاب نے یوں ٹیک لگا لی جیسے جسم کا بوجھ اس کے لیے اٹھانا ناممکن ہو۔

''یہ سب کس چیز کی سزا ہے؟..... کیا مجھ سے کوئی گناہ سرزرد ہوا ہے کیا میرے

باپ دادا کے گناہ نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے۔"

کیا واقعی باپ دادا کے گناہ Gene mutation کی صورت میں افراہیم پر اثر انداز ہوئے تھے کیا اس کے آبا اجداد نے کیا آفتاب نے کبھی رزق حرام سے اپنے Genes کی ساخت کو اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ آنے والی نسلوں میں دیوانہ پن ظاہر ہونے لگا تھا؟

چھوٹا سا افراہیم دیوانگی کو ورثے میں لایا تھا؟

وہ عشق لاحاصل کے نتیجے کے طور پر تو دیوانہ نہ ہوا تھا؟

جستجو کے آثار بھی اس کی دیوانگی کا باعث نہ تھے۔

پھر پھر؟

کیا موت کا خوف چھوٹے سے بچے کو ہو سکتا ہے؟

ہم دونوں خاموش کھڑے رہے۔

"یہ کس بات کی سزا ہے قیوم بتاؤ...... تم ہماری جماعت میں سب سے ذہین تھے بتاؤ یہ کس جرم کی سزا مل رہی ہے مجھے؟"

ہم دونوں پھر خاموش ہو گئے۔

"تمہارا کیا خیال ہے کیا بددعا میں اتنا اثر ہے......" آفتاب نے مجھ سے سوال کیا۔

"نہیں سیمی ایسی نہیں تھی......" میں نے اسے تسلی دی

اس وقت وہ زرد رو لڑکا کلینک سے باہر نکلا اور برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑا ہو کر آسمان کو تکنے لگا اس کا چہرہ آنکھوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا اور سر جسم کے تناسب سے بہت بڑا تھا وہ چھوٹا سا لڑکا عجیب طور پر سیمی سے مشابہ تھا......

"اب یہ اسی طرح کھڑا رہے گا آدھا گھنٹہ پونا گھنٹہ سارا دن۔"

میں نے آفتاب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا...... "آفتاب جو لوگ

اپنے آپ کو نارمل سمجھتے ہیں انہیں دیوانگی سے بہت ڈر لگتا ہے...... میں بھی نارمل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ اس جسم کے ساتھ مادی ازندگی بسر کرنے کا یہی آسن طریقہ ہے...... اسی لیے یہاں آتا ہوں کلنک پر...... لیکن دیوانگی نے انسانیت کو سب کچھ عطا کیا ہے...... ہر دیوانے آدمی نے...... دیوانگی کی ایک اور جہت ہے...... صرف ہم کو اس کا اوراک نہیں ہے...... جس طرح جسم کی بیماری سے ہم خوفزدہ ہوتے ہیں تو ہسپتال کو دوڑتے ہیں ڈاکٹروں کی طرف بھاگتے ہیں...... روح جب لنگڑی لولی ہوتی ہے تو ہم ایسے ہی خوف زدہ ہوتے ہیں حالانکہ جب روح روح Boundry کراس کر جاتی ہے تو انسانیت کے لیے یہی دیوانہ پن رحمت بن جاتی ہے...... میں اس سارے دائرے پر گھوم چکا ہوں...... یقین مانو آفتاب...... ہر دیوانگی پاگل پن نہیں ہوتی نہیں ہوتی...... نہیں ہو تیہر دیوانہ آدمی ننگ انسان نہیں ہوتا۔''

''تھینک یو تھینک یو...... تھینک یو۔''

''جس طرح بیماری موت کی وادی میں اترتی ہے...... جسم ریخت کا شکار ہو کہ اسرار کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے ایسے ہی دیوانگی...... انتہا کی ہو تو رعفان کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے پھر مادہ شکل میں بیکار ہو جاتا ہے...... تم اعتبار کرو تمہارا افراہیم پاگل نہیں یہ ہے ایک اور سمت میں دیکھ سکتا ہے اس کی وہ کھڑکیاں کھل رہی ہیں...... جو عام صحت مکند نارمل آدمی میں بند ہوتی ہیں...... یہ دونوں ابروؤں کے درمیان میں سے دیکھ سکتا ہے تم اسے عرب کے صحراؤں میں لے جاؤ...... وہاں اس کے لیے بہت کچھ ہے...... اسے شیر سے مشابہ جبل النور کے سامنے لے جانا...... یہ تمہیں اس پہاڑ کو دیکھتے ہی وہ سب کچھ بتا دے گا...... جو کوئی ماہر نفسیات آج تک نہیں بتا سکا...... جو کوئی سائنس دان سوچ بھی نہیں سکا...... چاہو تو اسے رفتہ رفتہ سیڑھی سے اتار کر عام پاگل خانے میں...... ان پاگلوں کے ساتھ بند کر دینا جو مادی دنیا پر بوجھ ہیں

ہو سکے تو اسے...... اسے وہاں لے جانا جہاں لوہے کے ہم شکل پہاڑ ہیں سارے میں عصر کے وقت گلابی ہوا چلتی ہے...... خدا کے لیے یقین کرو جسم کی بیماری دو قسم کی ہوتی ہے ایک بیماری وہ ہے جو...... جسم کو لاغر نحیف کرتی ہے دوسری بیماری سے شفایاب ہونے پر انسان دوگنا تندرست ہوتا ہے اور دیر تک تندرست رہتا ہے جیسے جسم میں تازہ خون شامل ہو گیا ہو...... دیوان پن بھی دو طور کا ہے یک پاگل پن کی وہ قسم ہے جس سے روح قلب دماغ سب کمزور ہوتے ہیں...... دوسرا دیوانہ پن وہ ہے...... جس سے روح میں توانائی آتی ہے وہ ایک ہی جست میں کئی کئی منزلیں پار کرتی ہے...... خدا کے لیے مجھ پر یقین کرو...... تمہارے بیٹے کا دیوانہ دوسری قسم ہے...... میرا ایمان ہے۔"

اس وقت افراہیم ہم دونوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد تھا آفتاب نے میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے کہا...... "اسے دورہ پڑنے والا ہے میں جانتا ہوں۔"

"وہ دیکھئے ابو وہ دیکھے آپ کو گنبد نظر نہیں آتا...... آنٹی اقبال نے جو ساڑھی امی کو دی تھی اس کا رنگ کا...... Greenish blue...... ابو آپ کو نظر نہیں آتا وہ گنبد...... اس کے Done کے نیچے چودہ طاق ایک طرف...... اور...... وہ دیکھے ابو! کبوتر اڑ رہے ہیں مدینے کی سڑکوں پر لوگ بھاگ رہے ہیں اس گنبد کی طرف...... روسی امریکی...... افریقی...... اذان ہو رہی ہے ابو...... آپ کو لوگ بھاگتے ہوئے نظر نہیں آتے؟ کیا آپ واقعی اذان کی آواز نہیں سن سکتے...... وہ دیکھے...... چار موذن ایک وقت میں اذان دے رہے ہیں...... آپ نہیں سن سکتے کیا؟"

"یہ بچہ مدینے شریف گیا ہے؟"

آفتاب نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہم لندن سے سیدھے یہاں آ رہے ہیں۔"

’’وہ دیکھئے ابو وہ......ابو......دیکھیے کون اتر رہا ہے چاند سے؟‘‘ ہم دونوں نے چاند کی طرف دیکھا عصر کے وقت کا پھیکا چاند آسمان پر گم سم بیٹھا تھا جیسے افراہیم نے اس کا کوئی بہت بڑا بھید فاش کر دیا ہو۔

اس وقت کنک کی عمارت کے پیچھے سے اذان کی آواز فیڈ ان ہونے لگی آفتاب نے جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھوں پر دھر لیا افراہیم کچھ دیر کانپتا رہا اور پھر منہ کے بل سجدے میں گر گیا۔

افراہیم خوابوں کی آخری سیڑھی پر سربسجود تھا۔

میں پاگل پن کی پہلی اور اسفل ترین سیڑھی پر مجبوب کھڑا تھا۔

اور ہم دونوں کے درمیان انسان کا مسئلہ ارتقاء کھنچی کمان کی مانند تنا ہوا تھا انسان کو ایب نارمل سے سوپر نارمل تک پہنچنے کے لیے جانے ابھی کس کس منزل سے گزرنا ہے؟

----------ختم شد----------------